کاروانِ خیال

مولانا ابوالکلام آزاد کے تازہ خطوط کا گرانقدر مجموعہ

ملک کو قلعہ احمد نگر کی اسیری سے رہائی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے دوسرے مجموعہ خطوط کی اشاعت کا شدید انتظار تھا ان خطوط کا دوسرا صحیفہ کاروانِ خیال ہے جس میں اسلامی ہند کے دو صدر نشین بزرگوں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ بہادر کی چھ سالہ خط و کتابت درج ہے۔ شروع میں دونوں بزرگوں کی زندگی کے نمایاں واقعات پر ایک مقدمہ قلمبند کیا گیا ہے۔ کاروانِ خیال میں علم و حکمت، ادب، تاریخ کے وہ خزانے موجود ہیں جن کی ہمیں مدت سے تلاش تھی۔

قیمت دو روپیے آٹھ آنہ (عہ/) علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ

منیجر مدینہ بک ایجنسی بجنور (یوپی)

مطبوعہ مدینہ پریس بجنور یوپی (انڈیا)
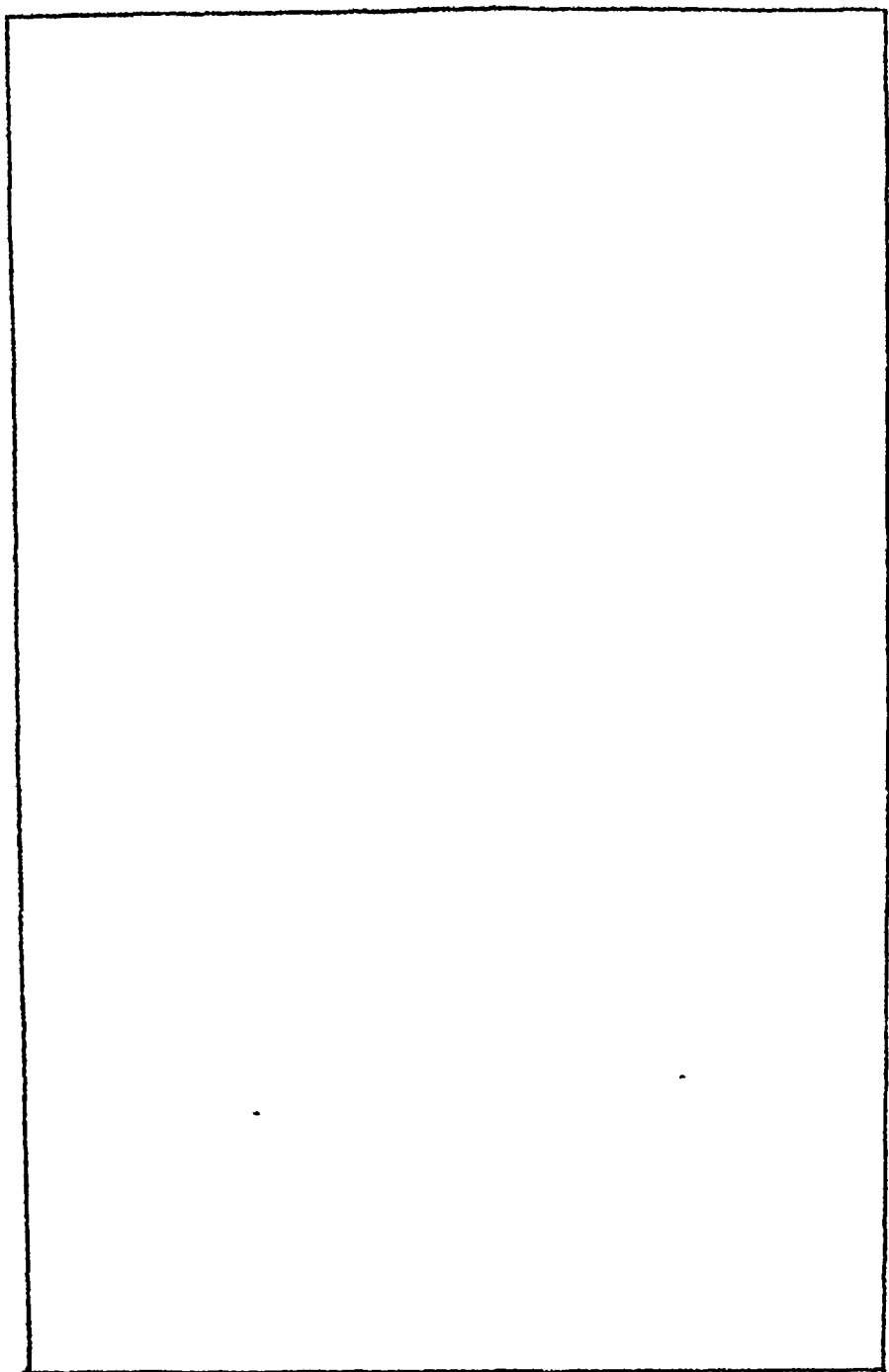
قال رحمہ اللہ!

تمت القصیدتان فی شہر رجب سنہ ۱۲۷۶ھ یعنی الفا ومائتین وستا وسبعین من الہجرۃ المقدسۃ النبویۃ علی صاحبہا ازکی الصلوٰۃ والتحیۃ وانا محبوس فی الجزیرۃ الوبیۃ نجانی اللہ سبحانہ منہا برحمتہ الوسیعۃ وقدرتہ البدیعۃ بجاہ حبیبہ وآلہ وعترتہ علیہ وعلیہم ازکی الصلوات واسنی التسلیمات۔

مصنف علیہ الرحمۃ نے آخر میں تحریر فرمایا۔

یہ دونوں قصیدے رجب ۱۲۷۶ھ میں بحالت اسیری جزیرہ وبائی تمام ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وسیعہ اور قدرت بدیعہ سے اپنے حبیب اور اس کی آل اطہار اور اولاد امجاد کے طفیل اس وبائی جزیرہ سے نجات دے ان سب پر اللہ کی روشن نعمتیں اور پاکیزہ رحمتیں نازل ہوں۔
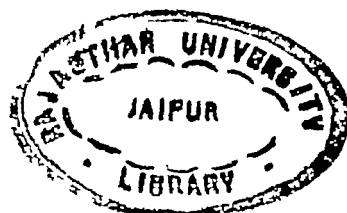
وان ينفس عني عاجلا كربي   اللائي تجاوزن عن حصر وتعداد

اور جلد سے جلد میری ان پریشانیوں اور اذیتوں کو دور کرے جو حد و شمار سے

متجاوز ہو چکی ہیں

وان يعافيني فوراً ويمهل لي   ويبدل ترحي واشقائي باسعاد

اور مجھے مہلت کے ساتھ اپنی عافیت میں لے اور میرے غم کو سرور اور شقاوت

کو سعادت سے بدل دے

وان يتيح حمامي بالشهادة في   جوار مثواك يا جاري ويا هادي

اے میرے محافظ و رہنما اس بات کی بھی دعا کیجئے کہ خدا میری موت آپ کی اقامت گاہ

کے جوار میں شہادت کی موت مقدر کر دے

سألتك الله فاقبل مدحتي كرماً   حتى افوز بمقصودي بانشادي

میں آپ کو خدا کی قسم دلاتا ہوں اپنے کرم سے میری مدح و ثنا قبول فرمائیے

تاکہ اشعار خوانی کی بدولت میں اپنی مراد کو پہنچوں

عليك ازكى صلوة الله ما صدحت

آپ پر اللہ کی پاکیزہ رحمتیں نازل ہوتی رہیں جب تک سرسبز و شاداب

ورقاء ايك وريق او شدا شادي

مرغزاروں میں قمریوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور گانے والے گاتے رہیں۔

فمن اولئك من لم يعط ما أملوا والبعض فازوا بما مول ومراد

ان میں سے بہت کی آرزو پوری نہ ہوئی، اور بعض اپنی مراد کو پہنچے۔

اکرم بعترتہ الغر الکرام فہم خیر النبال وهم سادات امجاد

کس قدر قابل عظمت ہے۔ ان کی شریف، بزرگ، نجیب اور بلند رتبہ اولاد۔

اصحابه جاهدوا والله في اجتهدوا لنصره واجدّوا كل اجداد

ان کے صحابہ نے دین کے لئے جہاد کیا، معاونت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اس سلسلہ میں طرح طرح کی کوششیں کیں۔

يا سيد الخلق يا خير الورى خلقا يا خير من يرتجى يا خير اجواد

اے مخلوق کے سردار اور اخلاق میں سب سے بلند و بہتر، امیدوں کے بہترین سہارے اور تمام اہل سخاوت سے بلند مرتبہ رکھنے والے!

افديك محني ومحني واكفني محني يا لمسيح يا خير ممتاح وممتاد

میں آپ پر قربان! مجھ پر رحم فرمائیے اور مجھے بخشش سے نوازیئے، اپنی عطا سے میری مشقتوں اور غموں کی تلافی کیجئے، اے جود و عطا کے مالک!

فاشفع ومحني وسل ربي لينجيني ممن بلائي تغربي وإفرادي

مجھ پر کرم کرتے ہوئے خدا سے میری سفارش کیجئے کہ مجھے جلا وطنی اور قید تنہائی کی مصیبت و آزمائش سے نجات دے۔

ان راد آدم حدّا من للہ فکم　　　ناس ملاحدّا آباء واحدا اد
آدم علیہ السلام کی بزرگی میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا تو تعجب کیوں ہے بہت ہو
آباؤ اجداد نے اپنی اولاد کے مجد و شرف کے باعث بلند مرتبہ پالیا ہے
ختم النبیین اولاھم واولھم　　　بدا النبی ئی نساء کا بدء ایجاد
وہ خاتم النبیین ہیں انبیوں میں سب سے اول و افضل ہیں مخلوق میں اولیت کا
شرف انہیں کو حاصل اور انہیں کی روشنی سے پہلی ایجاد ہے
فلا سید ناسخ الادیان قاطبۃ　　　باق علی مر احقاب وآباد
ان کا دین تمام دینوں کا ناسخ اور رہتی دنیا تک رہنے والا ہے
تلا کتابا حکیما محکما حکما　　　یقضی علی کل من تاب لم تاد
انہوں نے حکمت والی مضبوط اور فیصلہ کن کتاب کی تلاوت کی وہ کتاب
متلاشئ حق کے حق میں اور شکی کے خلاف فیصلہ صادر کرتی ہے
دعا للہ حل فی اثر اد امتہ　　　رسل علی ما رفی اصحاب اسناد
رسولوں نے ان کے امتی ہونے کی خدا کی بارگاہ میں دعا کی روایات میں اسناد کے ساتھ
اس کا تذکرہ موجود ہے۔
دعوا کی یحسبوا من امتہ وسطا　　　عدلا علی الامم الماضین اشہاد
انہوں نے امت وسط شاہد عادل (امت محمدیہ) میں شمار ہونے کی دعا کی جو کہ
تمام سابقہ امتوں پر قیامت کے دن گواہ ہے گی۔

جار لجار شکا جور ا مبیع لمن فذا استماح و ممتاد لممتاد

ظلم سے شاکی پڑوسی کے محافظ ہیں، امداد چاہنے والے کے معاون، اور طالبِ عطا کے لئے سخی ہیں۔

ھادٍ بشیر قد القت بشائرہ الرھبان فی راھب والھود فی ھاد

وہ خوشخبری سنانے والے ہادی ہیں۔ راہبوں نے ان کی آمد کی اطلاع حالتِ خوف میں پہنچائی اور اسی طرح یہود نے۔

ھدی سبیلا سویا کل منحرف عن السبیل وسوی کل مئتاد

انھوں نے ہر گم کردہ راہ کو سیدھا راستہ بتایا اور ہر ٹیڑھے کو سیدھا کر دیا۔

غوث وغیث لملھوف ومنتجع بحر و بر لورّاد و روّاد

وہ غمگین کے فریاد رس اور طالب بارش کے لئے بادل، گھاٹ پر آنے والوں کے لئے دریا، چارہ اور پانی کے متلاشی کے لئے (سرسبز) میدان ہیں۔

بحر شریعتہ بیضاء صافیۃ مشروعھا مشرع عذب لورّاد

وہ دریا ہیں، ان کی شریعت روشن اور صاف ہے، جس کے احکام پیاسوں کے لئے شیریں چشمہ ہیں۔

بَرّ ندیٌ یشبع الغرثیٰ اصابعہ جادت فجادت جوادا للاٰئبی الصادی

وہ بڑے نیک اور سخی ہیں بھوکوں کا ان کی انگلیاں پیٹ بھرتی ہیں، جب انگلیاں سخاوت پر آتی ہیں تو تشنہ لبوں کی پیاس پر غالب آجاتی ہیں۔

يسلط الصعفاء العاجزين على صيلا شداد كفرعون وشداد

وہ فرعون وشداد جیسے سخت وجابر بادشاہوں پر کمزور عاجزوں کو مسلط کر دیتا ہے

فمن سواه لعان لا احتيال له وما لاطلا فدمنى ولا فاد

اس مصیبت روکنے کے لئے جس کا کوئی حیلہ وسیلہ نہ ہو اور جس کی رہائی کے لئے نہ کوئی فدیہ

ہو اور نہ احسان، خدا کے سوا کوئی چارہ ساز ہے

يارب انقل ه من ايدى عدى كفرا بجاه احمد محمود وحماد

اے پروردگار! اس عاجز وخستہ کو ستودہ صفات احمد وحماد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے

طفیل میں کافر دشمنوں کے چنگل سے نکال

ارسلته رحمة للعلمين الى الانام ثم طرّا الارشاد وارشاد

تو نے انھیں تمام مخلوق کی طرف اس کی رہبری وہدایت اور عطا واعانت کے لئے

رحمت عالم بنا کر بھیجا ہے

غوث المنادى لكف الناس ممرعما يوم التنادى ملاذ الكهف فى النادى

وہ مصیبت وبلا روکنے کے لئے پکارنے والوں کے فریادرس، روز قیامت

میں ہماری پناہ گاہ، اور مجلس میں شیخی وجواد ہیں

هادوحام ومناح مانخ لعو ثم ومستصرخ مستشفع حادى

وہ گمراہ کے لئے ہادی، انبیاء کے حامی، فریادی کے مددگار، سفارش چاہنے والے کے

شفیع اور سائل کو عطیات سے نوازنے والے ہیں

كالظبي في حَرَّة امسى يناوصها وقد يسالمها من خوف مصطاد
میری حالت اس ہرن سے مشابہ تھی جو شکاری کی لکڑی سے موقع شکار کے خوف سے مصالحت کر بیٹھا ہو۔

رجوت ناسا رجا من امحلوا سُحُبا قد اقلعت بعد ابراق وارعاد
میں نے چند لوگوں سے ان قحط زدہ اشخاص کی سی امید باندھی جو ایسے بادلوں سے جو گرج اور چاک کر چھٹ گئے ہوں امیدیں باندھ لیتے ہیں۔

قطعت عمّا سوى الله الرجاء فما ممن سواه رجاء رفد وارفاد
میں نے خدا کے سوا سب سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اس کے سوا کسی دوسرے سے بخشش و امداد کی امید نہیں ہے۔

فلا أؤمّل الا رحمة الملك العدل الّذي ذكره حرزي اوراد ي
اس بادشاہ عادل کی رحمت کا ہی میں امیدوار ہوں جس کا ذکر میرا حرزِ جان اور میرا ورد ہے

حيّ حييّ حفيّ بالدعاة فلا يردّ دعوة ملهوف ولا راد
وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا حیا رکھنے والا اور پکارنیوالوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنیوالا ہے، ہلاکت زدہ اور مظلوم و مضطر کی دعا رد نہیں کرتا ہے۔

ينجي أسارى ضعافا من جبابرة شوس اشدّاء جابوا الصخر بالواد
وہ کمزور قیدیوں کو ایسے جابر، متکبر اور سخت انسانوں سے نجات دلاتا ہے جو وادی میں پتھروں کو کاٹنے والے ہیں۔

کانت کایا منا بیضا دیاجرہا — وکان ایامنا ایام اعیاد

ایک زمانہ وہ تھا کہ ہماری تاریک راتیں روشن دن کی طرح تھیں اور ہمارے دن عید کے دن تھے

کیف احتیالی لاطلاقی وقد ضمنا — علی اذہی اقلتی ناسل ادھار

میری رہائی کے لئے کیا حیلہ ہو سکتا ہے، جو میں مرا پا بانضای ہوئے ہیں کے سامنے مستعد ہیں

کیف الخلاص وخصمی ظالم عکس — ویلاہ من کافر باللہ کتاد

مجھے چھٹکارا کیسے نصیب ہو سکتا ہے، میرا دشمن ظالم و مدعوے، اس کافر کی

خرابی ہو جو خدا کا بھی منکر ہے

اغری النصاری بتعذیبی زنادقۃ — یلوہم ولوتوہم لالحاد

مجھے تکلیف پہنچانے کے لئے نصاریٰ نے ایسے زندیقوں کو آمادہ کیا جو ان کے مقرب

ہیں اور وہ بھی جس سے ان کے الحاد کی وجہ سے مذمت کرتے ہیں

عاطوا وجدّ وا ولجّوا فی معاقبتی — عادوا ونادوا باصعان واحقاد

وہ شکنجے میں آپے سے باہر ہو گئے اور میری اذیت رسانی میں ہر ممکن جد و جہد

سے کام لیا، پوری پوری دشمنی برتی اور بغض و کینہ کا کھلا

مظاہرہ کیا

آیستُ من املی اذ قطعت حیلی — وجرت کالطیر فی احول صیاد

اپنی تدبیروں کے انقطاع پر میں ناامید و مایوس ہو گیا اور شکاری کے جال میں پھنسے

ہوئے پرندے کی طرح حیران و پریشان

شطّ المزار بنا اذ شطّ حابسنا　　　بشطّ لجی لہ مدّ بازباد

ہمارے قید کرنے والے نے ہم پر ظلم روا رکھکر ہماری دید سے لوگوں کو محروم کر دیا اور ہمارے درمیان ایسے سمندر کا کنارہ حائل ہوگیا جس میں پانی کے جوش سے جھاگ پیدا ہوتے تھے

ارواحد تنزع الارواح من خبث　　　کصرصر ارسلت قبلاً علی عاد

وہاں کی ہوائیں اپنی خرابی کی وجہ سے جان نکال لیتی تھیں وہ اس ہلاکت خیز آندھی کی طرح تھیں جو قوم عاد پر اس سے قبل بھیجی جا چکی تھی۔

خاب المنٰی والمنایا قد عم فیہ وما　　　لمیّتٍ فیہ من دفن والحاد

اس میں آرزوئیں پامال اور موت عام تھی، اور کسی میت کے لئے دفن و قبر کا کوئی انتظام نہ تھا

یفیض فیہ ھموما جمۃ ابدا　　　غیم ھموم فسار رائح غاد

غموں کے بادل قسم قسم کے رنج والم برسانے رہتے ہیں اور وہ بادل صبح، شام اور شب کو آتے جاتے رہتے ہیں۔

فلا یری فیہ یوما ضوء شمس ضحی　　　ولا سنا نیّرٍ بالیل وقّاد

وہاں کبھی دن میں سورج کی روشنی نظر آتی ہے نہ چمکنے والے چاند اور تاروں کی رات میں چمک۔

یومی کلیلی ولیلی سرمد نقف　　　النجوم فیہ کان شدّت باوتاد

میرا دن، رات کی طرح ہے، اور میری رات کو دوام ہے، آسمان پر ستارے ایسے رکے ہوئے ہیں جیسے میخوں میں انھیں باندھ دیا گیا ہو۔

حُبستُ فی السجن ممنوعاً ولم یک لی ۔۔۔ عدیّ یشفق اومن کان لی عادی

میں غمگین ہو کر جیل میں بند کر دیا گیا میرے پاس میرا کوئی رفیق اور حامی یا مددگار بھی نہ چھوڑا گیا

وقد کسونی کساءً بعد ما سلبوا ۔۔۔ الکِساء واستنزعوا السّقّ والرّدادی

میرا عمدہ لباس اتار کر قیدیوں کے کپڑے پہنا دیئے میرا توستر اور کپڑے جس لئے

اعطوا وطاءً غلیظاً ساتکاً خشناً ۔۔۔ لنوم لیلی ولیس الفرش معتاد

انھوں نے سخت موٹا اور چبھنے والا بستر ایسے راحت پسند جس کو سونے کے لئے دیا

جو نرم بستر کا عادی تھا۔

سقوا اجاجاً حمیماً ان شکوت ظمأ ۔۔۔ واعدوا لی غذاءً غیر معتاد

میرے پیاس کی شدت کی شکایت کی تو گرم اور کھاری پانی پلایا اور ایسی غذائیں

مہیا کیں جن کا میں کبھی عادی نہ تھا

لم یقنعوا باحتباسی بل اضیف الی ۔۔۔ حبسی جلائی وتغریبی وابعادی

میرے قید کرنے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ اس کے ساتھ جلا وطنی مسافرت اور اہل وطن

سے دوری کا بھی اضافہ کر دیا

فانکبونی واسری آخرین علی ۔۔۔ فلک یموج موج البحر میّاد

مجھ اور دوسرے قیدیوں کو جہاز پر سوار کر کے لے چلے اور وہ جہاز سمندر کی موجوں سے ہچکولے کھاتا چلتا تھا

وانزلونی مع الاسری علی جبل ۔۔۔ ناءٍ تنیف دونہ اوهام قصّاد

اور مجھے ان قیدیوں کے ساتھ ایک دور دراز پہاڑی پر اتار دیا جہاں قصد کرنیوالوں کا وہم

وآب من ندّ من الله ادنا فبلا ــــ لی النصارٰی بحبسی دون انداد
ہمارے ساتھیوں میں دوسرے روپوش لوگ بھی واپس آگئے مگر نصاریٰ نے صرف مجھی کو قید میں ڈال دیا
جرّ و الی السجن ضمونی الی فئة کسرٰی واسرٰی باغلال واصفاد
وہ مجھے قید خانے کھینچ کر لے گئے اور ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بندھے ہوئے درماندہ
وشکستہ دل قیدیوں میں شامل کردیا۔
اسرٰی عناة یعانون الشدائد فی حدّ وحدّة وسجّان وحدّاد
وہ بڑے جفاکش قیدی تھے، قیدخانہ کے دربانوں اور نگہبانوں کی بے انتہا سختی اور
ان کے مزاج کی تیزی برداشت کرتے تھے۔
شقّ الغلاظ علیهم لم یذر جلدا فیهم وشقّ جلودا جلد جلّاد
بدخو اور درشت مزاج نگہبانوں کی محنت و مشقت نے ان کے بدن پر کھال نہ
چھوڑی تھی اور جلّاد کے کوڑوں نے بدن کی کھال پھاڑ دی تھی۔
جمع العدٰی جمعوا بینی وبین عدٰی وفرّقوا بین اعضائی واعضادی
دشمنوں کی جماعت نے دشمنوں کو اور مجھ کو جمع کردیا اور میرے اعضا اور بازوؤں کو جدا کردیا
قد صدّ عنّی الرجال کنت آملهم وصدّ عنّی اخلّائی واودادی
جن لوگوں سے مجھ امیدیں تھیں وہ اعراض کر گئے اور میری دوستوں اور ساتھیوں کو مجھ سے علیحدہ رکھا گیا
وحال بینی وبین الاقربین نوی وغمّنی بین اولادی واحفادی
میرے اور اعزّہ کے درمیان جدائی حائل ہوگئی اور اولاد و احفاد کے فراق نے مجھے غم میں ڈال دیا۔

من كان معرضاً عن طوعها فتسلّوا　　لم يسمعوا امر حكّام وقواد

جن لوگوں نے اس ملکہ کی اطاعت نہیں کی تھی ان پر ایسی سردلی چھائی تھی کہ نہ ایسے سردار کا حکم مانتے تھے اور نہ حاکم کی بات سنتے تھے

اعيت فريقاً عن الهيجاء فاقعدهم　　واقعد البعض حين كل اقعاد

ان میں سے ایک فریق کو تو ماندے جنگ سے تھکا دیا تھا اور دوسرے گروہ کو بزدلی نے پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا۔

لما رأت اسلم بين مختصم　　للحرب باغ ولا باغ ولا عاد

جب ملکہ نے دیکھا کہ کوئی جنگ کا جو استنگار دشمن، باغی، اور سرکش باقی نہیں رہا

عادت معادت فما منت بما وعدت　　منت حبائل ميثاق وميعاد

تو اپنے قول سے پھر گئی اور دشمنی پر اتر آئی، کوئی اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور عہد و میثاق کی رسیوں کو کاٹ دیا۔

منت بالوعد ثم اعتدت وقد　　فكان موعدها كيد الابعاد

پہلے وعدہ کر کے لوگوں کو آزردہ مرد سا دیا پھر عداوت و ظلم سے کام لیا، در اصل اس کا وعدہ، وعید کے لئے مکر تھا۔

سحت ادعيٰ في ايمان كافرة　　روى لعهد الى اهلى واولادى

اس کافرہ کے جھوٹے وعدوں اور قسموں سے دھوکے میں ترکر میں بھی اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹ آیا۔

وشھرت کتبا منشورۃ نشرت ایمانھا لمحاریب واضداد

اس نے محاربوں اور دشمنوں کی امان کے اشتہارات جاری کئے

الا الذی قتل الصبیان او قتل النسوان اوغال مغلولا باقیاد

کہ بچوں، عورتوں اور قیدیوں کے قاتلوں کے سوا سب کو امان ہے

من سالموا سلموا آل القتال الیٰ عمالھا واطاعوا طوع منقاد

جنھوں نے صلح کی، آلاتِ حرب اس ملکہ کے عاملوں کے سپرد کردیئے اور فرمانبرداروں کی طرح اطاعت گذار بن گئے۔

وطمعت کل دھقان فطاوعھا جل الدھاقین من قارومن بادی

اس نے تمام دہقانیوں کو لالچ دیا جس کی وجہ سے اکثر دیہاتی اور بادیہ نشین اسکے مطیع ہوگئے

فنصرھم سلط الانصار فانتصروا اذا انجدوا وھم باغوار وانجاد

ان سب کی مدد نے ان کو مسلط و غالب کردیا جبکہ ہر پستی و بلندی پر ان کی مدد کی۔

واخوا البلاد بتخریب ولم یذروا ما کان فیھن من رسم وابلاد

انھوں نے شہروں پر غارتگری کے ذریعہ قبضہ کرلیا اور ان کے آثار ونشانات بھی باقی نہ چھوڑے

فد انجدوا واغاروا وقتلوا نھبوا وافسدوا فی النواحی کل افساد

وہ بلند اور پست مقامات پر پہنچے اور قتل، لوٹ مار اور ساری علاقہ میں فتنہ و فساد پیدا کردیا

ھدوا المعابد واجتاحوا المساجد اغتالوا عباد اغلوا فی قتل عباد

عبادتگاہوں کو منہدم اور مسجدوں کو مسمار کردیا خدا کے بندوں کو قتل کیا اور عابدوں کی ہلاکت میں حد سے

واستکبروا اولوا واستکبروا وسوا الا اقلاء من دون واوعاد
ان سب نے اعراض کرتے ہوئے صاف انکار دیا اور اسے برا سمجھتے ہوئے دوری اختیار
کرلی، البتہ تھوڑے دلیل ور دلیل اشخاص نے اس کا کہا مان لیا۔
صالوا علی حرمہا البیضاں فاٰمنوا کالستاء تمر من سیل آساد
انھوں نے اس کی سفید فوج پر حملہ کیا اور گردش تقدیر سے شکست کھا گئے جیسے کریاں
بھیڑیئے اور شیر سے دور بھاگتی ہیں یہی ان کا بھی حال ہوا
فالفت جمیع رھط من تکاکرۃ من الھنادك لاستدعاء امداد
پھر اس نے ہندوں میں سے جاٹ ٹھاکروں کو اپنی مدد کے لئے جمع کیا
وبعض من یدّعی الاسلام فاجتمعوا اذ استعد والاعداء واعداد
اور بعض مدعیان اسلام کو بھی ——— وہ دھوکے میں آکر مدد کیلئے آمادہ ہو گئے
قد اعتدوا واذعروا الکفا ہم وعدوا آذاعتدوا والعداہم کل اعتاد
انھوں نے اپنے ساتھیوں پر حملہ کرکے زیادتی سے کام لیا اور اپنے مقابل لوگوں سے
پوری طرح تیاری سے پیش آکر بڑا ظلم کیا
فکم اعد والنصر لخصم من عدد ومن عساکر لا تحصی باعداد
ان سب نے دشمن کی مدد کے لئے بہت سا سامان جنگ اور بے شمار لشکر اکٹھا کیا۔
ثم استغاث جلالًا سبا کبی حسل فاجتمعوا قمر باتها مر باتحاد
پھر اس ملک نے بھائیوں سے مدد لی، انھوں نے پوری رغبت اور بہادری کے مدد کی

فقوتی ضعفت والضعف ضوعف من تنقص فی القوی والجسم مزداد

میری طاقت کم ہوگئی اور ضعف دونا ہوگیا، یہ سب کچھ قوی اور جسم میں بہت زیادہ نقص کی وجہ سے ہوا۔

لم یبق لی جلد مما اصیب بہ قلبی وروحی وجثمانی واجلادی

میرے قلب روح جسم اور بدن کو جو مصیبتیں پہنچیں انکی وجہ سے مجھ میں قوت باقی نہیں ہے۔

اودی لدا ھیۃ دھیاء فلہ شجمت ھم وھم بارواح واجساد

سخت مصیبت کی وجہ سے ہلاکت کو پہنچ گیا روحانی اور جسمانی اذیتوں میں گھر کر شیخ فانی بن گیا

فاجئ بلاء فابکی اسرتی واولی القربی واشمت اعدائی وحسادی

اچانک مصیبت نے آدبایا، اس نے میرے اہلِ خاندان اور رشتہ داروں کو رُلایا اور دشمن و حاسد کو ہنسایا۔

لقد دھانی فاوھانی فرائلنی الدھاء آن کادنی اشرار الکاد

اس مصیبت نے مجھے کمزور و ناتواں بنا دیا اور شریر و بدخصلت لوگوں کے مکرنے مجھ سے زیرکی و دانائی کو زائل کر دیا۔

کادت ملیکتھم اذا آمنت فرقا من الرعایا وافواج واجناد

رعایا، فوج اور لشکر کے گروہوں کے لئے اُن کا اعلان کر کے ان نصاری کی ملکہ نے بھی مکر سے کام لیا

ھمت بتنصیرھم قبلا وھم شیع من مسلمین ومن عباد ابداد

اس نے پہلے تو مسلمانوں اور بت پرستوں کی جماعتوں کو نصرانی بنانیکا قصد کیا

دائی عضال ولا یجدی بعائدة　　　عود لداء بعودا لسلاء عوّاد

میری بیماری سخت ہے عیادت کرنے والوں کی بار بار چارہ فرمائی کسی ایسے مریض کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی جو امراض کے ہجوم ورد کا عادی ہے۔

حشا حشای جوی یشوی الجوانح والحشا　　　کما بہ عصا توری بایقاد

میرے سینے میں وہ غم واندوہ بھر گیا جس نے اندرونی و بیرونی اعضا کو عصا[1] لکڑی کی آگ کی طرح جلا ڈالا جو جلاتے ہی بھڑک اٹھتی ہے

کم بین نار حشا التنور موقدها　　　وقودها حطب من نخل عواد

بہت فرق ہے اس آگ میں جسکے جلنے کی جگہ تنور کا پیٹ ہو جس کا ایندھن لکڑیوں کی گٹھا ہو

وبین نار جوی یصلی جوانحنا　　　وقودها من حشانا وا لکباد

اور اس غم والم کی آگ میں جو ہمارے اعضا کو جلاتی ہو جسکا ایندھن ہماری آہیں پسلیاں اور قلب و جگر ہیں

ولی السعود فلا سلمی تسالمنی　　　ولا سعاد تدا ریبی باسعاد

نیک بختی نے پیٹھ دکھا دی اب نہ سلمیٰ ہی مصالحت کرتی ہے اور نہ سعاد ہی سعادتمندی کا اظہار کرتے ہوئے مدارات پر آمادہ ہے

حلق تشکر حتیٰ کاد ینکر لی　　　من کان یعرفنی من یوم میلادی

میں غم اٹھاتے اٹھاتے دموسہ بن گیا جو لوگ مجھے یوم پیدائش سے پہچانتے ہیں انہیں بھی ساحت میں تامل ہونے لگا۔

[1] عصا ایک ... کی لکڑی ... کی چنگاری بہت ... سلطان ... [illegible]

[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عُودی فعُودی مریضا دائہ عادی اشفی علی الحین حتی عادہ العادی

اے محبوبہ[1] واپس آ اور ایک ایسے مریض کی عیادت کر جس کا مرض قدیم اور متعدی ہے اور جو ہلاکت کے اس درجہ قریب پہنچ چکا ہے کہ دشمن بھی عیادت کو آنے لگے ہیں۔

عوّاد سُقم قلبی عُوّادہ ولھوا وکان یُلھی بزمّارہ عوّاد

وہ امراض کا عادی بن چکا ہے، اسکے عیادت کرنے والے اس سے تنگ آکر کنارہ کش ہو چکے ہیں، حالانکہ ستار اور بانسری بجانے والے اسکے گرد رہا کرتے تھے

واعتاد عیدن وذی کل الاسأۃ بہ فعاد کلا علی اھل وعُوّاد

وہ مرض ہلاکت کا خوگر ہو گیا ہے، چارہ ساز و غمخوار بھی تھک چکے ہیں، وہ عیادت گروں اور اہل وعیال پر بار گران بن گیا ہے۔

داءٍ دواہ عیاء لادواء لہ حامد حاضر من سقمہ البادی

وہ ایسا مریض ہے جسکی بیماری ایسا عجز و درماندگی ہے جسکی کوئی دوا نہیں، اسکی ظاہر مرض کیوجہ سے موت ہر وقت سامنے

وبلاہ من زمن لا یشتفی زمنا علاجہ لیس یجدی غیر اکماد

زمانہ کی حالت پر حسرت وافسوس ہے کہ مریض مزمن کو شفایاب ہونے نہیں دیتا، اس کا علاج غم کی زیادتی کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا

[1] عربی شاعری میں ہم سفر ساتھیوں یا محبوبہ سے خطاب کیا جاتا ہے اور علی العموم قصائد کی ابتدا اسی تخاطب سے ہوتی ہے ۱۲۔ شاہد شروانی۔

یا رحمن علیہ ما صدح علی الایک الورق حمامۃ ورقاء

اے پروردگار رحمت تک سرسبز و شاداب مرغزاروں میں کبوتروں اور سر رنگ

پرندوں کی آوازیں گونجتی ہیں مرکار رحمتیں نازل فرما

حیاهم الرحمن ما احیی حیا

اور جب تک بارش اور مسلسل مینہ زمین کو سیراب

ارضا و سحت دیمۃ وطفاء

کرتے رہیں اللہ کی برکتیں اور اسکی رحمتیں ان

سے بزرگوں پر نازل ہوتی رہیں

لم اقترف عملاً ثیاب وإنّما — قولی وفعلی سُمعۃ وریاء

کوئی ثواب کا کام نہ کر سکا، میرے قول وفعل میں ریا و نمائش کو دخل رہا

لکنّ فضلک واسع یُرجی بہ — عن علّتی وما أتی الإبراء

لیکن تیرا فضل وکرم وسیع ہے، اسی سے اپنی بیماری اور گناہوں
سے برائت کی امید ہے۔

فارحم علیّ فقد دھانی فتنۃ — لم تغن عنھا فطنۃ ودھاء

مجھ پر رحم فرما، مجھے ایسی آزمائش سے سابقہ پڑا ہے کہ اس سے زیرکی اور
اصابت رائے بھی نہ بچا سکی۔

عافیتنی ستین عاماً راتنی — تزداد لی من فضلک الآلاء

ساٹھ سال تک تو نے مجھے امن وعافیت میں رکھا، تیرے فضل سے اس
مدت میں نعمتیں بڑھتی ہی رہیں۔

فاختلّ عافیتی وفاجاء خلّۃ — فارحم فمنک الخیر والاعطاء

پھر اچانک میری عافیت مختل اور احتیاج مسلّط ہو گئی۔ رحم فرما، خیر وعطا
تیری ہی جانب سے مل سکتی ہے

ووسائلی ربّی الیک محمد — والمرتضی وابناہ والزہراء

اے میرے رب! تیرے دربار میں میرے وسیلے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم،
علی، حسن، حسین اور فاطمہ زہرا ہیں۔

قد صفقت دس عاد تتابع منهم — الاسراء والارزاء والاحراء

ان کی طرف سے مصائب اتہامات اور رسوائیوں کے پے در پے حملوں نے مجھ ضعیف و ناتواں بنا دیا ہے

انت الوکیل فلا تکل امری الی — لئن دھانی منھما الاعتداء

تو ہی میرا وکیل ہے میرے معاملہ کو ایسے دشمنوں کے سپرد نہ کر جن کی ایذا رسانی نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا ہے

رب اخزھم بالانتقام واخزھم — لیکون لی عن اثمھما اجزاء

اے خدا! ان سے انتقام لے اور انہیں رسوا کر تاکہ ان کی سزا سے میرے مصائب کی کچھ تلافی ہو سکے

رب انتقم لی من عدائی وآونی — وانصر فمنک النصر والایواء

اے پروردگار! میرے دشمنوں سے انتقام لے اور مجھے پناہ دے میری مدد کر مدد

و پناہ تیرے ہی پاس ہے۔

طال انتظاری للنجاح فلا یکن — فیما رجوت من الرجا الابطاء

کامیابی کا مجھے مدت سے انتظار ہے اب میری امیدیں برآنے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے

یارب عجل ان یکون لما تحـــــلی من تخلصی فی البلاء جلاء

اے پروردگار! جلد فرما تاکہ بلا و مصیبت کی تکلیفوں سے رہائی و خلاصی نصیب ہو

مع انی لم اقترف شیئا من الحسنات بل اعمالی الا سواء

مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کوئی نیکی کا کام نہیں کیا بلکہ بد اعمالی ہی میں مبتلا رہا

لقد انقضی عمری سدی بملاعب — فی اللھو الھانی بھا الاھواء

میری عمر لہو و لعب میں بیکار گذری اور خواہشات نے مجھے نیکیوں سے غافل رکھا

اجرمتُ اذ اجممتُ من کسل فلم   اشهد اذا ما استشهد السعدأ

میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقعہ پر باز رہا یہ میں نے بڑا جرم کیا جب نیکبخت حضرات نے مجھے شہادت کے لئے بلایا تو میں حاضر نہ ہوا اور میں شہادت سے محروم رہا جبکہ سعادتمندوں نے جام شہادت نوش کیا

رب اعف عنّی ما اقترفت واعفنی   فرجائیَ منك العفو والاعفاء

اے آمرزگار! میری قصور کو معاف کر اور جو کچھ مجھ سے خطا سرزد ہوئی اس سے درگذر، تجھی سے عفو و درگذر کی امید ہے۔

ان جمّ اجرامی فعندك رحمة   ما حدها حدّ ولا احصاء

اگر میرے جرموں کی فرد بڑی ہے تو تیرے پاس ایسی وسیع رحمت ہے جسکی حد و نہایت نہیں۔

فاغفر وعاف وتب علیّ فنجّنی   ممّا ابتلانی الخصم والمشاء

مغفرت و عفو فرما، توبہ قبول کرتے ہوئے دشمنوں اور چغلخوروں کے ابتلا سے مجھے نجات دے

ان کان ما اشکوہ مقضیّا فکم   بدعاء مظلوم یردّ قضاء

میری مصیبتیں اگر میرے حق میں مقدر بھی ہو چکی ہوں تب بھی مظلوم کی دعا سے ردِّ قضا ہو جایا کرتا ہے

لا تشقنی ابدا واسعدنی فلا   یتتاب من بعد السعود شقاء

مجھے بدبختی میں نہ ڈال، نیکبخت بنا پھر سعادت کے بعد شقاوت کی نوبت نہ آئے۔

واجِبْ لمظلوم دعاك وضرّہ   فاضطرّہ کفرٌ عدا واساءوا

جو مظلوم تجھے پکار رہا ہے اس کی سن لے اور اسکی مصیبت دور کر، کافروں نے ظلم و تعدی کا اسکے ساتھ برا برتاؤ کیا ہے

فاستفع له من دون ارجاء فقد ضاقت علیه الارض والارجاءٔ

بالامیدی او نا جبرکے بعد اسکی سفاعت فرمائیں کیونکہ زمین اور اس کے وسیع وعریض اطراف واکناف اسکے لئے تنگ ہوچکے ہیں

یامن اعانت بلطمه جملا شکا لطفا فلی شکوی نوی وشکاءٔ

اے سناکی اونٹ کے فریاد رس مجھ پر بھی ویسی ہی مہربانی فرمائے مجھے بھی پیاری الد ہجوری کی شکایت ہے۔

قد طال اشکاء الکروب فاشکی فاستفع لیرفع ذلك الاشکاءٔ

مصائب کی سختی زمانہ دراز ہوا آکو دور فرمائیے اور سفارش کیجئے تاکہ اس دبیتا سے نجات ملے

لم یبق لی غیر امتیا حك لی لدی الرحمٰن الرحیم المستماح رجاءٔ

آپ کی سخاوت وعطا کے سوا رحمٰن رحیم معطی کے سامنے مجھے کوئی امید نہیں

یجبی وحمی حماه وارحم علی یجی فمحك لا یرد دعاءٔ

مجھے نفع پہنچائیے اور خدا کی بارگاہ میں سفارش فرمائیے، میری مصیبتوں پر رحم فرمائے کیونکہ آپ مستجاب الدعوات ہیں

یارب حقق لی رجائی ولا یکن لی فی النجاة من العدای ارجاءٔ

اے خدا! میری امیدوں کو ثابت کر دکھا اور دشمنوں سے مجھے نجات دلانے میں تاخیر نہ فرما

قد قمت ارجی القاعدین الی الوغی وقعدت لما قامت الهیجاءٔ

میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں سرابر آگے بڑھاتا رہا اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیٹھا رہا

فلهم مناقب لا يحيط بوصفها　　من واصفٍ مدحٌ ولا اطراء

ان کے اوصاف ومناقب کا احاطہ کسی مدح کرنیوالے کی مبالغہ آمیز مدح بھی نہیں کرسکتی

أفكيف يوصف جدّ خطر جدّاهم　　خير الانام وهم له اجزاء

ان بزرگوں کی فیروزبختی کی کیا تعریف ہوسکتی ہے جبکہ ان کے جدامجد افضل خلق خدا ہیں اور وہ سب ان کے اجزاء ہیں۔

اصحابه حمس اشدّاء على الـكفّار فيما بينهم رحماء

ان کے صحابہ بڑے بہادر، آپس میں رحیم، اور دشمن پر شدید ہیں

اثنى عليهم ربّهم في آية　　ما فوق هذا للعباد ثناء

اللہ نے قرآن کی آیت میں انکا وصف بیان کیا ہے یہ وصف ایسا ہے کہ اس سے بڑھکر انسانوں کی تعریف نہیں ہوسکتی

السابقون الاوّلون خيارهم　　وخيارهم خلصائه الخلفاء

انھیں "السابقون الاوّلون" سے یاد کیا گیا ہے یہ طبقہ صحابہ میں سب سے بہتر ہے اور ان میں بھی سب سے اعلیٰ خلفاء راشدین ہیں۔

يا رحمة للعلمين ارحم على　　من لا له في العالمين رثاء

اے رحمت عالم! اس شخص پر رحم کیجئے جس کے لئے زمانے میں کہیں رحم نہیں۔

افديك منّ على اسيرٍ ما له　　راثٍ ولا منٌّ له وفداء

میں آپ پر قربان! اس قیدی پر احسان فرمائیے جس پر نہ کوئی رحم کرنے والا ہے اور نہ اس کے پاس فدیہ و احسان ہے

هو مفزع للناس إذ فزعوا إذا — حشروا فليس لهم سواه رجاء

میدان حشر میں لوگوں کی سراسیمگی کے وقت وہ جائے پناہ ہیں ان کے سوا اور کسی سے امیدیں نہ ہوں گی

یأتون آدم ملتجین وغیره — مستشفعین فأحجم الشفعاء

وہ سب حضرت آدم اور دوسرے رسل علیہم السلام کے پاس طلبگار شفاعت ہو کر جائیں گے مگر وہ سب خاموشی اختیار کر لیں گے ۔

فأتوه حین استیأسوا من غیرهم — فیجابه الإلحاح والإلحاء

ان سے مایوس ہو کر وہ سب اس سخی داتا کے خدمت میں حاضر ہوں گے، یہ فلاح و نجات والی سخاوت سے کام لیں گے

طلب الإمام رضاء من مطلوبه — هو أن یکون لمصطفاه رضاء

انہوں نے مخلوق کیلئے خدا کی وہ خوشنودی چاہی، جو اسکے برگزیدہ بندہ کی رضا تھی

ورضاؤه هو أن یکون نجاته — للمؤمنین من العذاب نجاء

اور ان کی رضا اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ایمان والوں کو عذاب سے نجات ملے

أولاده عن أمّا حسن سادة — دون الأنام لهم سناً وسناء

ان کی اولاد شریف بزرگ اور سارے مخلوق پر انہیں رفعت و بلندی حاصل ہے اور ان کی چمک دمک کے سامنے سب پست ہیں

خُلق کمار سادة کرام هم السلاء والنجباء والنقباء

وہ حلیم و کریم اور نجیب و نقیب ہیں۔

فظھور ملتہ محا مِللاً کما　　تمحو الکواکب من ذکاء ذکاء

انکی ملت کے ظہور نے تمام ملتوں کو اس طرح مٹا دیا جیسے تارے سورج کے چمکتے ہی محو ہو جاتے ہیں

یمحو ضیاء الشمس نور کواکب　　ویطم فوق کواکب داماء

سورج کی روشنی ستاروں کی چمک مٹا دیتی ہے اور سمندر دریاؤں پر غالب آجاتا ہے۔

فاللہ اظہر دینہ وادامہ　　فلدعلیٰ مر الابود بقاء

اللہ نے ان کے دین کو غالب و باقی رکھا اور ہر دور دہور پر اسی کو بقا ہے

لاعزو ان جحد السفاہ بدومن　　فی قلبہ داء العناد عیاء

اگر بیوقوف اور معاند دشمن ان کے ان کمالات کا انکار کرتے ہیں تو تعجب کی بات نہیں

ماضر عین الشمس ان جحدت بہ　　عین الضحیٰ برو مقلۃ عمیاء

قرص خورشید کو اندھے کی آنکھ کی بے نوری ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

اللہ اوجب ان ینوہ باسمہ　　فی حین یرفع للصلوٰۃ نداء

اذان میں ان کے نام کو بلند آواز کے ساتھ پکارنا، اللہ نے ضروری قرار دیا۔

ان زاد آدم من بنوتہ علیً　　فلما اعتلی ببنیھم الآباء

اگر آدم عم کے مراتب اس فرزند سعید کی بدولت بلند ہوگئے تو تعجب کیوں ہے بہت سے باپ بیٹوں کی وجہ سے بلند مرتبہ ہوئے ہیں

قد شاء رسل ان یکونوا امۃً　　وسطاً فاعطی بعضھم ماشاؤا

بہت سے رسولوں نے امت وسط ہونا چاہا ان میں سے بعض کی آرزو پوری کر دی گئی

(جیسے کہ زمانہ امام مہدیؑ میں عیسیٰ علیہ السلام یہ شرف حاصل کریں گے)

اس دی عماء من اصابعہ جری		عطشی فاھلھم روی و شفاء
انگلیوں سے پانی جاری کرکے انھوں نے پیاسوں کو سیراب و شاداب کیا
کما شبع العرابی الکثیر بیمنہ		نزر و کم مال المقل نراء
ان کی برکت سے بہت بھوکوں کا تھوڑی سی غذا سے پیٹ بھر دیا اور بہت نادار مالدار بنے
قد حن جذع حین فارقھا		تبکی المتیم فی النوی البرحاء
ان کی جدائی پر کھجور کا تنا اس عاشق کی طرح رویا جسکو معشوق کی دوری کی سوز ش رلاتی ہے
امتان امان یعلم حکمۃ		فلا حکمت عن ذکرھا الحکماء
وہ ایسی دعوتیں لائی ہیں جو کہ ایسی حکمت کی تعلیم دیتی ہیں جسکے سمجھنے سے حکما و عقلا بھی عاجز ہیں
حکم تلا ذکر الحکیم احکمت		آیاتہ فیھا ھدی وشفاء
وہ عالم میں ذکر حکیم کو تلاوت کرتے ہیں اسکی آیتیں محکم ہیں ان میں ہدایت و شفا ہے
ذکر احوی حکما واحکاما ھا		عقل العقول وعیت العقلاء
وہ ذکر حکمتوں اور حکموں پر مشتمل ہے جس سے عقلیں دنگ اور اہل عقل و دانش عاجز ہیں
بلغت بلاعتھا الکمال فاحجم		البلغاء منہ واعجم الفصحاء
اس ذکر حکیم کی بلاغت کمال کو پہنچی ہوئی ہے، اس نے بلیغوں کو ساکت
اور فصیحوں کو گونگا سا دیا ہے۔
جلی سواد شرائع مسوخۃ		لشریعۃ ھی سمحۃ بیضاء
انھوں نے اپنی اصل و روشن شریعت کے ذریعے منسوخ شریعتوں کی سیاہی کو دور کردیا

قد طاب طیبة اذ ثواھا واغتلت شرفا یممہ ساحھا البعداء

ان کے قیام سے طیبہ (مدینہ منورہ) پاک و بلند رتبہ ہوا، دور دور سے لوگ اس کی زیارت کا قصد کرکے آتے ہیں۔

بشر بشیر بشارت زبر بہ من قبلہ انبا بہا الانبیاء

وہ خوشخبری سنانے والے انسان ہیں، ان سے پہلے صحف آسمانی اور انبیاء کرام انکی بشارت دیتے آئے۔

انبا ببعثتہ المسیح و قبلہ موسی کما انبا بہ شعیاء

ان کی بعثت کی عیسیٰ علیہ السلام اور ان سے قبل موسیٰ علیہ السّلام نے بشارت دی جیسے کہ شعیاء (بن امصیا) نے عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دی تھی۔

جاءت بنات الملاک ساخنہ کما انبا الزبور بہ وھن اماء

شہزادیاں ان کے دربار میں لونڈیاں بنکر حاضر ہوئیں اسی طرح صحیفۂ آسمانی کی پیشینگوئی تھی

اومی الی القمر المنیر فشقہ وابانہ شقین ذا الایماء

چمکنے اور چمکانے والے چاند کو انھوں نے اشارہ سے دو ٹکڑے کرکے دونوں کو جدا جدا کردیا

والشمس شفت للغروب فاوقفت لیکون منہ للصلوٰۃ اداء

سورج غروب ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا کہ ادائے نماز کے لئے ٹھیر گیا

حیتہ احجار واشجار و کم نطقت لہ بفصاحۃ عجماء

پتھروں اور درختوں نے انھیں سلام کیا اور بہت سے چوپائے ان سے فصاحت کے ساتھ ہم کلام ہوئے

هو اول النور السنی تلمحت بضیائه فی العالم الاضواء

وہ پہلا نور ہے جو دنیا میں چمکا اور اس کی روشنی سے سارا عالم منور ہوا۔

هو اول الانبیاء آخرهم به ختم النبوة وابتدا الانبیاء

وہ اول وآخر پیغمبر ہیں انہیں پر نبوت ختم ہوئی اور انہیں سے اس کی ابتدا ہوئی تھی

نبأ به الله المهیمن سره فلاح الآلاء والانباء

وہ بہترین سردار ہیں خدائے پاک نے انہیں کے ذریعہ ظاہر کیا اور انہیں کی وجہ سے اکرام بلا وبرکت

قد خصه الباری باوصاف علی لم یعطها الاحداث والقدماء

خدائے انہیں ایسے بلند اوصاف کے ساتھ مختص کیا جو کسی جدید وقدیم کو نہ بخشے گئے

اعطاه فضلا لیس یمکن ان یکون له شریک فیه ولو شرکاء

انہیں ایسا فضل وعلو مرتبہ عطا کیا کہ اس میں کوئی بھی ان کا شریک سہیم نہیں

اسماه اذ اسماه بالحسنی فمن اسماء خالقه له اسماء

ان کے ایسے اچھے نام رکھ کر رفیع الشان بنایا خالق کے ناموں میں سے ان کے بھی بہت سے نام ہیں

بر رحیم مفضل ذو قوة هاد رؤف محسن معطاء

نیکوکار رحمدل، کثیر الفضل صاحب قوت ہادی مہربان محسن کثیر العطا ان کے

اوصاف ونام ہیں

قد ازدهت مکة برفعة میلاده وتشرفت بوجوده البطحاء

ان کی پیدائش سے مکہ کی شان دوبالا کر دی، اور بطحا نے ان کے وجود سے شرف پایا

هدّ والمساجد والقصور كأنها — لم تبن لم يك ثمّ قط بناء

مسجدوں اور محلوں کو منہدم کیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس جگہ کوئی عمارت ہی نہ تھی نہ وہاں کبھی کچھ بنا ہوا تھا

بخست بنحستهم زروع الارض من — شؤم فلا ريع لها ونماء

ان کی نحوست وذلت کی وجہ سے زمین کی پیداوار میں بھی کمی ہوگئی اس میں کوئی نشو ونما باقی نہ رہا

قدروا على الناس المعاش فقدرهم — ان لا غداء عندهم وعشاء

انھوں نے لوگوں پر زندگی تنگ کردی، ان کے لئے رات اور دن کا کھانا بھی نہ رہا۔

فظهورهم ثقلت باوزار بما — شحنت بطون صدورهم شحناء

ان کے سینوں میں بھرے ہوئے کینوں کے بوجھ سے ان کی پیٹھیں ثقیل ہوگئیں

افهل لعدوان تعدّى حدّه — حدّ وهل للمعتدين جزاء

کیا حد سے متجاوز سرکشی کی بھی کوئی حد ہے؟ اور کیا سرکشوں کی کوئی سزا بھی ہے؟

لم اقترف ذنبا سوى ان ليس لي — مع هؤلاء مودة وولاء

میں نے اس کے سوا کوئی گناہ نہیں کیا کہ ان سے کسی قسم کی محبت و دلچسپی نہیں رکھی

فولاؤهم كفر بنصّ محكم — ما فيه للمرء المحق مراء

اور بات یہ ہے کہ نص محکم قرآنی سے انکی محبت کفر ہے حق پرست انسان کو اس میں شک نہیں ہو سکتا

كيف الولاء وهم اعادي من له — خلق السماء والارض والانشاء

ان سے محبت رو کیسے رکھی جاسکتی ہے جبکہ آسمان وزمین جس کی وجہ سے پیدا کئے گئے

اس ذات گرامی کے یہ نصاری دشمن ہیں

وُجِد وجَدّ مسعد مع جِدَّۃ　　لم یبتلہا بلوی ولا لاواء

تونگری، خوش بختی، نصیبہ وری، یہ سب نعمتیں حاصل تھیں جنھیں آزمائش و مصیبت بھی بوسیدہ نہ کرسکی ہے۔

وتمام عافیۃ وعرض زادہ　　عرض یزید وعزۃ قعساء

پوری عافیت، بڑھتے ہوئے سامان کی بنا پر بڑھتی ہوئی آبرو اور پائدار عزت بھی نصیب تھی۔

کم نعمۃ زالت وکم من نعمۃ　　حالت وحل الضّر والضراء

بہت سی عیش کی زندگی متغیر اور کتنی نعمتیں زائل ہوگئیں سختی اور بدحالی نازل ہوگئی۔

اللہ اقنانی علوما یقتنی　　منہا علوما جمۃ علماء

اللہ نے مجھے وہ علوم عطا کئے کہ ان میں سے بہت کچھ علماء نے حاصل کئے۔

حال النّوی بینی وبین اَحِبّتی　　حالا وحال الحال والنعماء

میرے اور میرے احباب کے درمیان جدائی حائل ہوگئی، حالت اور نعمت متغیر ہوگئی

ھجم الشرور وفاجئت فتن بہا　　ذھب السرور وولّت السَّرّاء

شرارتیں گھر آئیں اور فتنے اچانک چھا گئے مسرت جاتی رہی اور شادمانی وراحت پھر گئی

قد سلّط الانصار فی امصارنا　　ان صار انصارا لہم سفہاء

نصرانی ہمارے شہروں پر مسلّط کردیئے گئے، بیوقوف ہندستانی ان کے مددگار بن گئے

لم یعلموا ان لا وفاء لہم ولا　　ان لا لہم مند وحۃ ووفاء

وہ اسے نہ سمجھ سکے کہ ان کے پاس وفاداری ہے نہ وسعت و حمایت

مستوبلا وخما فما لطعامه　　شبع ولا فی مائه ارواء

اس کی آب وہوا ناموافق اور وبائی ہے۔ نہ تو اسکے کھانے میں کچھ سیری ہے نہ پانی میں سیرابی

فالماء آن ماله سمّی کما　　المأکول زق ما له استمراء

پانی گرم ہے جس میں سیرابی نہیں جس طرح کہ غذا تلخ ہے جس میں مزا نہیں

ما فیه من عذب یسوغ ولا بها　　طعم یلذ ولا هناک هناء

وہاں نہ شیریں پانی ہے نہ لذیذ کھانا، اور نہ وسیع میدان ہی سامنے ہے

زادت علی کرب لی عوارض حتفٍ　　الفتق والقولنج والقوباء

میری مصیبت میں میرے بدن کے عارضوں قولنج فتق دو طوں میں پانی اترنا)

اور قوبا (داد) نے اضافہ کردیا

وحدی لغایة غفت وعفت لی　　النکبات فیه ومن یجد نکباءُ

میرا غم والم شے والی غایت پر ہوا اور ایسی مصائب مجھ کو مٹا دیں کہ ہیں کیا کسی کی ہوا

کانت لفصل الحق فصل مثالة　　منها علی الامثال لی استعلاء

فصل حق کے لئے رفعت و بلندی کا فصل تھا اسی کی وجہ سے مجھ کو برابر والوں پر سر بلندی حاصل تھی

ووجاهة بین الوجوه وجاهة　　تعنو لها الاعیان والرؤساء

سرداروں میں قدر و منزلت ووجاہت میسر تھی جن کے سامنے رؤسا اور اعیان ملک جھکتے تھے

ونباهة ونباهة ونباهة　　ونباهة وسماحة وعلاء

کمال رفعت　وسعت، رہبت　بزرگی، برتری

فتمسکنوا اذ ما لھم سکنی ولا قوت ولا شیئ ولا اشیاء

وہ مسکین و فقیر بن گئے کیونکہ مکان، روزی، اور کوئی چیز بھی ان کے لئے نہ رہی۔

وترکتھم غرثی جیاعا ما لھم مال ولا مغنی لھم وغناء

میں نے انھیں حالتِ گرسنگی میں چھوڑا، نہ ان کے پاس مال و دولت ہے نہ مسکن و منفعت

قد جانبتھم اقربون تجنبوا کا جانب وجفا ھم الاکفاء

اُن سے اپنے بیگانے بن کر علیحدہ ہو گئے اور برابر والوں نے ظلم و ستم اختیار کیا۔

الاسرا نائی اُسرتی واقاربی ما من حمیم فیہ الا الماء

میرے خاندان اور اقارب کو قید و بند نے دور کر دیا، اب یہاں پانی کے سوا کوئی دوست نہیں ہے

عمیت علی الابناء انبائی کما عمیت علینا منھم الانباء

میرے بیٹوں سے میری خبریں ایسی ہی پوشیدہ ہیں جیسی ان کی مجھ سے۔

ابکی لبعد اقاربی واحبتی ولھم علی فقدی اسی وبکاء

میں احباب و اعزہ کی دوری پر روتا ہوں اور وہ میری جدائی پر

حق البکاء لھم علیّ اذا لردیٰ والعیش فی الحبس لردیٔ سواء

ان کا مجھ پر رونا ایک حد تک ٹھیک بھی ہے کیونکہ مرنا اور ذلیل قید میں زندگی گذارنا دونوں برابر ہیں

أسکنت وحشا لا یری فیہ سوی الوحشین الغربان والغرباء

مجھے وحشیوں میں بسا دیا گیا، اس قید خانہ (جزیرے) میں دو قسم کے وحشیوں کوّوں

اور اجنبیوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

ظلماء قد غشیت بحر مظلم   لا لؤلؤ فیها ولا لألاء

وہ جو تاریک ہے اور تاریک دریا سے گھرا ہوا ہے اس دریا میں موتی ہیں نہ روشنی

لا فصل بین ربیعها وخریفها   لا الصیف صیف لا الشتاء شتاء

یہاں کی فصل بہار وخزاں میں کوئی فرق نہیں یہاں نہ گرمی گرمی ہے نہ جاڑا جاڑا

تیهاء آتیها یتیه وللعدی   یزداد فیها التیه والخیلاء

یہاں آنے والا حیران و پریشان ہو جاتا ہے اور دشمنوں کا کبر و غرور اور بڑھ جاتا ہے

هم فی غنی وفی وبال ادعلوا   ما لوا علی الاسری فهم فقراء

وہ تونگری مسرت اور مال و دولت سے بھرپور تھے متکبر بنکر قیدیوں پر ظلم و ستم

ڈھانے لگے تو فقیر بن گئے (گویا اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئے)

وطن یقیها سقف تموز حکل من   رکبوا علیها ضل عوا وقاء وا

اسکا استیکونے کھا یوالی کشتیوں کے ذریعہ پر جو بھی اس پر سوار ہوتا ہے سر پاتی ہیں گے ذیلا ہوتا ہے

وتل امواج تموش تیا ہم   وو طا هم و تسلهم الداء

اسکی جوش مارتی ہوئی موجیں کپڑوں اور ستروں کو تر کرتی ہیں اور اسکی تری سے سارے بیمار ہو جاتے ہیں

ابنیت عن وطنی واهلی بغتة   طلما ولی ذریة ضعفاء

مجھے ظلماً اہل و وطن سے اچانک دور کر دیا گیا مجھے کمزور ضعیف ذریت کو بھی چھوڑنا پڑا

هما خرجوا عن دارهم ظلما فما   سکن واسکان لهم وثواء

ان کو زبردستی ان کے مکان سے نکال دیا گیا۔ ان کے لئے آرام و سکون کی کوئی جگہ نہیں چھوڑی

وغلیلهم حزنا وغلتهم على جوع وقلة غلة وغلاء

ان کی غم انگیز تشنگی اور بھوک پیاس قلت غلہ اور گرانی نے بھی مبتلائے مصیبت کردیا۔

ولقد احلونی بمهلکة بها لا الارض ارض لا السماء سماء

انھوں نے مجھے ایسے مہلکہ میں ڈال دیا جہاں زمین، زمین ہو نہ آسمان آسمان

فسماؤها الدنیا غمائم صوبها سیل الغموم وارضها حصباء

اس کا قریبی آسمان وہ بادل ہیں جن کی بارش غموں کا سیلاب ہے۔

اور اس کی زمین سنگریزے ہیں۔

لا غیث فیها انما من حرها من جوها یتصبب الرحضاء

اس میں بارش نہیں ہوتی، گرمی کی شدت سے فضاء آسمانی سے بخارات کا پسینہ گرنے لگتا ہے

غم السموات الغمام فلا یری لیلا ویوما نیر وذکاء

بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا ہے، جسکی وجہ سے دن میں سورج اور رات کو چاند نظر نہیں آتا۔

فالليل فيها ظلمة في ظلمة واليوم فيها ليلة ظلماء

رات میں تو اندھیرے پر اندھیرا چھایا رہتا ہے اور دن اندھیری رات کی طرح ہو

ما کان فیها قط یوم شامس ابدا ولم تك ليلة قمراء

اس میں سورج والا کبھی دن نہیں ہوتا اور نہ چاندنی والی راتیں ہوتی ہیں

افق بهیم ما استهل هلاله احد ولم یر شمسها حرباء

اس کے سیاہ افق پر کسی نے چاند نکلتا نہیں دیکھا اور نہ گرگٹ ہی سورج دیکھ سکا۔

هو سقط بحر ما بها ترد لا ترد لا تر ولا حلواء
وہ دریا کا کنارا ہے۔ جہاں میدان، مہربان، گیہوں، اور تیری کسی چیز کا پتا نہیں
قد مات احیاء من الاشباه والنسا قون لا موتے ولا احیاء
قیدیوں کے گروہ کے گروہ مر چکے ہیں جو بچے ہوئے ہیں وہ مردوں میں ہیں نہ زندوں میں
ما عند للموتی صلوۃ حارۃ وتری ولا کفن لهم وعطاء
میت کی نماز جنازہ، قبر، کفن اور پوستین کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں
ما فیہ من عار علی عار ولا للمعری المعتریہ حیاء
یہاں ننگے کے لئے کوئی عار اور طالب احسان محتاج کے لئے سوال کی حیا نہیں
هو من ۃ سوداء من بیوی بها علت علیہا المتۃ الصفراء
وہ ایسی حراست گاہ ہے جہاں طاقتور انسان بھی رہ کے بعد دبتوں کا علہ ہوتا ہے۔
سقوا علی اسلامهم فاصابهم نار السرامن ایدا انهم ایذاء
قیدیوں کو ایسی مشقت میں مبتلا کیا گیا کہ ان کی ایذا ہلاکت کے درجہ تک پہنچ گئی
قد اوثقت من علتهم وعلیلهم اعلا لهم حلا هام الاحیاء
ان کے کیبوں کی وجہ سے قیدیوں کی بیڑیاں مضبوط ہو گئیں اور تمسکن نے

دشواری میں ڈال دیا۔

اودت بهم محن وبأس سامهم احراسهم والبوس والباساء
لاؤں اور کھیلوں نے انہیں ہلاک کیا اور چوکیداروں اور مصیبتوں نے رنج میں مبتلا کر دیا

لم یکتفوا ظلماً بحبسی بل بما   فوق احتباسی عنی بہ وجلاء

ظلم وستم کے لئے میری قیدہی کافی نہ سمجھی بلکہ جلا وطنی اور غربت ومسافرت کی سزا بھی دی

اسروا واسرعونی الی جبل بہ   فنا بادمن اسرائھم اسراء

قید کرکے مجھے ایسے پہاڑ پر رات میں وہ لے گئے یہاں پہنچکر قیدی ہلاک ہوچکے ہیں

جبل احاطت ابحر بشعابہ   ماحولہ غیر الفناء فناءِ

اس پہاڑ کی گھاٹیوں کو دریا گھیرے ہوئے ہیں موت کے سوا اس کا کوئی صحن نہیں۔

مستوبل حاق الوبال لکل من   یاتیہ اذ عمّت بہ الاوباء

یہاں کی آب وہوا ناموافق اور آنے والے کے لئے وبال ہو' وبائیں ہر طرف عام ہیں

ذل الاعزّۃ فیہ واعتلّوا وقد   عزّ الدواء وشاعت الادواء

یہاں شریف وعزیز ذلیل وگریہ کناں ہیں' دوا ناپید اور بیماریاں بے شمار ہیں

عمّ العقاب عقابہ وفشا الودی   یزیلی الدّوی فیہا دوی ودواء

اس کی گھاٹیوں میں عفونت وہلاکت عام ہے۔ اس میں دوا' دارو بھی بیماری میں اضافہ کرتی ہے۔

ماساغ ماء فیہ للصادی ولم   یھنأ لطاوٍ فیہ قطّ غذاء

اس میں نہ تو پیاسے کے حلق سے پانی اترتا ہو اور نہ بھوکے کو غذا ہی بھلی معلوم ہوتی ہو

الاکل زنّ ماھنا لحم ولا   بصل ولا بقل ولا قثاء

ماش کی دال غذا ہے۔ گوشت' پیاز' ترکاری' ککڑی کچھ میسر نہیں۔

لم يتركوا في السجن عندي خادماً ليريد في اليد أنهم إيذاء

قید ملنے میں میرے پاس کوئی خادم بھی ایذا رسانی کے ارادہ کی وجہ سے نہ چھوڑا

امسي واصبح مقلقاً مالي سوى متوك القتاد والوقاد وطاء

صبح دشام بے چینی سے گذرتے ہیں کانٹوں اور چنگاریاں بستر کے بجائے مقدر ہو چکی ہیں

يعدو علي سواد ميسان عدى صهلا لتوارب شرهم صهباء

بہت سے معید رنگ سر انجوڑا اور سیگوں سو کچھوئے اُلے دشمن مجھ پر ظلم و بیداد کرتے ہیں

سود الكبود وجوههم بيض لهم في الحلال لين في القلوب قساء

وہ سیاہ جگر، سفید فام، نرم حلد اور سخت قلب واقع ہوئے ہیں۔

نكل وقاح مالهم عار ولا عار ولا حلم ولا استحياء

وہ بدبخت بے شرم ہیں اہین ننگ و عار ہے نہ غیرت علم و حیا ان کے پاس ہو کر گذری ہے

لكن غلاظ لسن فيهم رقة وحماية وحمية واباء

بڑے جھگڑالو اور سخت دل ہیں ان میں نرمی اور مادہ حمایت و حمیت نام کو نہیں

جمع المعائر كلها فيهم شفى الذكران يعني في الاناث تداء

سارے عیوب ان میں موجود ہیں، مردوں میں کمینگی اور عورتوں میں حرام کاری پائی جاتی ہے

بمن الهمو ولعلو هن ولعيهم كثر الفسوق وشاعت الفحشاء

ان سب کی بدمعاشیاں، مردوں کی سرکشیاں عورتوں کی حرام کاریاں فسق و فجور

کی اشاعت کرنے کا سبب ہوئی ہیں۔

منعوا اشد المنع ان یلقانی الاحباب والاخوان والابناء

انھوں نے سختی کے ساتھ، دوستوں، بھائیوں اور بیٹوں کو مجھ سے ملنے سے روکدیا

وسلبت اثوابی وبعد تجردی للبس اعطی میزر وکساء

میرے کپڑے چھین کر، مجھے تہبند اور کملی پہننے کے لئے دے دی گئی

سلبوا الکسی لبسوا علی کساءھم مالی سوی ذاک الردی رداء

کپڑے اتار کر قیدیوں کی کملی پہنادی، میرے پاس اس خراب کملی کے سوا کوئی دوسری چادر نہ رہی

سلبوا الاوانی والنعال بظلمھم لم یبق عندی قصعۃ واناء

میری برتن اور جوتے بھی ظلماً چھین لئے، میری استعمال کیلئے کوئی برتن اور پیالہ بھی باقی نہ چھوڑا

مالی حفی فی حفای وکان لی من قبل لبسی للکساء کساء

میرے ننگے پاؤں رہنے پر کوئی مہربانی سے پوچھنے والا بھی نظر نہ آیا حالانکہ اس کملی اوڑھنے سے قبل مجھے مجد و شرف حاصل تھا۔

کم من صفی بی حفی مخلص فی الود منہ محوضۃ وصفاء

میرے بہت سے مہربان، مخلص، اور صاف دل دوست، جنکی محبت، صدق و صفا پر مشتمل تھی۔

صدوا وافصدوا عن محاورتی فلم یمکن من ازورۃ لھم ولقاء

انھیں روکدیا گیا، وہ میری ملاقات، بات چیت اور زیارت سے مجبوراً محروم رہے،

لو شاھدونی حافیا لاسترجعوا ولکان منھم فی حفائی حفاء

وہ مجھے ننگے پاؤں دیکھتے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے، اور میری برہنہ پائی پران سے جھگڑا کرتے

اذکنتُ فی عیش رغید رائع　　　محمد الکروب وفاجئت ارزاء

میں جو خوشگوار عیش و عشرت میں تھا پھر غموں کا ہجوم اور مصائب کا ناگہانی ورود ہوا۔

سحق الحقود صدور هم حتى بدت　　　بالضغن من افواههم بغضاء

اس کے سینوں کو کینوں نے بھر دیا ان کی زبانوں پر بھی بغض کی وجہ سے دشمنی ظاہر ہونے لگی۔

قد ضیّقوا عیشی علیّ بغضه　　　ولسیتُ عیشاً کان فیه رجاءُ

انھوں نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا میں اس زندگی سے دل برداشتہ ہو گیا اور

اس پُر مسرت زمانہ کو بھول گیا جس میں آسانی تھی۔

یومی ولیلی فی اشتداد حرارة　　　ودجی هما الساجی وفی الداداء

میری رات دن سخت گرمی اور اندھیری میں گذرتی ہیں گویا کہ سخت موسم گرما کی دن اور کہراہ کی اندھیری رات میں

فالليل ساجٍ ماله صبح ولا　　　لليوم عوضٌ عشيته ومساءُ

لمبی رات تو دائمی شکل اختیار کر چکی ہے جس کی صبح نہیں ہے اور دن کے لئے تمام اوقات ہی ہیں

حجروا علیّ واسکنونی حجرة　　　لم یاتها غیر السموم هواء

مجھے سب تصرفات سے روک کر ایک کوٹھری میں ٹھیرا دیا جس میں بجز لو کے سوا اور کسی قسم کی ہوا نہیں آتی تھی

یا ویلها من حجرة جدرانها　　　تشوی الشوی وترابها رمضاءُ

کیسی مصیبت تھی۔ اس کوٹھری کی دیواریں انسانی اعضا کو بھونتی تھیں اور اس کی مٹی تپتی ہوئی زمین تھی

یا ویل سجن لامبال سلحه　　　وکیف ما فیه قط خلاءُ

کیسا پریشان کن قیدخانہ تھا، تو اسکے میدان میں پیشاب تھا، اسکے پاخانہ میں شامت تھا۔

انّی بلانی خداعنا امراۃٍ بلٰے　　کیدٌ عظیم ما تکید النساء

مجھے ایک عورت کے مکر نے مبتلائے مصائب کردیا، عورتوں کا مکر بڑا ہی زبردست مکر ہے

یحلبن خلقا بالمواثق ثم لا　　لعهودهن وعهدهن وفاء

یہ عہد پیمان کرکے مخلوق کو فریفتہ بنالیتی ہیں پھر ان کے عہد و میثاق کو وفا و قرار نہیں ہے۔

فداعت بان قد شهرت ان منتا　　قوما نبت بهم الدیار ونارُوا

اس نے یہ کہہ کر شہرت دی کہ جو لوگ گھر سے دور پڑے ہیں انھیں امن دیدیا گیا

اذ غرّ هم میثا فهار جعوا الی　　اوطا نهم مستبشرین وفاءوا

ایسے لوگ اسکے اعلانِ امان سے دھوکے میں آکر اپنے گھروں کو خوش خوش واپس ہوگئے

فاتیتُ داری آئبا اذ غرّنی　　ایمان کا فرۃ لها استیلاء

میں بھی کافرۂ متسلط کے اعلانِ امان سے فریب کھا کر مکان پہنچ گیا۔

ثم اعتدی عُمّالها اذ مارعوا　　میثا قها فاتانی استدعاء

پھر تو حکام سلطنت نے اسکے عہد و میثاق کی پروانہ کرتے ہوئے سختی شروع کی اور میری بھی طلبی ہوئی

منهم فعنّونی کان　　لم یُوفیما عاهدت ایفاء

انھوں نے مجھے روک لیا اور خوب اذیتیں پہنچائیں گویا کہ اس عہد ملکہ میں ایفاء عہد کی نیت بھی نہ کی گئی تھی

لما عنوت وما عنوت لهم ربت　　من ظلمهم بی محنة وعناء

جب میں قیدی بنکر بھی انکا اطاعت گذار نہ بنا تو انکی طرف سے رنج و تکلیف میں وہ بھی یادتی کردی گئی

۱؎ ملکہ وکٹوریہ ۱۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لجوی لہ بحوا بحی البراء — حمد اللہ موع وداث الاحشاء

سو دل سے میرے پہلو کی ہڈیوں میں آگ کی سی گرمی ہے آنسو خشک اور مدد کی اعضا گھل گئے ہیں

ولِما السقم من الحوادث البوی — یبکی الصدیق ویسمت الاعداءُ

مجھ پر بارش سے مصیبتوں اور میری اہل وطن سے دوری پر دوست روتے اور دشمن خوش ہوتے ہیں

قد کنت فی عزّ وجاہ کان فی — اعیان اعیان بہ اقداءُ

میں عزت وعظمت کی زندگی بسر کر رہا تھا جو سرکاروں عظماء کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی

اسی الصدیق علی اسای تحازن — حوہی ولی آسوی آساءِ اساء

میرے درد وغم اور تباہی و ہلاکت پر دوست غمگین حیران ہیں ہمارے گرد وہی تیمارداری میں ہر طرح کا اعتبار کرتے تھے

شمت العدی احوال حالی و اعتری — ما ساء لی المسّاء والوسّاء

میری اس تغیر حال پر حاسدوں کی خوشی اور دشمنوں کی رنجش دوائی پر دشمن خوشیاں منا رہے ہیں

الم السقم سا وهمّ همّا — وبوی لسامها لئ وبلاء

سخ نازل اور غم ہم پر طاری ہو گیا اور ہماری دوری میں کمزوری و سختی ہے

حلت عظام مصائب حلت بها — وهن العظام ودقت الاحشاء

بڑی بڑی مصیبتوں نے گھیر لیا انکی وجہ سے ہڈیاں کمزور اور اعضاء ریزہ ریزہ ہو گئے

واللہ سبحانہ ولی التوفیق والاکرام ۵	واللہ سبحانہ ولی التوفیق والاحقاق ۵

في قوافي اللون، فريدة
كالدر المكنون، كل بيت
منها بيت القصيد، بل
بيت مشيد، عدد أبياتها
ثلثة مائة أو يزيد، لم
يتيسر لي إتمامها وعاقني هجوم
البلايا وازدحامها، مطلعها

شعر

ما ناح أورق في أوراق أغصان
إلا وهيج أشجاني وأحزاني

فإن منّ عليّ ربي الخلاق
بالتخليص والإطلاق،
ذيلتها بحسن التخلص
بمدح من خص من مكارم
الأخلاق، بأوفى خلاق
عليه وعلى آله أحلى
الصلوات إلى يوم التلاق،

جو دُرِّ یتیم کی طرح فرید و یگانہ ہے،
اس کا ہر شعر مضبوط و مرصع قصر کی
طرح ہے، اس کے تین سو سے کچھ زیادہ
اشعار ہو کر رہ گئے اس کے اتمام کی
نوبت نہیں آئی، مصائب و آلام کے
ہجوم نے تکمیل کا موقع نہیں
دیا۔ اس کا مطلع یہ ہے

ما ناح اورق فی اوراق اشجان
الا وہیج اشجانی و احزانی

اگر اللہ نے مجھ پر رہائی سے
احسان فرمایا تو اس ذات
کی مدح اس میں شامل کر کے
ختم کروں گا جسے مکارم اخلاق
سے پورا پورا حصہ ملا ہے
اس پر اور اس کی آل پر
قیامت تک صلوٰۃ و سلام

وآلہ المیامین، وصحبہ
المحامین، یا ارحم الراحمین
یا احکم الحاکمین،
المنتقم للمظلومین من
الظالمین، وآخر دعوانا
ان الحمد للہ رب العالمین،
ھذا، وقد وصفت بعض[۱]
ما نابنی، ونبذا مما اصابنی،
فی قصیدتین احدھما
ھمزیۃ تحکی ھمزات الشیاطین
والاخری دالیۃ دالۃ علی
ما یعانی ھذا الحزین الرہین،
وختمتہما بمدح سید المرسلین،
الرسول المکین الامین،
علیہ ازکی صلوات المصلین،
وتسلیمات المسلمین، وکنت
قد نظمت قبل قصیدۃ،

اسکے صحابۂ محافظین دین کے صدقے
میں ہماری سن لے، اور اے ارحم الراحمین
اے احکم الحاکمین! تو ہی ظالموں سے
مظلوموں کا انتقام لینے والا ہے،
بیشک ساری تعریفیں سارے جہان
کے پالنے والے کے لئے ہیں؛
یہ پُر درد والم انگیز کہانی ختم ہوئی،
میں نے اپنی مصیبت وپریشانی کا کچھ حال
دو قصیدوں میں بھی لکھا ہے، ایک قصیدہ
ہمزیہ ہے جس میں شیطانی وساوس
کا ذکر ہے اور دوسرا دالیہ ہے جس میں
اس غمگین ومعذور کی تکلیف ورنج
کا تذکرہ ہے۔ ان دونوں قصیدوں
کو سرورِ کائنات علیہ السلام
والصلوٰۃ کی مدح پر ختم کیا ہے
ان دونوں سے پہلے "نون" کے
قوافی میں بھی قصیدہ لکھا تھا۔

[۱] لبعض ا[لنسخ] و[illegible] ۔

عمداداعاہ واعانۃ للطلوم
اداستصرحہ وباداۂ وھو
یحیی عما یمیی ویطلق
عما یقلقی ویکیی عما یلکیی ویبرئی
عما یبری ویقدلی مں یاحلالی
ویسلمی مں یظلمی ویرحم
علی عویلی وبکائی ویستصی
عں استکانی وشکائی ویمحو
شامتی وسقائی انہ سامع
الدعاء واسع العطاء دافع
البلاء فھو الذی ارجوہ
لجلاء حزن الجلاء والاء
حسن البلاء من الآلاء
یارب فأمحی مما انا فیہ
یا معول المرتحیں یاموئل
الملتحیں آمیں بحرمۃ
حبیبک الامان الامیں

اور کشف معیبت کا وعدہ کیا ہے۔
وہی مجھے تکلیف سے نجات دیگا،
وہی قلق واضطراب سے آزاد کرے گا،
وہی امراض سے شفا بخشے گا، وہی پکڑنے
والے سے چھڑائے گا، وہی ظالم سے
بچائیگا، وہی میری گریہ وبکا پر رحم کریگا، وہی
میری بدبختی وشامت کو مٹائے گا
وہ دعا کا سننے والا، بہت دینے والا،
اور بلاؤں کا دفع کرنے والا ہے۔
اسی سے جلا وطنی کے غم کو دور اور
بہترین نعمتوں کے عطا کرنے کی
امیدیں وابستہ ہیں۔
اے میرے رب! مصیبتوں سے مجھ کو نجات دے
اے امیدواروں کے امیدگاہ اور اے
التجا کرنے والوں کے پناہ گاہ اپنے حبیب
امین اکی آل طاہرین ومبارکیں اور

اذا اعتذر الیہ واستغفرہ
عذرہ وعفا، وکم کرب
اذا ناداہ کشف کربہ، وکم
غریب اذا ناجاہ اسعف
اربہ، وکم مسجون یشدّ
علیہ الوثاق، منّ علیہ الرب
الخلّاق، علی الاطلاق،
بالتخلیص والاطلاق،
عن الحبس والاصفاد،
من دون مانّ ولا فاد،

وانا مظلوم مهضوم مضطر،
ومسکین مستکین معترّ،
ادعوہ مناجیا، وابتهل الیہ
راجیا، وانادیہ متضرعا،
بحبیبہ الیہ متذرعا، وقد
وعد ولا یخلف وعدہ
باجابۃ المضطر وکشف السوء

بہت خطا کار جب استعذار و استغفار
کرتے ہیں مقبول بارگاہ ہوتے ہیں۔
بہت درد مند جب اسے پکارتے ہیں مصیبت
سے نجات پاتے ہیں بہت مسافر
جب اپنی حاجتیں پیش کرتے ہیں،
مراد کو پہنچتے ہیں، بہت قیدی جو زنجیروں
میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں، خلاق مطلق
انھیں بیڑیوں اور قیدوں سے
بلا فدیہ و احسان، چھٹکارا دلاتا ہے۔

میں بھی مظلوم و دل شکستہ و مضطر
اور مسکین و ذلیل و محتاج بنکر اسی
خدائے برتر کو پکارتا ہوں، اس کے حبیب
کو وسیلہ بنا کر اور امیدوار رحمت ہو کر اسکی
بارگاہ میں بصد تضرع التجا کرتا ہوں وہ
وعدہ خلافی نہیں کرتا، اس نے مظلوم
ومضطر کے یاد کرنے پر اجابت دعوت

وایوب مما مسہ واصاب،	ایوب (علیہ السّلام) کو مرض و مصائب
من الضر والاوصاب، و	یونس (علیہ السلام) کو شکم ماہی، اور بنی
یونس من بطن الحوت، وبنی	اسرائیل کو بربادی وتباہی سے نجات
اسرائیل مما کانوا یعانون،	دی۔
وکفی موسی وہارون فرعون	اسی نے موسیٰ و ہارون (علیہما السلام)
وہامان وقارون، وکفی	کو ہامان و فرعون وقارون اور عیسیٰ مسیح
المسیح ما مکر الماکرون وکفی	(علیہ السلام) کو مکر ماکرین، اور اپنے حبیب
حبیبہ المصطفی ما کان یمکر	مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دمِ فریب
بہ الکافرون، فان یغشی	کفار پر غالب کیا۔ پھر اگر مجھے مشقتوں
صعوب، ویلحقنی خطوب،	صعوبتوں اور حوادث ومعاصی نے
ویمتقی کروب، وحاقت بی	گھیر لیا ہے تو اس کی رحمت وفضل
ذنوب فلست لفضلہ	سے کیوں مایوس ہوں، وہی میرا
ممتئس ولا من رحمتہ	رب شافی، وکافی اور خطاپوش
متأس فربی ہو الشافی	وآمرزگار ہے،
والکافی، والمعافی والعافی،	
فکم صریع یبکون علی سقمہ	بہت بیمار جو موت کے کنارے پہنچکر
اذا دعاہ سمع وکم معلا لا	بھی اسے یاد کرتے ہیں سنبھل جاتے ہیں،

فی قلوب العدی منّی اضغانٌ
وحقائد، کما ترسخ فی القلوب
من الادیان عقائد، وقد
شحنت صدورهم الوخیمة
بالشحناء والسخیمة، لکنی ارجو
رحمة ربّی العزیز الرحیم،
البرّ الرؤف الکریم، الذی
ینجی الضعفاء العاجزین
من الفراعنة الجبابرة، و
یلئم جراح المظلومین المکلومین
بمراهم مراحم الجابرة، فهو الجبار
علی کل جبّین، وهو الجبار لکل
کسیر، وهو الجبار لکلّ فقیر
وخسیر، وهو المنجّی للمرجی
الاسیر، وهو المیسر لکل
عسیر، وهو الذی نجّی نوحًا
من الغرق، وابراهیم من الحرق،

کے دفینے بن گئے ہیں،
ان ظاہر اسباب پر نظر کرتے ہوئے
میں اپنی نجات سے مایوس اور اپنی
امیدوں کو منقطع پاتا ہوں، لیکن
اپنے رب عزیز و رحیم۔ رؤف
کریم کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں،
وہی تو جابر فرعونوں سے عاجز ضعیفوں
کو نجات دلاتا ہے اور وہی تو زخمی مظلومین
کے زخموں کو اپنے رحم و کرم کے مرہم
سے بھرتا ہے۔ وہ ہر سرکش کیلئے جبار و قہار
ہے، ہر ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنیوالا،
ہر نقصان رسیدہ فقیر کا کامیاب بنانیوالا
اور ہر دشوار کو آسان کرنیوالا ہے،

اسی نے نوح (علیہ السلام) کو غرق، اور
ابراہیم (علیہ السلام) کو طپش و حرق،

ويقتاد نقياد' يسوقه ويقوده
عليط متدايل حلايل' في
قيود من حلايل يسومه
كل مهنته ومحنة' ويبدي
له كل حقد واحنة' ويريه
اوجاعا على اوجاع ولايرثي
لما داتعطش اوجاع فالحمد لله
ما تي على المعافاة' من هذه
الآفات' واشكره على ما له
من المن' وصيانتا اياي
من هذه المحن واني وان
استينست نظرا الى طاهر
الاسباب من عاني' وقطعت
سحاني' فان اعدائي عدوب
في ايذائي' ويسعون باسعوب
ايذائي' واودائي لايستطيعون
مداواة دائي' وقد رسخت

دیکھتا ہوں' انہیں لوہے کی بیڑیوں اور
زنجیروں میں ایک سخت تیز اور غلیظ
انسان کھینچتا ہے' محنت ومہنت
کینہ وعداوت کا پورا مظاہرہ کرتا ہو
تکلیفوں پر تکلیفیں پہنچاتا اور بھوکے
پیاسے پر بھی رحم نہیں کھاتا ہے
خدا کا شکر ہے کہ اس نے ان آفات
ذکالیف سے محفوظ رکھا۔

میرے دشمن میری ایذا رسانی میں
کوشاں' اور میری ہلاکت کے درپے
رہتے ہیں میرے دوست میرے مرض
کے مداوا سے لاچار ہیں۔ دشمنوں کے
دل میں میری طرف سے بغض وکینہ
مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہوگیا ہے
ان کے پلید سینے کینہ وعداوت

يفضى بى الثبور الى الثبور واليوم
بعد ما عشتُ عمرا فى عافية
وحبور وفاهذ وحبور،
قد كنت قبل مبثورا والآن
صرت مثبورا بل مثبورا
وكنتُ زمنًا سليما فرحانا،
واليوم صرتُ زمِنًا كليما
قرحانا، اعانى شدائد
مصائبا، واكافح من صعائب
عصائبا، شعر

حملنا من الايام ما لا نطيقه
كما حمل العظم الكسير العصائبا،

ومع ذلك كله احمد الله
سبحانه واشكره على منه و
فضله فانى ارى غيرى من
الاسارى مثقلا باغلال
مبتلى باغلال يساق فى اقياد

وہ وقت دور نہیں جب یہ کٹھنیاں
مجھے ہلاکت کے قریب پہنچا دیں، ایک
زمانہ وہ بھی تھا جب عیش و مسرت،
راحت و عافیت میں زندگی بسر ہوتی
تھی، اب محبوس و قریب ہلاکت ہوں
ایک زمانہ وہ بھی تھا جب محسودِ خلائق
تھی، اور صحیح و سالم تھا، اب اپاہج
اور زخمی ہوں، بڑی سخت مصیبتیں
اور بیسیوں صعوبتیں جھیلنا پڑ رہی
ہیں۔ ۵

ٹوٹی ہوئی ہڈی جس طرح لکڑی اور پٹی کا بوجھ
اٹھاتی ہے اسی طرح ہم بھی ناقابل برداشت مصیبتیں اٹھا
رہے ہیں ـــ ان تمام مصائب کے باوجود
اللہ کے فضل و احسان کا شکر گذار ہوں،
کیونکہ اپنی آنکھوں سے دوسرے
قیدیوں کو بیمار ہوتے ہوئے بھی، بیڑیاں
پہنے ہوئے زنجیروں میں کھینچے جاتی ہوئی

محظوراً وعذاب يوم الدين
فيه محذوراً لم يرتفع من
حين دهمنا ما ساءنا معسوراً
وكان النجاء مما أتى عسيراً
هذا وقد ابتليت فيه
بأمراض عديدة وأمراض
متزايدة وقد عيل بها
صبري وضاق بها صدري
والتحق بداري وهان قدري
كيف الخلاص والمناص
عما تعالى وأعتاص لا أدري
وبليت مع ما أقاسي من الكرب
بشدة الغوغاء والحرب
أعلاه وأروح وجسماني كله
مصاب لقروح تربو على
كلوم وجروح مع ما لي من
أوجاع تقلق الروح يكاد

نہ ہوتی تو کوئی بھی یہاں معبد و معمور ساکم
تکلیف مالا یطاق نہ دیا جا سکتا، اور
معصیت سے نجات پا لینا بڑا آسان
ہوتا۔
یہ ناقابل برداشت حالات تھے ہی کہ
میں متعدد سخت امراض میں مبتلا ہو گیا
جس کی وجہ سے میرا صبر مغلوب، میرا
سینہ تنگ، میرا چاند دھندلا، اور
میری عزت ذلت سے بدل گئی، میں
نہیں جانتا کہ اس دشوار و سخت رنج
و غم سے کیونکر چھٹکارا ہو سکے گا، علاوہ
و تو انا ہیں ابتلا، اس پر مستزاد ہے،
صبح و شام اس طرح بسر ہوتی ہے
کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی
ہو چکا ہے، روح کو تحلیل کر دینے
والے درد و تکلیف کے ساتھ زخموں
میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ویسقی المریض ما یصیر بہ
حرضا، واذا مات فیہا احد
من الناس جوّر جلہ احد
من الانجاس الادناس،
ھو کنّاس کانہ شیطان خنّاس
او نسناس، فیواریہ بعد
نزع ما لہ من اللباس، فی
کثیب من رمل بلا تکفین و
غسل، فلا یحفر لہ لحد ولا
یصلّی علیہ احد۔

ھذا ولولا للمیّت فیہ
ھذہ الحالۃ الدنیّۃ لکانت
فیہ المنیّۃ ھی الامنیۃ،
وکان فجاءۃ الاجل ھی
الامل الاجل، وکان
المنا اقصی المنی، ولو لم
یکن قتل المرء نفسہ فی الدین

کے قریب پہنچا دیتا ہے، جب کوئی
ان میں سے مر جاتا ہے۔ تو نجس ناپاک
خاکروب جو درحقیقت شیطان خناس
یا دیو ہوتا ہے۔ اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا
ہوا، غسل وکفن کے بغیر اس کے
کپڑے اتار کر ریگ کے تودے
میں دبا دیتا ہے، نہ اس کی قبر کھودی
جاتی ہے۔ نہ نماز جنازہ پڑھی
جاتی ہے۔

یہ کیسی عبرتناک والم انگیز کہانی ہے
یہ واقعہ ہے کہ اگر میّت کے ساتھ یہ برتاؤ
نہ ہوتا تو اس جزیرہ میں مر جانا سب سے
بڑی آرزو ہوتی، اور اچانک موت سب سے
زیادہ تسلی بخش تھی، اور اگر مسلمان کی
خودکشی مذہب میں ممنوع، اور قیامت
کے دن عذاب وعقاب کا باعث

من یداوی فیہ یداوى ومن
یداوى فیہ یؤدى ومن آسى
أساہ مودى الأسى ومن
آسى لا یوسى علیہ ولا یواسى،
وما من کرب فی الدنیا
یقاس على کرب ھنا یقاسى،
ما فیہ سقام الا وھو داء
عقام فالحمى فیہ مطیة الحمام
وعموم علة السرسام والبرسام
علة تامة للسام، وکم
فیہ من مرض وسقم لا یوجد
مسماہ واسمہ من کتب
الطب فی رقم والساعور
یسعر حشا المرضى کالساعور
والطبیب لا یحمی المریض
ولکن یحمی علیہ قبة الوطیس
وھو لا یعرف مرضا،

معالج، مرض میں اضافہ کرنے والا اور
معالَج ہلاک ہونے والا طبیب تکلیف
رنج بڑھانے والا تھا رنجیدہ کی نہ
غمخواری ہی کی جاتی نہ اس پر رنج و
افسوس کا ہی اظہار ہوتا، دنیا کی کوئی
مصیبت یہاں کی المناک مصیبتوں پر
قیاس نہیں کی جاسکتی یہاں کی معمولی
بیماری بھی خطرناک ہے، بخار موت کا
پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ
کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام
ہے بہت مرض ایسے ہیں جن کا کتب
طب میں نام و نشاں نہیں، نصرانی ماہر
طبیب، مریضوں کی آنتوں کو تنور کی
طرح جلاتا اور مریض کی حفاظت
نہ کرتے ہوئے آگ کا قبہ اس کے
اوپر بناتا ہے مرض نہ پہچانتے
ہوئے دوا پلا کر موت کے منہ

أمرّ من طعوم العلاقم،
وماءه أضرّ من سموم
الأراقم، سماءه غمام يمطر الغموم
وسحابه الهموم يفيض الهموم
وأرضه كالمجدّر في الحصبة
حصباء، وريحه من النكبة
نكباء، كل بيت فيه من الحشاش
والقصب، مملوّ من الوصب
والنصب، لا يزال سقفه
يكف، قطرة كدمع عيني
لا تقف، لا يزال تتعفّن
فيه الهواء، فجمّت فيه الأدواء،
وهان الدويّ، وعزّ الدواء،
وشاعت فيه الأوباء، وعم
فيه الجرب والقوباء، ما فيه
التئام لكليم ولا سلامة
لسليم، ولا علاج لسقيم،

کڑوی، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے
بڑھ کر ضرر رساں، اس کا آسمان غموں
کی بارش کرنے والا، اس کا بادل رنج و
غم برسانے والا، اس کی زمین آبلہ دار،
اس کے سنگریزے بدن کی پھنسیاں، اور
اس کی ہوا ذلت وخواری کی وجہ سے ٹیڑھی
چلنے والی تھی، ہر کوٹھری پر چھپر تھا جس میں
رنج و مرض بھرا ہوا تھا، میری آنکھوں کی
طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں، ہوا
بدبودار اور بیماریوں کا مخزن تھی،
مرض سستا اور دوا گراں، بیماریاں
بے شمار، خارش و قوبا (وہ مرض جس
سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی
ہے) عام تھی، بیمار کے علاج، تندرست
کے بقاء صحت، اور زخم کے اندمال
کی کوئی صورت نہ تھی۔

ولم يتركوا عندي ابريقا
ولا قدحا ولا آنية، واطعموني
صبّارًا وسقوني مياهًا آسنة،
تعوّضت من حميم دانٍ بحميم
آنٍ وبليت مع ما بي من
كرب وتوانٍ بصغار وهوان
في كل آن،

ثم قدت في شط الخصم الكالح
الى شط الخصم المالح الى جبل
مستوبل راس اسمه ارس
لا يزال الشمس فيه على
سمت الراس، فيه شعاب
صعاب، وعقاب فيها عقابيل
وبحار تتساقط امواجها من
عن لجي ماءه اجاج، نسيمه
احرّ من السموم، ونعيمه
اضرّ من السموم، عداوة

پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہ
چھوڑا اسکل سوماتھ کی دال کھلائی۔
اور گرم پانی پلایا، مہمان مخلص کی آب
محبت کے بجائے گرم پانی اور ناتوانی
و کمزوری کے باوجود ذلت و رسوائی سے
ہر وقت سامنا رہا۔

پھر ترشرو دشمن کے ظلم سے مجھے دریائے
شور کے کنارے ایک بلند و مضبوط،
ناموافق آب و ہوا والے پہاڑ پر بھیج دیا
جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا تھا
اس میں دشوار گذار گھاٹیاں اور اس کی کٹھنیاں
حصص دریائے شور کی موجیں ٹکرا جاتی
تھیں اس کی نسیم صبح بھی گرم و تیز ہوا
سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت
زہر ہلاہل سے زیادہ مضر تھی۔
اس کی عدا حنظل سے زیادہ

جلّ امن شد البلاء، فقد
شارك النصارى ذلك الرئيس
في ما استحقوا من الاجر في
ابتلائهم عباد الله بكل
عذاب بئيس،

هذا ولما ابتلاني النصارى
بالحبس، بما اختلقوا من
الخداع واللبس، نقلوني من
سجن الى سجن، ومن حزن
الى حزن، وزادوني شجنا
على شجن، وحزنا على حزن،
وسلبوني النعال واللباس
ولبسوا عليّ كسي الكساء
والكرباس، واخذوا مني
فراشا لينا حسنا، ومهدوا
لي وطاء مولما خشنا،
كانه شوك قتاد اوجمر قتاد

اس طرح وہ بدنصیب رئیس بھی نصاریٰ
کے ساتھ اللہ کی مخلوق کو سخت عذاب
میں مبتلا کرنے کی وجہ سے اجر و انعام
کا مستحق بن گیا۔

یہ المناک کہانی یوں ختم ہوئی اب
میرا ماجرا سنئے، مکر و تلبیس سے نصاریٰ
نے جب مجھے قید کرلیا تو ایک قید خانے
سے دوسرے قید خانے اور ایک سخت
زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل
کرنا شروع کیا، مصیبت پر مصیبت
اور غم پر غم پہنچایا، میرا جوتا اور لباس
تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیے
نرم و بہتر بستر چھین کر، خراب سخت
اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کردیا۔ گویا
اس پر کانٹے بچھا دیے گئے تھے یا دہکتی
ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں میرے

من فسيح قطر فيه بلاد وقرى
وقصبات هي مواطن لاكثر
سال وحضر
وقد ارسل اليهم رئيس
يدعى الاسلام والايمان
جموعا اووالى دار رياسته
بالاستيمان فامرهم وقسرهم
بعد ما وعدهم بالايمان
بعذارهم ارضاء النصارى
بما هو محظور في جميع الاديان
ولم يحتفل لاسترضاء النصارى
سخط العزيز المنتقم الديان
فقيد النصارى اولئك
المرهلين معلولين مسلسلين
فعالوا كثيرا من البلاء و
عذبوا جمعا جما من هؤلاء
بالقيود والجلاء وما يشق

وسیع علاقے میں جہاں شریف و عظیم
خاندانوں کے شہر کے شہر گاؤں کے گاؤں
اور قصبے کے قصبے آباد ہیں،
ان شرفاء و عظماء کے پاس ایک رئیس
نے جو اسلام و ایمان کا مدعی بھی تھا،
دار الریاستہ میں طلبی کے ساتھ امن و اماں
کا پیغام بھیجا، وہاں پہنچنے پر اپنے وعدے
سے پھر کر نصاریٰ کی خوشنودی کی خاطر
غداری کر کے ان سب کو گرفتار کر لیا،
بدعہدی سارے مذاہب میں مذموم و
ممنوع ہے اس کا بھی لحاظ نہ کیا یہ بدبخت
نصاریٰ کی رضا جوئی میں خدائے عزیز و
منتقم کے غصہ سے بھی نہ ڈرا، نصاریٰ نے
ان سب کو ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر
محبوس کر دیا۔ اکثر شرفاء کو قتل
اور باقی کو قید، جلا وطنی اور طرح
طرح کے عذاب میں مبتلا کیا،

كانت لاهلي وعيالي، وهم لم
يخصّوني بهذا الغدر الفظيع،
بل عاملوا خلقا كثيرا بما هو
افظع من هذا الصنع الشنيع
فهم نكثوا موثقهم كل نكث،
واغتالوا كثيرا من الخلق
بالضرب والخنق واخذوا
كثيرا منهم بالابتلاء
بالاسر والجلاء، بلا تأنّ
ومكث، واخلفوا كل وعد
كلّ اخلاف، واتلفوا النفوس
والنفائس ايّ اتلاف،
فقد جاوز العدّ دماء
مطلولة لاتحصى بمئات
والآلاف، وتعدّى الحدّ رقاب
مغلولة من اشراف واجلاف
ميّنا فيما بين دهلي وبين ديارنا

مکان، غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کر لیا
اس شرمناک رویّہ کا تنہا میں ہی شکار
نہ بنا تھا بلکہ بہت سی مخلوق سے اس
سے بڑھ چڑھ کر ناروا سلوک روا رکھا
گیا، انھوں نے عہد و پیمان توڑ کر ہزاروں
مخلوقِ خدا کو پھانسی، قتل جلا وطنی
اور قید و حبس میں بلا تاخیر مبتلا کر دیا
وعدہ خلافی کر کے بیشمار نفسوں اور
لاتعداد نفیس چیزوں کو تباہ
کر ڈالا۔

اس طرح خونِ ناحق شمار سے آگے
بڑھ گیا، سینکڑوں اور ہزاروں سے
گنتی نہیں ہو سکتی، اسی طرح شریف و
غیر شریف قیدیوں کی تعداد حد سے متجاوز
ہے، خصوصًا دہلی اور ہمارے دیار کے مابین

فبعد ايام دعاني من مكاني،
عامل نصراني بحبسي وعناني،
وحربي وعنّاني، ثم ارسلني
مأسورا الى قاعدة الملك،
التي صارت دار الهلك،
وفوّض امري الى حاكم متحكّم،
ظالم لا يرقّ لمتظلّم، ووشى
عليّ عداة من تلدّان استدلّا
اللذان جادلاني في آية من
آي القرآن، محكمة حكمت بأن
من يتولّى النصارى نصراني
وهما على توليهم يُصرّان، فارتدّا
واستبدلا الكفر بالايمان،
فقضى عليّ بطول حبسي و
تغريبي وجلائي وتعريبي،
وغصب كل مالي من كتبي و
نشبي ومالي وغصب داري

تھوڑے دن کے بعد ایک حاکم نصرانی نے
مجھے مکان سے بلا کر قید کر دیا اور رنج و غم
میں مبتلا و متغیر کر کے دارالسلطنت لکھنو
جو دراصل اک محلۂ ہلاکت تھا بھیج دیا، میرا
معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا جو
مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا اور میری
چغلی ایسے دو مرتد، جھگڑالو، تند خو افراد
نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت
میں مجادلہ کرتے تھے جس کا حکم یہ تھا کہ
نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے
وہ دونوں نصاریٰ کی مودّت و محبت پر
مصر تھے انھوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان
سے بدل لیا تھا۔

اس ظالم حاکم نے میری جلا وطنی اور
عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا اور میری
کتابیں، جائداد، مال و متاع
اور اہل و عیال کے رہنے کا

کلّ بلا منازع واستراحوا	بلا مزاحمت قابض ہو گئے - میدان
من المعارك والملاحم والولیة	کارزار اور لڑائیوں سے نجات پا گئے،
بعد ہذا الخبال والوبالٔ	بیگم اس تباہی و بربادی کے بعد، بچے
آوت مع قلیل من الرجالٔ	کھچے تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ
الی قُلَلِ الجبال،	پہاڑوں[۱] کی چوٹیوں پر چلی گئی -
واذ کنتُ قد طال اغترابی	میں مسافرت و غربت، اضطراب و
واکتیابی واضطرابی، واشتدّ	مصیبت کی زندگی گذار رہا تھا اور میرا
ارتقابی فی ایابی الی داری	اشتیاق و رغبت، اپنے گھر، اہل و عیال،
واہلی وجیرتی واحبابی، و	پڑوسی، اور احباب تک پہنچنے کے لئے
رأیت موثق الایمان، موثقا	بڑھ رہا تھا، کہ امن و امان کا وہی پروانہ
بالایمان، رجعت الی اہلی و	جسے قسموں سے مؤکد کیا گیا تھا نظر پڑا،
وطنی، وداری وسکنی،	اس پر بھروسہ کرکے اپنے اہل و وطن میں
مطمئنّا بموثق الایمان،	پہنچ گیا مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ
غافلا عن انّہ لا ایمان لمن	بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسہ اور بے دین
لیس لہ ایمان، وانہ یمین	کی قسم و یمین پر اعتماد کسی حالت میں درست
بعد الیمین، من لا یتدیّن	نہیں خصوصًا جبکہ وہ بے دین جزا و سزائے
بدین، ولا یخاف یوم الدین،	آخرت کا قائل بھی نہ ہو۔

فضاقت عليهم الارض بما
رحبت وضاقت عليهم
انفسهم في حسك شديدا
وضيق مديدا، وكان كل منهم
صفر الكف والراحة، فقد
العافية والراحة، مقسم
البال بالبلبال، لنائي الاهل
والعيال، فارتد كثير منهم
الى النصارى واتباعهم،
واختاروا الانقياد لطاعتهم
واتباعهم، فسلبهم النصارى
ما كان لهم من الاحلس
والسلمان، واعطوهم
خطوط الامان فرجعوا الى
الاهل والاوطان آئبين
خائبين مع الخسران والحرمان،
فتسلط النصارى على الملك

ہوگیا تھا، زمین کشادگی کے باوجود
ان پر تنگ ہوچکی تھی، وہ بڑی سخت
مصیبت وتنگی میں پڑ گئے تھے۔ وہ
سب تنگدست، اور عیش وراحت
سے دور تھے، ان کے دل اہل وعیال
کی جدائی سے پارہ پارہ تھے،

ایسے حالات میں مجبور ومضطر ہوکر
بہت سے لشکری بھی نصاریٰ کے اطاعت
گذار بن گئے، ان کے پاس ہتھیار، گھوڑے
جو کچھ تھا چھین لیا گیا اور پروانۂ امان
دیدیا گیا۔ اب وہ اہل وطن کی طرف
خائب وخاسر ہوکر لوٹے۔

پھر تو نصاریٰ سارے ملک پر

والنصاریٰ الاولی جاروا مضطرین للاستیمان، فاغتالوهم بالعداوة و العدوان، والذین قاموا للملك والریاسة والسلطان، والذین کانوا یحثون الناس علی الاعتداء والطغیان،

پناہ لی تھی، ظلم و عداوت سے قتل کر ڈالا۔

یا وہ جنھوں نے سلطنت و ریاست قایم کی۔ یا وہ جنھوں نے سرکشی و عدوان پر لوگوں کو ابھارا، ادھر وہ

وقد کانت الجیوش المنحرفة وغیرهم ممن رافقوا ووافقوا الوالدة واجتمعوا لدیها، لعوز المعائش اذ قدرت ارزاقهم وفترت اقواتهم وعدم ما کانوا یعطون مشاهرة اومیا ومنذ لفقد خراج کان یجبی الیها،

"باغی" لشکر اور دوسرے بیگم کے ساتھی، روزی کے نہ ہونے اور تنخواہ و ضروریات زندگی میسر نہ آنے سے پریشان ہو چکے تھے۔

لانتشار جنود النصاریٰ فی اقطار الملك وتسلطهم علیها

نصاریٰ کے مسلط و منتشر ہو جانے کی وجہ سے بیگم کے پاس خراج اور محاصل کا آنا بند

ما حل به اهتماماً، همّ همّهم
من في ذلك القطر من
مخالفيهم فاهتمّوا اهتماماً
ما استطاعوا معه مسالك
قياماً، وأهمّوا قبل لكافة
أهم أماً، ومع ذلك كادت
مملكة النصارى كيداً أقل
ازدادوا به قوة وأيداً، و
ذلك أنها قد شهرت بارسال
طا ـــ مطبوعة
في كل من الأقطار والقرى
والأمصار، فاشتهر غاية
الاشتهار، أنها قد عفت
عن الجموع التي اجترؤوا،
والرعايا الذين ارتكبوا
العصيان وافتروا الا
الذين قتلوا النسوان والصبيان

فکر میں مبتلا ہو جاتے اور لڑے
بھڑے بغیر شکست مان لیتے،

ان تمام تمہیدوں کے بعد بھی ملکۂ
نصاریٰ (وکٹوریہ) مکر سے باز رہی
اس مکر کی وجہ سے انہیں بڑی
قوت و طاقت حاصل ہوگئی، اس
نے تمام دیہات، شہروں، اور قصبوں
میں مطبوعہ حکمنامے جاری کئے
جن میں عام معافی کا اعلان کیا۔
کہ تمام "باغی" لشکر اور سرکش و
نافرمان رعایا کو، ان لوگوں کو
چھوڑ کر معاف کیا جاتا ہے جنہوں
نے عورتوں، بچوں اور اہل
نصاریٰ کو جنہوں نے مجبور ہو کر

مغوارين، قاتلا النصارى اشد قتال، فقتلوا كثيرا من جنودهم من خيل ورجال بشدة حماستهما وشجاعتهما مع قلة بضاعتهما وجماعتهما ثم استخلصا منهم بتصلبهما، فلم يهم النصارى بتعقبهما، فصفت لهم تلك الناحية والقت الرعب فی قلوب مخالفيهم تلك الواقعة الهائلة وكانت من ادهى الخطوب، الباعثة للكروب، وكانت تلك الهيجاء كانها خاتمة الوقائع والحروب، فبعد ما غلب فيها النصارى وانتصروا انفسحوا فی النواحی الاخر وانتشروا، فكلما هموا بدخول قطر واهتموا

اپنی بے پناہ شجاعت وبسالت سے قلت اسباب وجماعت کے با وجود دشمن کے ہزاروں سوار، پیادے ٹھکانے لگا دئے۔ آخر کار مجبور ہو کر اپنی بہادری سے جان بچا کر نکل گئے اور دشمن ان کا تعاقب نہ کر سکا اب وہ نواح بھی صاف ہو گیا۔ ان دونوں سرداروں کی شکست کے بعد، مخالفوں کے دل میں دشمن کا رعب قایم ہو گیا۔

یہ واقعہ رنجدہ واقعات میں سے سب سے اہم اور آخری واقعہ اور اس جنگ کا خاتمہ تھا۔ نصاریٰ یہاں غالب ہونے کے بعد دوسرے اطراف میں پھیلنا شروع ہوئے وہ جب کسی طرف کا قصد کرتے تو وہاں کے رہنے والے غم و

وبعد استشهاد ذلك الثائر
الكرّار، وهؤلاء الأحرار،
ولّى من وراءهم الأدبار
للفرار، وفرّوا فرار الحمر
يلتفتوا فيما إلى ما خلفهم وما
وراءهم لعلة العقل و
الاضطرار، وتعقبهم جنود
النصارى فعاقبوهم بالإثخان
والتقتيل، فما نجا منهم إلا قليل،
حتى واعدوا الفرار في الإسراع
والتعجيل، ومع ذلك الهوان،
وكان كل من كان
في تلك المساجد من الأعيان
والأركان، وغيرهم من الرعايا
والدهاقين والسكان،
لمعتقد النصارى ما عدا ا
امين استسلمين معاين

ان سب ابرار و احرار کی شہادت کے
بعد بزدل لوگ ایسے بھاگے کہ نامردگی
اور اضطرار سے پیچھے مڑکر بھی نہ دیکھا
نصاریٰ نے تعاقب کرکے ان سب کو
پکڑ پکڑ کر قتل کر ڈالا، تھوڑے سے وہ
بچ رہے جنھوں نے بھاگنے میں
پوری تیزی اور عجلت سے کام
لیا۔

اس نواح کے سارے باشندے
دہقانی، کاشتکار، کھیا اور معدم
وغیرہم سب مطیع و فرمانبردار بن گئے
السر دو بہا ور غیر ممد، اور
غارتگر جوانمردوں نے جو جمکر
معاملہ کیا۔

مع عدۃ من الفتیان، علی عسکر النصاریٰ، منحلا عمایا ملا ذلک الکافر الدہقان،	زبانِ تدار عامل نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔
فرمی عسکر النصاری بالبنادق والمجانق من امامہم وجوہہم وصدورہم، ورمت جماعۃ ذلک الدہقان الکفار المکار الغدار من خلفہم ادبارہم وظہورہم،	نتیجہ یہ ہوا کہ سامنے سے تو بندوقوں اور توپوں سے، چہروں اور سینوں پر نصاریٰ نے گولیاں برسائیں اور پیچھے سے اس غدار مکار زمیندار کی جماعت نے پشت و سرین کو پھوڑنا شروع کیا۔
وکانت تلک الجماعۃ فی الحقیقۃ انصار النصاریٰ و اعوانہم، واتباع الشیاطین و اخوانہم،	وہ دراصل نصاریٰ کے انصار و اعوان اور شیاطین کے اتباع و اخوان تھے۔
فاستشہد ذلک العامل الکامل فخر فی المعرکۃ شہیدا صریعا، واستشہد کل من معہ عند الصیال والقتال استشہادا سریعا،	وہ خدا پرست عامل معرکہ میں گر کر شہید ہوا اور اس کی ساری جماعت نے بھی اسی کے نقشِ قدم پر چلکر جامِ شہادت نوش کیا۔

تلك الدار مسعد حبسته	لیے یہ محصور ہوئے اور عطماء
وکتبوا الطلب کبیتد مدوهم	نصاریٰ کے پاس شہر میں پیغام
الی عطماء النصاری کانوا	بھیجکر مدد مانگی انھوں نے
فی المدینة، فارسلوا الامداد هم	ایک لشکر اور منافقین دو ہانیں
کبیتد من مبالقهم، و	کا حکم عمیر خصوں نے عہد شکنی
معهاجته عمیر من الذین قد نقض	کی تھی ان محصورین کی مدد کو بھیجدیا
والمنافقین الذین نکثوا	
الایمان وکفروا بعد الایمان	
سقض مواثقهم، وقد خادع	ادھر اس بیک سرست بہادر عامل
نعص الکفار من الذین هاتیر	سے ایک دیہاتی کافر زمیندار نے بڑا
الکفار، ذلك العامل النار	داؤ کھیلا اس نے قسمیں کھاکر اطمینان
الکرار، بمکر کثار، واتقد	دلایا کہ جب دونوں جماعتیں مقابلہ
بتاکید الایمان بامدید	ہر آجائیں گی تو چار ہزار بہادروں کا
اذا التقی الجمعان، باربعة	گروہ لے کر مدد کو بھیجوں گا،
الاف الطال الشجعان،	جب مقابلہ کی نوبت آئی تو اس
فلما ترائی الفئتان، صال	زمیندار کی قسموں پر بھروسہ کرکے اس
ذلك العامل المتلمس لکامل	

[1] مدونگر امرپورائیں ضلع سہارنپور،

والكفران، بترك كفران الايمان والارتداد عن الايمان، كفرانا وكفرا،

اور ارتداد میں زیادتی کرلی۔

فانتهض لمحاربة النصارى المتسلطين على تلك الناحية عامل ناحية اخرى، قد ادخر من الحسنات والخيرات والسعادات والمبرات، ذخرا، كان برا نقيا صفيا نقيا، شجاعا كميا، لرسول الملاحم نبي المراحم صلى الله عليه وآله وسلم سميا، فاغار على النصارى وجندهم، فهزمهم في اول سطوة

اس موقعہ پر متسلط نصاریٰ سے قتال کے لئے دوسری طرف کا ایک عامل اُٹھ کھڑا ہوا، اس نے خیرات، مبرات اور سعادات وحسنات کا کافی ذخیرہ اپنے اندر جمع کرلیا تھا۔ وہ بڑا ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر، اور رسول ملاحم اور نبی مراحم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمنام تھا۔ اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کرکے پہلے ہی حملہ میں شکست دیدی۔

ففروا بعد بذل جهدهم وتحصنوا مع عصبة في دار هندكي في القصبة كانت

اپنی ساری کوششیں ختم کرکے وہ بھاگ گئے اور قصبہ کے ایک ہندو کے مضبوط و محفوظ مکان میں پناہ

على اعدائهم معينون، وكان
فيها من قبل الوالية العلية
عامل حازم لم يكن غدارًا
ولا محبًا بأولاد ملترا، تولّى
هم البلد وتولّى دهوم الامر
لهم من برا، وهرب بلا
مقابلة ومقاتلة هي بنا،
واتخذ سبيله سربًا لقلة
الخيل والرجل لديه، و
عدوان الله ما قيل و
الكفار عليه، وقد كانوا الفوه
على انهم وافقوه، ثم حالفوه
بعد ما حالفوه، وغدروا
غدرًا، ومكروا مكرًا نكرًا،
وكم من نعمة كانوا بها فرحين
ونعمة كانوا فيها فاكهين
دهرًا، وارتدوا الى الكفر

دشمنوں یہاں کے معاون تھے وہاں
بھی ملک کی طرف سے، ناعاقبت
اندیش غیر مدبر، ناتجربہ کار اور ذلیل
عامل تھا، وہ بھی پیٹھ پھیر کر معاملہ
کئے بغیر بری طرح بھاگا، سرنگ میں
ہو کر اپنا راستہ بنایا، اس کے
پاس سوار اور پیادے بھی کم تھے
اس پر ستم یہ ہوا کہ کفار اور دیہاتیوں
نے معاہدہ و قسم کے باوجود وقت
پر دغا کی غدر و مکر کی انتہا
کر دی۔

ثار نعمت اور پر عیش و مسرت
زندگی کا کفران کیا، معاہدوں
سے انکار کر کے کفر میں اضافہ

فاستولى النصارى على قرية كان فيها ذلك الجبان الخوان للرصد اذ وجدوها خالية، على عروشها خاوية فجعلوا تلك القرية حصنا حصينا، وحصارا منيعا رصينا، وجمعوا عددا، ولبثوا فيها مددا، لا يبعدون ميلا، كانهم ينتظرون ما املوا من قواد الجيوش تاميلا، ويرتقبون ما وعدهم اولئك الخوان فيؤجلون الى انجاز الوعد تاجيلا، ثم انهم خرجوا الى جانب الغرب من البلد الى ناحية جل دهاقينها وسكانها لهم يدينون، ولهم

نصاریٰ نے جب اس گاؤں کو جس میں وہ نامرد خائن عامل نگہداشت کیلئے موجود تھا، خالی اور ویران پایا تو اس پر قبضہ جما کر اپنا مضبوط و محفوظ قلعہ بنا لیا۔

وہیں فوج جمع کرلی اور مدت تک وہیں مقیم رہی وہ ایک میل بھی نکلکر نہ گئے۔ وہ سرداران لشکر کی امیدوں کی تکمیل، اور ان خائنوں کے ایفاء عہود کے منتظر تھے۔ اسی لئے اپنے ایفاء وعدہ میں بھی تاخیر کر رہے تھے۔

ادھر سے فارغ ہوکر انھوں نے اس مغربی گوشے کا رخ کیا جہاں کے تمام باشندے ان کے مطیع ہوچکے تھے اور . . . .

حین ورد حال مع قائد کبیر من الخیل والرجال فهرب ذلک القائد الرذیل مع من معه من ذلک القبیل اذ سمع من لقائهم حذراً قبل ان یری لاحد منهم اثراً وثبت هنالک للقتال جمع قلیل من الهنادک الابطال مع ارکون ولکن کان من شجعان الابطال ولم یکن علی ذلک العشرة زائداً علی المائة فقاتلوا وقتلوا وقتلوا ولم یبق منهم احد لحمیتهم عار الفرار وفقد الامداد من قبل القائد الفرار مع کثرة من کان معه من العدد وما کان معه من العدد	اور جس میں سوار، پیادے، اور وہ رذیل و ذلیل قائد عظیم بھی تھا تو وہ کمین قائد ان کی آمد کی خبر سن کر ہی اپنے ذلیل سرداروں کے ساتھ بھاگ گیا، بہادر ہندوؤں کی تھوڑی سی تعداد اپنے گاؤں کے بہادر مکھیا کے ساتھ مقابلہ پر ڈٹ گئی یہ سو سے زیادہ سے تھے دشمنوں کو فنا کے گھاٹ اتار کر خود بھی کٹ گئے۔ وہ فرار کی عار برداشت نہیں کر سکتے تھے اور بھگوڑے قائد کی طرف سے کافی لشکر اور ساز و سامان کے ہوتے ہوئے بھی انہیں کوئی مدد نہیں بھیج سکی تھی۔

على دار الملك لبثوا فيها، ولم يخرجوا الى ارجائها ونواحيها وطفقوا يؤلفون كفار الاحناء وارا كينها، وحراث القرى ودهاقينها، بالصفح والعفو عن المعاصى والجنايات، والتخفيف فى الخراج، والتطفيف فى الجبايات،

فلمّا دانوا لهم دانوهم اعضادا، وكانوا لهم فكانوا لهم اعضادا، فبرز النصارى الى نواحى الملك واقطاره، ليستولوا على قراه وامصاره،

فلمّا عمدوا الى مرصد[1] كان من دار الملك فى جهة الشمال[1] على ثمانية[2] اميال، وفيه

لہ فى نسختنا بدل الشمال "الشرق"

لہ فى نسختنا عشرة اميال ۱۲۔

کے بعد وہیں ڈٹے رہے اطراف و جوانب کی طرف نہ نکلے۔ انھوں نے گرد و نواح کے کافروں، دیہاتیوں، اور کاشتکاروں کی تالیفِ قلب شروع کردی، ان کی خطاؤں کو درگزر، ان کے خراج میں تخفیف، اور تاوانوں میں کمی کی۔

اس مہربانی پر وہ مطیع و فرمانبردار اور معاون و مددگار بن گئے۔ اودھر سے مطمئن ہوکر اطرافِ ملک میں شہر و دیہات پر قبضہ کرنے کے لئے نصاریٰ نکل کھڑے ہوئے۔

جب نصاریٰ اس مرصد[1] کی طرف متوجہ ہوئے جو دارالسلطنت سے جانب شمال آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔

لہ نواب گنج ضلع بارہ بنکی ۱۲ س

فأمر دلك الامر على تلك
الجيوش سفلاً حساء انذالا
وسفلا مثلا ارذالا،
يطعمون ويطعمون ما ادرّ
للجيوش لاقواتهم ويجتانون
لما في صدورهم من غل
يغلّون ويغلون من غلاهم
يحسبون كل صيحة عليهم
هم العدو، فلا يزالون
من الفرق في القلق بالهم
قلة ولا ملاد، ويظنون
غاية الوحل كل صيحة مقدمة
الاجل، ويخالون كل صوت
داعي موت، ولعلهم يلقون
الى العداة للشام بالمودة
واللؤام والالتيام،
والنصارى بعد استيلائهم

چنانچہ اس ناتجربہ کار نے ان لشکروں
پر کمین، ذلیل، بزدل اور رذیل لوگوں
کو سردار بنا دیا وہ بڑے ہی لالچی تھے۔
جو کچھ لشکریوں کو خوراک وغیرہ
دی جاتی کھا جاتے وہ بددیانت تھے
اپنی کینہ پروری کی وجہ سے ان کے غلّہ
اور جنس میں خیانت کرتے اور گراں
فروشی کے مرتکب ہوتے، ہر آواز کو
دشمن کی آواز سمجھتے ہمیشہ اضطراب
کے ساتھ خوف کی وجہ سے لرزتے رہتے
کسی وقت بھی ان کو راحت و سکون میسر
نہ تھا، بزدلی سے ہر آواز کو موت کا پیش خیمہ
اور ہر صدا کو موت کی پکار سمجھتے تھے،
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمینے دشمنوں کے
سامنے محبت و صاحت کے ساتھ پیش
کئے جا رہے ہیں۔
نصاری دار السلطنت پر قبضہ کرنے

یقاوقوھم ویزاحموھم عند انتقاصھم من حوالیھا لکنھا فوضت الامر کلہ عقدہ وحلہ دقہ وجلہ الی عامل خامل، ذاھل داھل لم یکن للامر اھلا، لا یستشیر ویأتمر جہلا، یستصعب کل سھل ویحسب کل صعب سھلا، وکان وغدا ارھدنا رُھدونا، لا یستخلص للمعاشرۃ والمشاورۃ والمجاورۃ والمحاورۃ الا سفلۃ جُھلا دُونا، یتجنب النبلاء الدھاۃ والعقلاء الھداۃ بنخوتہ، ولا یستصحب ولا یؤمّر ولا یستعمل الا السفلۃ الجھلۃ من عشیرتہ واخوتہ،

مقاتلہ، مزاحمت و مجادلہ کیا جائے۔

لیکن یہ تمام امور مہمّہ اوران کا اہتمام وانصرام ایسے ذلیل، غافل اور متحیر عامل[1] کو سونپا گیا تھا جو کسی طرح اس کا اہل نہ تھا۔ وہ صحیح مشورہ سے گریزاں اور جہل سے ہمکنار تھا، آسان بات کو سخت اور دشوار کو آسان سمجھتا، وہ ذلیل احمق، اور بزدل تھا۔ اس نے مکالمت اور مشاورت، مجالست، اور منادمت کے لئے احمق، جاہل، اور ذلیل طبقہ کو چن رکھا تھا۔ وہ نخوت و غرور کی بنا پر شریف سرداروں اور عقلمند رہنماؤں سے بچتا، اور اپنے ہی اہل خاندان اور اعزّہ میں سے جاہلوں اور احمقوں کو مصاحب و حاکم بناتا۔

[1] نواب احمد علی خاں عرف ممّو خاں ۱۲

اعتربوا، عبرت معهم من البحار والانهار اللاتى لا يجسر مهابتها الملك، واقامت مع من شايعها فى قرية على شاطئ بحر فى شمال الملك، واخذت اذ اقامت بها فرسانا ورجالا على المعابر ليقصوا على السفائن ويصدوا عن العبور اهل الضغائن، وارسلت عمالا لاخذ الخراج واصلاح الرعايا فى القرى والمدائن، وجهزت جيوشا وبعثتها ليقيموا بمراصد قريبة من دار ملكها التى استولى النصارى عليها، ليقاوموهم ويلاحموهم و

ایسے دریاؤں اور نہروں سے گذری جن سے بغیر کشتی کے عبور مشکل و دشوار تھا،

وہ شمالی ملک میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اقامت گزیں ہوگئی، اور دریا کے گھاٹوں پر سوار، پیادے بٹھا دیئے کہ تمام کشتیوں پر قبضہ کرلیں اور دشمنوں کو دریا، عبور نہ کرنے دیں۔

اس نے انتظام رعایا اور حصول خراج کے لئے شہروں اور قصبات و دیہات میں عامل بھیجے، لشکروں کو آراستہ کرکے اپنے اس دارالسلطنت کے قریبی مورچوں پر جس پر اب نصاریٰ کا قبضہ ہوچکا تھا، بھیجا، تاکہ اگر دشمن ادھر کا قصد کرے تو اس سے ڈٹ کر مقابلہ

واقئدتهم هواء، لا تطيب
لهم هوى وهواء، فالعيش
والموت عندهم سواء، كانوا
في سرور وسرير، واستبرق
وحرير، وفواكه وفكاهة،
ورفاهة ونزاهة، ونعمة
ونَعمة، وغنى وغِناء، ونغمة
وسرّاء وسرّاء ودولة وثراء
اليوم وطاءهم قتاد، ما لهم
زاد وعتاد، وثيابهم اخلاق،
وما لهم من الراحة خلاق،
عافاهم الله برحمته، واخذ
الظالمين ببطشه ونِقمته،
ثم ان الوالية اي الحضرة
العالية، لما آوى اليها
جموع من الجيوش الاولى
هربوا، وكثيرًا من الذين

ان کے دل خالی تھے ان میں نہ کوئی خواہش
تھی نہ انھیں کوئی بات بھاتی تھی، زندگی
اور موت ان کے لئے دونوں برابر تھے
وہ مسرت وشادمانی، تخت شاہی،
دیباج وحریر، میوے، خوش طبعی، عیش و
عشرت، نظافت ونزاہت، نزاکت و
نعمت، نغمہ وسرود، مال ودولت،
خیرسگالی ومروت میں پلے تھے،
آج ان کی راہ میں کانٹے ہیں، سامان و
زادِ راہ کا پتہ نہیں، کپڑے بوسیدہ ہیں اور
عیش وراحت میں کوئی حصہ نہیں،
اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے انھیں معاف
کرے اور ظالموں کو سخت گرفت میں لے
پھر والیہ یعنی حضرت عالیہ، اس لشکر
کو جو بھاگ کر اس کی پناہ میں آگیا تھا
اور دوسرے ساتھیوں کو لیکر

والاغنياء مساكين والسراة
مهاجرين كانوا متوطنين
في رفاهية ولهنية مع
الاهل والعيال، فاعتربوا
ومطمئنين برفاه الحال، و
فراغ البال، فاضطروا
انا هم المتربة والاعواز
عن المنابت مع الاعراب،
واضطرهم الاضطراب
الى الاجلاء عن الاصحاب،
فمن باك يتعيع، وشاك يتوجع
ودهان يبرح، ولهفان
يسترجع، صبيان فطموا
قبل الاوان عن اللبان،
وشيب وشبان قد استيأسوا
عن الحاجات والشان مالهم
مثوى وثواء، ولاله دواء،

مالداروں کو فقیر و مسکین اور شریفوں
کو خوار۔ ذلیل بنا دیا وہ اپنے اہل و
عیال میں آرام و آسائش کی زندگی
بسر کر رہے تھے، خوش حال اور
فارغ البال تھے کہ مجبور ہو کر نکلنا
پڑا فقیری و تنگدستی نے ہمسوں
کی مجالس اور اضطراب و اضطرار
نے پیار والوں کی رفاقت سے دور
کر دیا۔

رونے والے آہ و زاری بیمار فریاد و
سیوں کرتے، آرزو و مد چلاتے اور
حسرت کشیدہ انا للہ پڑھتے تھے ایسی
ماؤں کے سینوں سے قبل از وقت جدا
کر دیئے گئے تھے، بوڑھے اور جوان حاجتوں
کے پورا کرنے سے ناامید تھے، نہ ان کا
کوئی ٹھکانا نہ بیماری کی دوا تھی،

من السراۃ، وھن حافیات
غیر خافیات، وقد کن
عقائل ذوات اخادیر
مقصورات فی مقاصیر
فرمین من بقاع بقاع
واقتنعن للقنوع برقاع
فاقتنعن بہا من دون قناع
تعاذفھن القفار والبلاقع
وانتضیت عنھن السنور
والبراقع، کن فی زھو وتیہ
ثم تھن فی مھامہ وتیہ
قد ترکوا امکنۃ ومکانۃ
ودولا، کانوا لا یبغون
عنہا حولا، حتی حال لحال
وحل الوبال وفشا الخبال
فصار بلاء مبیدا، ترک
البلاد بیدا، والاحرار عبیدا

حالانکہ سرداروں میں سے تھے، اور عورتیں
ننگے پاؤں اور بے پردہ تھیں حالانکہ
گرامی قدر، پردہ نشین اور محل سراؤں کی
رہنے والی تھیں، وہ سرسبز و شاداب
خطوں سے چٹیل میدانوں کی طرف پھینکدی
گئیں، وہ پیوندوں کے کپڑے پہنکر ستر پوشی
کرتی تھیں اور برقعے نہ ہونے سے اسی پر
اکتفا کرتیں، ایک میدان سے دوسرے
میدان میں پہنچتیں، بے پردگی میں روز بروز اضافہ
ہوتا رہتا وہ عیش و عشرت میں زندگی بسر
کرتی تھیں پھر دور دراز جنگل اور پرخطر میدان میں
ڈالدی گئیں۔ ان لوگوں کو محلات، پائگاہیں
اور ریاستیں چھوڑنا پڑیں، حالانکہ وہ ان سے
ذرا بھی ہٹنا نہ چاہتے تھے، یہاں تک کہ حال
متغیر، وبال نازل، اور ہلاکت عام ہوگئی
یہ ایسی مہلک مصیبت نازل ہوئی جس نے
شہروں کو میدان، آزادوں کو غلام،

في البلدة تلك الأيام تستعيد
جنودها الفارة وتسترد،
وتستعينهم وتستمد، وهم
قد ملئوا من الدهش والرعب
ونكصوا ونكلوا عن الاقتحام
في هذا المكان الصعب
فلم يرجع إليها أحد، ولم
يبق لها في البلد ملتجأ، فلما
استيئست من الأعوان
والأنصار، لم تجمع اسها
وعدة من الأنصار للسفار
إلى القلاع والقفار، فاجتمع
إليها جماعات من الفرسان
والرجال، وجمع غفير من
الرجال الرجال، وجمع كثير
من أهل البلد وربات الحجال
وهم حفاة عراة، وقد كانوا

تیں دن شہر میں رہ کر بھاگے ہوئے
لشکر کو واپس کرلے، اور اس سے
مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی
وہ لشکر ایسا دہشت زدہ ہوچکا تھا
کہ کسی صورت سے اس معرکہ
پر دستگیری کو تیار نہ ہوا۔ نہ ان میں
سے کوئی شخص لوٹا اور نہ شہر میں کہیں
جائے پناہ ہی رہی، آخر کار بیگم اپنے
اعوان و انصار سے مایوس ہوکر ولیعہد
اور چند ساتھیوں کو ساتھ لیکر میدان
اور بیابان یا جنگل کی طرف
چل کھڑی ہوئی، اب اس کے گرد،
کمر در دل سواروں کی کچھ جماعتیں،
پیدل مردوں کا انبوہ کثیر شہریوں اور
عزت دار عورتوں کی کافی تعداد
آکر جمع ہوگئی، وہ شہری ننگے
بدن اور ننگے پاؤں تھے،

وودها قين ارضهما ، وهم
كانوا قد جاءوا لإعدادهما
وامدادهما واعانتهما في
صيانتهما وحفظ عرضهما
وعرضهما ، فنكثوا المواثق
والايمان ، واستبدلوا الكفر بالايمان
ونافقوا فوافقوا النصارى ورافقوهم
وانتصروا لهم انتصارا ، فدخل
النصارى واعوانهم البلد ، وخرج
اهلوه وتركوا دورهم وبيوتهم خالية
حتى حصرت النصارى وبيضانهم
وجنودهم واعوانهم مقصورة
كانت فيها الوالية ، فخرجت مع
ابنها واثنين من صواحبها
من المقصورة المحصورة ،
من ظهرها راجلة ، ودخلت
محلة اخرى عاجلة ، ومكثت

اور وہ دیہاتی جوان کے علاقہ سے
ان کی مدد و اعانت ، عزت و آبرو ،
مال و دولت کی صیانت و حفاظت
کے لئے آئے تھے عہد شکنی کر کے
اور کفر کو ایمان سے بدل کر منافق
بن گئے ۔ نصاریٰ کی موافقت و رفاقت
کرنے لگے ۔ نصاریٰ مع معاونین شہر
میں داخل ہو گئے ۔ شہر کے رہنے
والے گھروں کو خالی کر کے
نکل گئے ۔

نصاریٰ اور ان کی گوری فوج اور
مددگاروں نے اس محل شاہی کا جس میں
ملکہ تھی محاصرہ کر لیا ۔ بیگم اپنے
ولیعہد اور دو سہیلیوں کو لے کر
محصورہ محل کی پشت سے نکل کر دوسرے
محلہ میں تیزی سے پیدل پہنچ گئی

حمل كثير كانوا اللتين
العاوير يدان فصالت
النصارى وبيصانهم
وأجرائهم واعوانهم صولات
شديدة متتابعة متوالية
وحملوا حملات شديدة
متتابعة متتالية، قلعت
محاربيهم عن مقاعدهم
وزلزلت اقدامهم فعرّوا
من مواضعهم فرارا لم
يستطيعوا بعد قرارا
في البلاد وتعويضا
حتى تركوا الوالية وابنها
وحيدين في قصورها،
وجاءهما كثير من اولياء
دولتهما واراكين ملكهما
واركان سلطنتهما

پہاڑی لشکر یکمکر مدد کی۔

اب تو نصاریٰ، ان کی گوری فوجوں
کرایہ کے سپاہیوں اور لالچی
معاونوں نے ایک ساتھ حملہ کر دیا۔
یہ حملے بڑے سخت، متواتر اور
مسلسل تھے جنہوں نے مقابلہ
کرنے والوں کی جگہ سے ہلا دیا اور ان کے
پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وہ کمین گاہوں
سے ایسی بری طرح بھاگے کہ شہر
کی سرحدوں پر بھی نہ ٹھہر سکے۔

ملکہ اور اس کے لڑکے کو تنہا محل
میں چھوڑ بھاگے۔ اس دونوں سے
وقت پر بہت سے ارکان دولت
اعیان سلطنت نے دغا کی۔

الی الوالیۃ، فآووھم واکرموھم
بالنعم المتوالیۃ، وجم غفیر
من الاجراء الاولی لم
یشھدوا حربا، ولم یشاھدوا
طعنا ولا ضربا، ولم
یعرفوا مصلحۃ ولم یزاولوا
اسلحۃ، ولم یلجموا فی معرکۃ
ولم یقتحموا فی مہلکۃ، تبوءوا
بجانب تلک الحدیقۃ
مقاعد، وحفروا ھناک
خنادق ومراصد، وطال
بین الفریقین التراخی التناصل
وامتد بینھما التقابل
والتقاتل، استمد النصاری
من والی الجبال، فاسعفھم
بما کانوا یتمنون ویریدون،
وامدھم من افواج الجبلیین

ملکہ نے قدر و منزلت کے ساتھ جود و بخشش
سے نوازا تھا، اور تنخواہ دار سپاہیوں
کا وہ جم غفیر جو حرب و ضرب سے
نابلد، اسلحہ بندی سے ناواقف، اور
مصلحت و معرکہ سے ناآشنا تھا،
یہ سب اس باغ پر خندقیں کھود کر
اور کمین گاہ بنا کر جا ڈٹے۔

دونوں فریقوں میں ایک مدت تک
مقابلہ و مقاتلہ اور نیزہ بازی
و تیر اندازی ہوتی رہی، تنگ
آ کر نصاریٰ نے پہاڑوں کے
والی سے مدد مانگی۔
اس نے اُن کی آرزو کے مطابق
تیس ۳۰ ہزار سے زیادہ

لامد اذا المحصورين ودخلوا
المصر فقاتلهم العراة
الشجعان فقتل كثير من النصارى
ودخل بقيتهم على المحصورين
محصورين مكسورين ثم
خرج كل من في القصور ولم
يتعرض لهم احد باقصاء
القتل والقصور وتحصن
النصارى في حديقة هي
[illegible] ميلين من البلد وحصنوها
من حصين بقوة وحيل
وظلموا فيها مدد اعلى مدد
وجمعوا فيها عدد اعلى عدد
وجموع الجيوش التي كانت
في البلد من قبل في الايام
الخالية والجيوش التي اتت
بعد الفرار من دهلي وآوت

سعید رُو گروہ آ گیا شہر میں داخل ہونے
لگا تو بہادر عاریوں نے ڈٹ کر مقابلہ
کیا بہت سے گورے مارے گئے۔
باقیماندہ دل شکستہ اور حسرت زدہ ہو کر
محصورین تک پہنچ گئے پھر تازہ دم
ہو کر یہ مکانوں سے نکلے تو بزدلی
اور کوتاہی کی وجہ سے کوئی
مقابلہ پر نہ آیا نصاری نے شہر سے
دو میل دور باغ پر قبضہ جما لیا اور بڑی
دلیری سے اس کو ایک گڑھ سا بنا لیا
وہاں مدد پر مدد اور سامان پر سامان
جمع کر لیا۔

وہ لشکر جو شہر میں پہلے سے موجود
تھے اور وہ جو دہلی سے بھاگ کر
بیگم کی پناہ میں آ گئے تھے ان کو[1]

[1] جرنیل بخت خاں وشہزادہ فیروز شاہ وغیرہما ۱۲

والله بارٍ والتباس، ويبصر
اولى الابصار بصائر الاعتبار
واكثرهم للنصارى ناصحون
وفى تولّيهم متناصرون، و
كلهم عن تدابير تتبيرهم
مقصّرون، او مقصرون
قاصرون، او متقاصرون
والنصارى مع نسواهم وولدهم
محصورون فى المصر فى
قصور، محفوظون لمانى
تدابير محاربيهم من قصور،
وقد حصّن النصارى تلك
القصور بالخنادق والسور،
والجيوش المنحرفة حولهم
يصولون ويفشلون، و
يقولون ما لا يفعلون،
ثم اتى جند من البيضان

اور صاحب نظر افراد کو عبرت کے
عجیب عجیب مناظر دکھائی تھی۔
ان میں سے اکثر نصاریٰ کے معاون و
مددگار اور محبت و وفا شعار تھے اور یہ سب
کے سب دشمن کی ہلاکت خیز تدبیروں
سے ناواقف اور ان کی مصلحت آمیز تدبیر کی
سے بے خبر تھے۔
نصاریٰ اپنے بچوں اور عورتوں
کے ساتھ شہر[1] میں محصور مگر مخالف
گروہ کی ناقص تدبیروں کی وجہ سے
اپنے مکانوں[2] میں محفوظ تھے۔
نصاریٰ نے خندقیں کھود کر اور حصار
بنا کر ان مکانوں کو قلعہ کی شکل دی تھی
مقابل لشکر ان پر حملہ آور ہو کر پسپا
ہوجاتا تھا۔ جو کچھ کہتا وہ کر نہ پاتا تھا۔
اسی حالت میں محصورین کی امداد کیلئے

[1] لکھنؤ۔ [2] بیلی گارد ۱۲۔

ان ید تو ویل بر فی امور الملک
وتحویرها، وامضاء الاوامر
وتسییرها، وقیادة الجیوش
وتجهیزها، واعیان مملکته
واركان دولته كلهم بین
فسل جبناء، حمقى جوان
لا عقلاء ولا امناء كلهم
دون، وبعضهم عبید،

تدبیر امور مملکت، اجرائے احکام اور قیادت
فوج کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس کے
اعیان[1] سلطنت اور ارکان دولت
سب کے سب نااہل، سست، بزدل
احمق، خائن اور غیر دیانتدار تھے۔
اکثر ذلیل اور بعض بندگان زر
تھے۔

فیهم سفیه ساه، ورقیع رقیع
ووباه واه، ومل من خاص
ملاص، ومهین عین، وذلیل
مذال، وحائر بائر، وجائر جائر
وختان مختال، وخادع
مختال ومنهم عبد عین،
ومنهم عین ذو وجهین
ومنهم من ترکهم مثل بر
یعنی بسالته الى الادبار

ان میں سفلہ، عیش پرست، ناداں،
ملحد، آوارہ، سست، عاق، حریت ماں،
ذلیل، غلام زادہ، حیران و پریشان، ظالم
دغاباز، حیلہ ساز و متکبر، خائن و مکار،
سر در دنیت خور، سبھی قسم کے
لوگ تھے

بعض ایسے بھاگنے والے مدبر تھے کہ ان کی تدبیر
تباہی و بربادی دادار کی طرف لیجاتی تھی

[1] مترجمان وغیرہ۔

وقد كان جمع ممن اخرجوا
عن النصارى وكانوا في ديارنا
من الجيوش والقبائل امروا
بعد اخراجهم امرأة من سا
والبد المعزول السابق، و
ابنا لها لم يترعرع ولم يراهق
وقد كان النصارى اخذوا
ذلك الملك من والده وكان
واهيا بالملاهي لاهيا
عن الملك ذاهبا، ولم يك
حازما ولا داهيا، نقض
العهود والمواثيق، فخلا
لها الملك بعد ما بطل عمل
النصارى وهو ذا حق،
وابنها صغير غرير غري
ذو عرين لا همّ له الا انه
لا هو عن عداته لا يستطيع

نصاریٰ کے "باغی" گروہوں اور ہمارے
نواح کے متعدد لشکروں نے اپنے
سابق معزول والی[1] کی ایک بیگم[2]
اور اس کے ایک ناتجربہ کار اور ناسمجھ
لڑکے[3] کو امیر و حاکم بنا ڈالا،

نصاریٰ نے اس والی سے اس کا ملک
چھین لیا تھا، وہ بڑا واہی ولاہی تھا۔
عیش و طرب میں منہمک، انتظام ملکی سے
غافل، عقل و خرد سے بیگانہ اور نقض
عہد و میثاق میں یگانہ تھا۔ نصاریٰ کی
عملداری ختم ہونے پر وہ ملکہ، مالکہ بن گئی۔
اس کا لڑکا چھوٹا، ناتجربہ کار، نازپروردہ
ہمسنوں کے ساتھ کھیلنے والا، اور
دشمن سے لاپروا تھا۔

[1] واجد علی شاہ اختر ۱۲۔ [2] حضرت محل ۱۲۔
[3] برجیس قدر ۱۲۔

تیتہ العبور للسیاحین و السائرین
فی وقت وحین فقد عانی و
من معی مالک الملک من کل بلیۃ
وھلاک وحاوزبی وبہم بحاراو
انھارا بلاجسر و فلک وحفظنا
جمیعًا من آفاتٍ تلک المسافات
ومھالک تلک المسالک وطوارق
تلک الطرائق وعوارض تلک السبل
وبلغنا لوقایتہ الکافیۃ
وحمایتہ الوافیۃ ونعمہ الصافیۃ
ورحمتہ العافیۃ وطنی ومسکنی
وداری ووجاری وأھلی و
جاری فقد امسا من المخافات
فی تلک المسافات ومن علینا
بالمعافاۃ من جمیع الآفات
فحمدنا اللّٰہ المالک حمدا
کثیرا علی ذلک

سیّاح یا مسافر کسی وقت بھی ادھر
سے نہ گذر سکے۔
خدائے مالک الملک نے مجھے اور
میرے متعلقین کو ہر مصیبت و ہلاکت
سے محفوظ رکھ کر پل اور کشتی کی مدد
کے بغیر دریاؤں اور نہروں کو
عبور کرا کے نجات دی۔ اور ہم سب
کو آفاتِ مسافات مہالک
مسالک حوادثِ راہ،
اور مصائب گذرگاہ سے مامون
و مامون رکھا۔ اور اپنی پوری حفاظت
کامل حمایت، مکمل نعمت اور بے شمار
رحمت کے ساتھ ہمیں اپنے جوار و دیار
اور احباب و رشتہ دار تک پہنچایا ہم
خدا کی اس بے پناہ عنایت اور تمام
آفات سے حفاظت پر اس کا شکر
بجا لائے۔

وأصيب بالمنا والحتوف
مئات وألوف من الرعايا،
وأما أنا وقد كنت أنحو نحو
ناحية الوطن المألوف، والسبيل
مخوف، وعابره مؤوف، وبيني وبين وطني
أقطار فيها مخاوف وأخطار،
والنصارى وجنودهم متجسسون،
ومن المارّة متجسسون، وقد
أمروا الزط وقبيلهم وفوقهم
بأن يقتلوا المارّة ويرهبوهم
وينهبوهم ويقطعوا سبيلهم
وطريقهم، ولم يخلّوا سبيلا
لعابر، ولم يذروا فلكا في
فلك في معبر من المعابر،
أخذوا السفائن وخرقوها
بل حرّقوها أو عابوها وأغرقوها،
وحجروا على الملّاحين لئلا

اور سینکڑوں، ہزاروں رعایا کے
آدمی مارڈالے گئے۔
میرا کیا پوچھنا، میں اپنے وطن مالوف
(خیرآباد) کی طرف چلا جا رہا تھا، راستہ
خوفناک اور رہگزار اندوہناک تھا۔
میرے اور وطن کے درمیان کئی خوف و
خطرہ سے بھری ہوئی منزلیں تھیں، نصاریٰ
اور ان کا لشکر، دن رات تلاش و تجسس میں
سرگرداں رہتا، جاٹوں کو مسافروں کے
مارڈالنے، ڈرانے، لوٹنے، ڈاکہ ڈالنے کی
کھلی چھٹی دے دی گئی تھی۔
انھوں نے سارے نالے بند کر رکھے تھے
اور کسی گھاٹ پر کوئی کشتی یا ناؤ تک
نہ چھوڑی تھی، کشتیوں کو پھاڑ ڈالتے
بلکہ خراب کرکے غرق کردیتے
یا جلا ڈالتے۔
ملّاحوں کو روک دیا تھا تاکہ کوئی

تؤيد، فكم من نسوة أمسين
أيامى، والدة أصبحوا يتامى،
وكم من ثكلى تبكي وتنوح،
وكم من ثكلان تنسرع عبراته
من حر سويداء يبوح، وقد
صار البلاد قاعاً صفصفاً
وقفراً أملساً، وأهلوه
تفرقوا وتمزّقوا وذهبوا
أيادي سبا،

ثم توجهت النصارى إلى
جانب الشرق وما يليه من القرى
والبلاد وأكثروا فيها الفساد
وعمّموا فيها القتل والضرب
والنهب بين العباد، فصرعت
الآجال كثيراً من الرجال، و
ربّات الحجال، واخترمت
المنايا جمّاً غفيراً من البرايا،

بہت سی صبح کی سہاگن عورتیں شام کو
بیوہ ہو گئیں اور شب کو آغوشِ پدر میں
سونے والے بچے صبح کو یتیم ہو کر اٹھے
کتنی ہی عورتیں اپنی اولاد وغیرہ کے
غم میں گریہ وزاری کرتی تھیں، اور
کتنے مردوں کی آنکھوں سے آنسوؤں
کا دریا جاری تھا شہر چٹیل میدان اور
بے آب وگیاہ جنگل بن گیا تھا، اور شہری
تباہ وبرباد ومنتشر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد نصاریٰ کی توجہ مشرقی
شہروں اور دیہات کی طرف مبذول
ہوئی وہاں بھی بڑا فساد مچایا قتل،
غارتگری، اور بے حد لوٹ کا بازار گرم
کر دیا۔ بے شمار مرد اور پردہ
نشیں مستورات موت کے گھاٹ
اتر گئے۔

وحرمتها، وحفظا لعفتها وعصمتها، واكثرهن صرن سبايا، وابتلين برزايا، واصبن بلايا، فمنهن من استرقها بعض الخمان، ومنهن من بيعت ببخس الرثمان، وكثير منهن هلكن عطشا وجوعا، وكثير منهن غبن ولم يستطعن رجوعا، ولم ير لهن اثر، ولم يسمع عنهن خبر، وجل النساء انئين من الاولياء، والبعولة والآباء، والاخوة والابناء، اذ كان كل يوم من هذا الزمن الكريه، يوم يفر المرء من اخيه، وامه وابيه، وصاحبته وبنيه وفصيلته التي

اور بیچاریوں عفت و عصمت کی بنا پر ڈوب کر مر گئیں، اکثر پکڑ کر قیدی بنالی گئیں اور طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئیں کچھ کو بعض رذیلوں نے لونڈیاں بنالیا اور بعض چند ٹکوں کے بالعوض بیچ ڈالی گئیں۔ بہت سی بھوک پیاس کی تاب نہ لاکر مر گئیں۔ بہت سی ایسی غائب ہوئیں کہ پھر نہ تو لوٹ کر ہی آئیں نہ ان کا کچھ پتہ ہی چل سکا۔

ہزاروں عورتیں، اپنے سرپرستوں شوہروں باپوں، بیٹوں، اور بھائیوں سے جدا کردی گئیں، جبکہ وہ ایسی مصیبت کا زمانہ تھا جو قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کہ اس دن انسان اپنے بھائی ماں، باپ، بیوی، اولاد، اور اہل خاندان سے بھاگتا نظر آئے گا۔

جمعا كبيرا من العرباء واسروا
هم واسروهم أسارى، الى
عظماء النصارى فقتلوهم
جميعا ولم يدعوا منهم يافعا
ولا رضيعا الا حتموا او ثنوا
استباعهم واتباعهم في
اقطار الملك، واخذوا في
اخذ الناس واستلابهم
بالردى والهلاك،

ان ظالموں نے سب کو مار ڈالا، نہ کوئی
عالی جاہ ان سے بچ سکا، نہ کسی ادنیٰ
انسان کو چھٹکارا نصیب ہوا۔

پھر اطراف و اکناف ملک میں لشکر
پھیلے جنہوں نے قتل و غارتگری
کی انتہا کر دی۔

وادرجت الحواسير
والمحصنات من النساء
في ملاءة الامتعة الدنيا
ومعهن وفيهن عجائز و
عذارى عن الفرار للاعياء؛
فمنهن من هلكت من علة
الفراق، ومنهن من اهلكت
نفسها بالغرق، صونا لعرضها

اس ابتلاء عظیم میں پردہ نشیں خواتین
پیدل نکل کھڑی ہوئیں، ان میں
بوڑھی اور عمر رسیدہ بھی تھیں جو
تھک کر عاجز ہو گئیں، بہت سی
خوف کی وجہ سے جان دے بیٹھیں،

جاسوساً، ومن رحمۃ الرحمان الرحیم یئوساً، کعامل الملك الذی یتولاھم، بل سلطھم وولاھم، لکنہ تعنّیٰ، اذحرم ما تمنّیٰ، وبقی حسران، فی الخسران، قد حال حالہ وبطل محالہ ولبث کانہ رھین مھین، فی ذل مُھین خسر الدنیا والاخرۃ ذلك ھوالخسران المبین،

جاسوس اور اللہ کی رحمت سے مایوس تھے۔ انھیں میں سے بادشاہ کا وہ عامل[1] بھی تھا جس نے نصاریٰ کو مسلط کرکے حاکم بنایا تھا لیکن اسے امیدوں کی محرومی اور ناکامی کی حسرت کا غم اٹھانا پڑا۔ اس کا حال متغیر ہوگیا۔ زمانے میں ذلیل و خوار ہوکر جیا، دنیا اور آخرت دونوں جگہ نقصان میں رہا۔ اور یہی کھلا ہوا نقصان ہے۔

ثم النصاری ارسلوا الی رؤساء الھنادك الذین ھم یملکون من الاراضی اقطاعاً، وکانوا لھم اتباعاً لیاخذوا من دخل دیارھم فاسراً، او وجد فی ارضھم مارا، فاخذوا ھؤلاء

ادھر نصاریٰ نے ماتحت ہندو رؤسا کے پاس پیغام بھیجا کہ جو شخص بھی تمھارے علاقے میں سے گزرے اسے پکڑ لیا جائے ان بداطواروں نے کافی تعداد میں مسافروں اور مہاجروں کو پکڑ کر نصرانی سرداروں کے پاس پہنچا دیا۔

[1] حکیم احسن اللہ خاں۔

فنهبوا أولا ما كان مع المأسورين
من النقدين الذهب
والفضة، ثم الحلي والثياب والسراويل
والأزر والسراويل، ثم سلموهم
عمالهم فقضوا عليهم
بالخنق والتقتيل ولم يبالوا
بالفتك شبانا ولا صغارا،
ولا شيوخا ولا أحداثا
فبلغ القتلى والخنقى آلافا،
وجل من ابتلي بظلم الطغام
أهل الإيمان والإسلام،
وأما الهنادك فقد سلموا
إلا من حق به أنه ممن يعاند
ولم يسلم من المسلمين إلا من
خرج من بيته مهاجرا أو من
كان للنصارى ناصرا وفي
دينه قاصرا، أو من كان لهم

ان لوگوں کے پاس جو کچھ چاندی سونا نکلتا
پہلے تو وہ چھین لیتے، پھر چادر، تہمد،
قمیص، پاجامہ جو کچھ ہاتھ لگتا، نہ چھوڑتے،
اس کے بعد افسروں کے پاس بھیج دیتے،
وہ ان کے لئے قتل یا پھانسی کی سزا کا
فیصلہ کرتے، جوان، بوڑھا، شریف
اور رذیل سب کے ساتھ یہی سلوک
ہوتا۔ اس طرح پھانسی پانے والوں
اور قتل ہونے والوں کی تعداد ہزاروں
تک پہنچ گئی، ظالموں کے ظلم کا شکار
اکثر و بیشتر مسلمان تھے۔
ہندؤں میں سے صرف وہ مارے
گئے جن کے متعلق دشمن و معاند ہونے کا
یقین تھا، اور مسلمانوں میں سے فقط وہ
بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہجرت
کر گئے تھے، یا وہ جو نصاریٰ کے ناصر اور
اپنے دین میں قاصر تھے، یا وہ جو ان کے

سارباً ومن جدّ مسرعاً	یا دن میں نظریں بچا کر تیزی سے بھاگ گیا
هارباً بالنهار سارباً وقليل ماهم	اور ایسے خوش نصیب بہت کم تھے۔
ثم النصارى قتلوا من كان	پھر نصاریٰ نے شہر کے گرد و نواح
فی نواحی المصر تلك الارجاء	کے رئیسوں اور سرداروں کو قتل کرنا
من الاراكين والرؤساء	ان کی جائداد، عمارتیں، مویشی، مال و
وغصبوا ارضهم وعقارهم	متاع، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ
ومساكنهم وديارهم وامتعتهم	اور ہتھیاروں وغیرہ کو لوٹنا
واموالهم واسلحتهم وانقالهم	شروع کیا۔
وافراسهم وافيالهم وجمالهم	
وجمالهم فاهلكوهم واهالهم	اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے اہل و
وعيالهم جمعاء مع انهم كانوا	عیال کو بھی قتل کر ڈالا، حالانکہ یہ سب
رعايا لهم وتبعا يطيعوهم	رعایا بن چکے تھے اور ڈر یا لالچ سے
خوفا وطمعا ثم انهم حشروا	فرمانبردار بن ہی جاتے انھوں نے تمام
جنودهم لكل سبيل لياخذوا	راستوں پر چوکیاں بٹھا دیں تاکہ بھاگنے
من فرّ بالاخذ الوبيل	والوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جائے، ہزاروں
فاخذوا كثيرا من الهاربين	بھاگنے والوں میں تھوڑے ہی بچ
وما نجا منهم الا قليل	پائے۔ باقی سب پکڑے گئے۔

اصيق في حرس اسير اسود
الكبد اصهب الشعر ازرق
ثم نفوه من ممالك واسعة
الى نهر جزائر شاسعة
مع زوجه التي كانت لهم
وكانت لهم موالية اذ كانت
في الحقيقة ملكة والية وقد
خابت في ما طمعت وسلبت
اموالا قد جمعت وقد
سبيت بعد ما كانت سبت
واستذلت بعد ما اصيبت
وقتلوا من وجدوا من
قومه بالضرب والحنق
كما حنقوا وقتلوا من عداهم
كثيرا من الخلق ولم ينج
من هؤلاء الضعفاء الا من
فر مستخفيا متواريا بالليل

میں سوئی کے سوراخ سے بھی تنگ
کوٹھری میں مقید کر دیا پھر اس وسیع
ملک سے نکال کر دور دراز جزیرہ[51] میں
بھیجا دیا۔
بادشاہ کے ساتھ اس بیگم کو بھی روانہ
کیا گیا جو نصاریٰ کی اس وقت بھی مطیع
و دوست تھی کہ وہ حقیقت میں ملکہ
تھی وہ اپنی آرزوؤں رہنے کو ماننیں
سارے ایں ناکام رہی اس کا جمع
کردہ مال بھی چھین لیا گیا۔ وہ ریست[52]
سے کے بعد صورت اور حالت کے
بد ہیئت بنی بادشاہ کی قوم میں سے
جو بھی ملتا اس کی گردن ماردی جاتی یا پھانسی
دی جاتی جیسا کہ دوسرے لوگوں کے
ساتھ بھی عمل کیا گیا۔ ان کمزوروں میں
سے وہی بچ سکا جو رات میں چھپ کر

[51] رنگون ۱۲۔ [52] ریست محل اس ملکہ کا نام تھا ۱۲

محفوداً فاضحی ناسوراً محسوراً مکموداً مصفوداً، واخذوا من معه من الابناء والاحفاد مقرنین فی الاصفاد، وذهبوا به الی البلد، مع من معه من الاهل والولد، فاغتال احد من عظمائهم هوطرخان[1] اوبطریق، ابناءه واحفاده بالبنادق فی اثناء الطریق، واهدوا رؤسهم مقطوعة، الی رئیسهم فی خوان موضوعة، وتركوا جثثهم منبوذة، ثم نبذوا تلك الرؤس مجذوذة، وجسوه فی بیت من سم الخیاط

تھے۔ مخدوم بنے ہوئے دن گذار رہے تھے۔

اس فریب خوردگی کا نتیجہ ہوا کہ حسرت کشیدہ، دل تپیدہ، بیٹوں اور پوتوں کے کے ساتھ پابہ زنجیر شہر کی طرف لیجایا گیا۔ راستے میں بیٹوں اور پوتوں کو کسی سردار[1] نے بندوق کا نشانہ بنایا، دھڑ وہیں پھینک کر، سروں کو خوان میں لگاکر بادشاہ کے سامنے تحفۃً پیش کیا۔ پھر ان سروں کو بھی کچل کر پھینک دیا۔

بادشاہ کو، گورے منہ، سیاہ دل، گندمی بال اور کنجی آنکھ والوں کی حراست

---

[1] طرخان اس پیشوا کہتے ہیں جسکے تحت پانچہزار آدمی ہوں اور بطریق وہ ہوتا ہے جسکے ماتحت دس ہزار ہوں ۱۲۔

[1] مسٹر ہڈسن نے مرزا مغل اور خضر سلطان وغیرہما کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔

اذ قد استبد به العداة مكثت
فيه حسنا ايام و ليالی ثم خرجت
مع اهلی وعيالی بعد ترك لی
من كتبی ونشبی ومالی لعود
ما يكفی لنقل احمالی واخذت
اليها سبيلا متوكلا على الله
وكفى بالله وكيلا

والنصارى بعد استيلاء
هم على البلد وسواده سوا
سياسهم عمدوا الى اخذ
الملك واولاده واحفاده
وهم لم يبرحوا مستقرهم
والقضاء مكنهم فی ذلك
المكان واقرهم وهم مستوثقون
من حنث هم بالكاذبين وسنن
هم وكان فی ملك المقبرة
معهم ولهم اسر ولهم اشتودا

دشمنوں کے ظلم واستبداد کی وجہ سے
ناپید ہوگیا تو پانچ شب و روز اسی حالت
میں گذار کر اپنی عزیز ترین متاع کتابیں
مال واسباب چھوڑ کر (بار برداری کا
انتظام نہ ہوسکنے کی وجہ سے) خدا پر
بھروسہ کرکے اہل وعیال کو ساتھ لیکر
نکل کھڑا ہوا۔
شہر اور اس کے مال ودولت پر سعید
لشکریوں کے ذریعہ قابض ہوکر نصاریٰ
کی تمام تر توجہ، بادشاہ اور اس کے بیٹوں
اور پوتوں کے پکڑنے کی طرف
مبذول ہوئی۔
ان سب نے اب تک اپنا مستقر
(مقبرہ) نہ چھوڑا تھا تقدیر الٰہی نے وہیں
برقرار رکھا تھا۔ انہیں ایسے جھوٹے اور
مکار وزیر کی کذب سازی پر اعتماد
تھا وہ اس مقبرہ میں بڑے جوش اور غرض

واذ کان فی دھلی کثیر من
عیالی واھلی، ومع ذلك کنت
مدعوا، وکان الافلاح
والافلاج مرجوا، والفرج
والفرح مظنونا، وما قدّر
فی الغیب مکتوبا مکنونا توجھت
تلقاء دھلی، مما کان محلی،
فالقیت بھا رحلی، ولاقیت
بھا اھلی، واشرت الی الناس
بما اقتضی رائی وقضی بہ عقلی،
فلم یأتمروا بما اشرت ولم
یأتمروا بما امرت،

فلما استولی النصاری
علی البلد، ولم یبق فیہ
من الجیوش ومن سکانہ
احد، وعازت فیہ الاقوات،
ولم یتیسر لنا الماء الفرات،

اس وقت دہلی میں میرے اکثر
اہل وعیال[1] موجود تھے، اور مجھے بلایا
بھی گیا تھا۔ ساتھ ہی فلاح وکامیابی،
کشائش وشادمانی کی امید بھی تھی۔ جو
کچھ ہونے والا تھا وہ تو پہلے ہی مقدر
ہو چکا تھا۔ میں نے دہلی کا رُخ کر دیا۔
وہاں پہنچکر اہل وعیال سے ملا۔ اپنی
عقل اور فہم کے مطابق لوگوں کو
اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا
لیکن نہ انھوں نے میرا مشورہ قبول
کیا اور نہ میری بات مانی۔

جب نصاریٰ کا شہر پر اچھی طرح
قبضہ ہوگیا اور کوئی لشکری و شہری
باقی نہ رہا۔ غلہ اور پانی،

[1] مولوی شمس الحق اور ان کی والدہ وغیرہ۔

من قاتلیھم فی البلد ولما
لم تزل البلاد الون وھا دک
اخرون ھم للنصاریٰ
موالون، وعمل الملک الاولی
ھم للمقاتلین قالوں تدبیرا
یتزھم تشیرا ویقتروا علیھم
الاقوات تقتیرا، وامّا امّا
کان فی البلد من الحبوب
والغلات، وسلّ وامّا کان
یجی ویجلب الیھم من القرٰی
والقصبات حتی طلوا وباتوا
جیاعا، والتاجوا التیاحا
والتاعوا التیاعا، فاصطروا
اضطرارا، وفروا اسرع
ولھ، فاستولی النصاریٰ
علی البلد والوانہ وسورہ
وقلعتہ واسوا قتوا بیاندوری

کئی بار شہر میں مصروف کارزار رہ کر
بے دم ہو چکے تھے۔ اب میوں، اور
دوسرے ہندؤں نے جو نصاریٰ کے
دوست تھے اور بادشاہ کے اُن
کارپردازوں[1] نے جو مجاہد گروہ کے
دشمن تھے ایسی تدبیر سوچی جس سے
شہریوں اور لشکریوں کو ہلاک کر سکیں
انھوں نے وہ سب غلّہ جو میوں کے
پاس تھا چھپا دیا اور دیہات و
قصبات سے جو اُن کے پاس غلہ
آتا رہتا تھا وہ روک دیا یہ تدبیر کارگر
ہوئی، لشکری اور شہری بھوک،
پیاس، سوزش اور بےچینی سے دن رات گذارنے
لگے۔ بالآخر مجبور و پریشان ہو کر بھاگ چھوڑے
پھر تو نصاریٰ نے شہر کے پھاٹک، شہر پناہ،
قلعہ، بازار اور مکانوں پر مکمل قبضہ جما لیا

[1] مرزا الٰہی بخش وغیرہ

خلوها امتعتهم واموالهم	ان سب کے شہر چھوڑ کر چلے جانے سے
ونجا وجوههم من البلد استولی	شہریوں پر سراسیمگی ورعب طاری ہو جانا
الرعب علی کثیر من سکانه	قدرتی امر تھا مرعوب ومتاثر لوگ
فخرج کل من اولاء من مکانه	بھی مکان چھوڑ بھاگے۔
فلما خلت الدیار من اهلها	جب شہر کے مکان مکینوں سے خالی ہو گئے
دخلت النصاری وجنودهم	تو نصاریٰ اور ان کا لشکر ان میں داخل
فیها، فمالوا علی ما وجدوا	ہو گیا، انھوں نے مال ومتاع
فیها من الوجد والمال،	لوٹنا، باقیماندہ ضعیفوں، بچوں،
واغتالوا من بقی فی دار من	اور عورتوں کو قتل کرنا شروع کیا۔
النسوان والاطفال والضعفاء	بہادرانِ شہر میں سے ایک بھی
من الرجال، فلم یبق من	ایسا نہ بچا تھا جو ان کا کسی اعتبار
اهل البلد لمجالتهم ومجالدتهم	سے مقابلہ کر سکتا۔
احدٌ من اهل الجلد،	
واما الجیوش المنهزمة فمنهم	"باغی" لشکروں میں سے بعض تو
من فر قبل اتیان النصاری	نصاریٰ کے قبضہ سے پہلے ہی
فرارا، ومنهم من لم یستطع	بھاگ گئے۔ بعض قبضہ کے بعد
بعده ثباتا وقرارا، ومنهم	ثابت قدم نہ رہ سکے۔ بعض

يودي كل من كان للنصارى ميّال
ثم انه لم يبق في البلد من مآل
ولا وال اذ خرج الملك مع
من لديه من العيال الى مقرة
هي من البلد ثلاثة اميال وكان
مطيعاً لزوجته وعامله الخوان
معترا بما كان يختلقه من
الكذب والبهتان ويقول له
ان النصارى عند تسلطهم
يتعهدونه باحسان ويمكنونه
في الملك بأتمه وسلطان
فكان معهم ولمسرتهم متابعه
ويعده الشيطان وخرج
مع الملك من لديه الامراء
والاجزاء مستصحبين
اموالهم وعيالهم تاركين
في دورهم وبيوتهم اللاتي

میں پیش پیش تھا۔
بڑی مصیبت یہ آپڑی تھی کہ شہر میں نہ
کوئی جائے پناہ رہی تھی اور نہ حاکم ہی رہا
تھا کیونکہ حاکم (بادشاہ) اپنے اہل و عیال
کو لیکر شہر سے تین میل دور مقرہ[۵] میں جاچکا
تھا۔ وہ درحقیقت اپنی بیگم اور خائن وزیر
کا مطیع تھا جس نے کذب و بہتان سے
کام لیکر دھوکے میں ڈال رکھا تھا اس نے
یہ کہکر بادشاہ کو پھسلایا تھا کہ نصاریٰ قابض
ہونے کے بعد اسکے ساتھ اچھا سلوک کرینگے
اور اسی کو بزرگی و سرداری بخشدیں گے
وہ فریب خوردہ ان شیطانی وعدوں
اور ابلیسی آرزوؤں پر خوش تھا بادشاہ
کے ساتھ اسکے تمام امراء و متعلقین بھی
اپنے اہل و عیال کو لیکر گھروں میں مال و
متاع چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان سب کے

---

۵ مقرہ مقبرہ ہمایوں ۱۲

وغلقوا الالباب ليتمكنوا من
رمي البنادق ويحترسوا
ممن يجوبهم للحراب فكلما
برز لهم احد من الجيش
او اهل البلد رموه ببندق
بصرعه قتيلا ولا يجد
المبارز الى ضربهم سبيلا
وكانوا ينتهزون فرصة
للخروج الى دور اخر
ليتخذوها كدور اوليائهم
مبيتا ومقيلا لكنهم كلما
برزوا ملعونين اينما ثُقفوا
اُخذوا وقُتلوا تقتيلا فكانوا
لا يبرزون حيث يستشعرون
مقاتلا ومقابلا الا قليلا
ومع ذلك كان ياتيهم
من الجبل مدد متوال

جو باغی ادھر آنکلے اس پر گولی چلا کر
اپنی حفاظت کر سکیں۔ چنانچہ جو
لشکری یا شہری ادھر آنکلتا یہ
بندوق چلا کر مار ڈالتے۔ اور
مقابل کا ان پر کوئی قابو نہ
چلتا تھا۔

وہ فرصت کے منتظر رہتے تھے کہ موقع
پاکر اپنے دوستوں کے گھروں کی طرح
دوسرے گھروں میں بھی پہنچکر انھیں شب
روز کی آرام گاہ بنائیں۔ لیکن وہ
لعنتی جب بھی نکلتے پکڑ کر قتل کر دیئے
جاتے، اس لئے جہاں انھیں مقابلہ کا
اندیشہ ہوتا وہاں بہت کم نکلتے،
اس کے باوجود انھیں پہاڑی سے
مسلسل مدد پہنچ رہی تھی اور ہر
عیسائی دوست ہندو ان کی مدد

عن كيد النصارى وحلفائهم
فلما حل البلد فريق من النصارى
ولجوهم من باب أو هوة
وسور هدم هوة، وبرج
هدّ ولا، ولم يجدوا أمامك
من أحد ومقاوما ولا مدافعا
ومانعا ولا ممانعا وقادسارعوا
فتلمسوا منازل الذين يادِيار
الذين كانوا من أهل النصار
الأنصار، ونزلوا عليهم
لوقايتهم من الأذى ورشوة
وعجلوا لهم ما أعدّوا لهم
من القرى والشوى وأسلحوهم
باللحوم والألبان، وقضوا
ما كان لهم من الأوطار
والألبان، وفتحوا الدار
في الجدران والحيطان،

یہ موقعہ پاکر نصاری اندان کا لشکر،
اسی گرتے ہوئے پھاٹک ٹوٹی ہوئی
دیوار، اور منہدم برج سے داخل
شہر ہو گئے وہاں انھیں کوئی مزاحم
و مدافع نہیں ملا۔

بس وہ تلاش کر کے ان لوگوں کے
گھروں میں پہنچ گئے جو پہلے ہی سے
ان کے معاون و مددگار بن چکے
تھے انھوں نے فوراً ان کی حفاظت
کا گھروں میں انتظام کیا اور
جلد جلد، پہلے سے تیار شدہ ضیافت
سے نوازا،

انھیں خوب پیٹ بھر کر گوشت
اور دودھ کھلایا پلایا اور تمام ضرورت
کی چیزیں مہیا کیں
مکانوں کے دروازے بند کر کے
دیواروں میں روزن کر دیئے تاکہ

والکسور فی حائط السور وبدا الفروج فی الجدار والبروج، وتضعضع البناء وتقطع الاسباب، وارتفع الحجاب، ولم یستطع احد من الجیوش هناك قیاما وقعودا، ولا طلوعا علی ذلك السور وصعودا، فکل من طلع رمی ببندق، وتردی فی خندق،

جس سے شہر پناہ کی دیوار اور برجوں میں شگاف پڑ گئے۔ پھاٹک گر پڑا۔ اور امیدوں کے رشتے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ حائل پردہ درمیان سے اٹھ گیا۔ کوئی لشکری اٹھنے بیٹھنے کی ہمت قدرت نہ رکھتا تھا۔ نہ دیوار پر چڑھکر جھانک سکتا تھا۔ جو جھانکتا تھا۔ گولی کا نشانہ بن کر خندق میں جا پڑتا تھا۔

وبعد ذلك خادع النصاری واحتالوا، ووجهوا فریقا من جنودهم تلقاء باب آخر لیخیل انهم علی ذلك الباب الآخر صالوا فاشتغل الغزاة وفریق من الجیش بقراعهم ودفاعهم وغفلوا

اب نصاری نے یہ چال چلی کہ ایک لشکر دوسرے دروازے کی طرف روانہ کیا تاکہ دوسری طرف سے حملہ محسوس کیا جائے۔ یہ دیکھ کر مجاہدین اور لشکریوں کا گروہ ادھر متوجہ ہو گیا اور دشمن کا مکر نہ سمجھتے ہوئے وہاں مدافعت میں مشغول ہو گیا۔

اقدامت ليلة ثلاثة من الجيش
قد تعودوا مالك عنده والكسل
وحملوا على الحصن والقتل
في مرصد محاذ للجبل وحملوا
اسلحتهم وناموا ايام بيتهم
العدو واحد واسلحتهم
واحترموهم احتراما
وناموا اولئك الأيام فما
استطاعوا قياما

فلما استولى النصارى
على ذلك المرصد ودخلوا
فيه نصبوا مجانيق كثيرة
لهدم سور البلد وهدم البرج
كان في حواليه وفتح باب
يحاذيه واطلقوا الساحق
نقالا كما ارى كل آن ليلا و
نهارا الجلات الفطوير

سرحدات کی نگہداشت کرتی سد قسمتی سے
ایک شب کو پہاڑی کی محاذی کمیں گاہ
پر ایک عیش پرست بزدل اور کسلمند
جماعت مقرر کر دی گئی۔ وہ اپنے ہتھیار
اتار کر آرام کی نیند سو گئی، دشمن نے
موقعہ غنیمت سمجھ کر شبخون مارا۔ اور
ہتھیاروں پر قبضہ کر کے اُسے
قیامت تک کے لئے
سلا دیا۔

جب نصاری نے اس کمیں گاہ پر
قبضہ کر لیا تو بہت سی توپیں اور
منجنیقیں نزدیک ترین شہر پناہ
اور قریب ترین برج پران کے
گرانے اور محاذی پھاٹک کھولنے
کے لئے لگا دیں اور دن رات
گولوں اور بندوقوں سے
گولیوں کا مینہ برسانا شروع کر دیا

ردوا، كان المجاهدون
الغزاة الحماة الكماة
يدافعونهم اشد دفاع،
ويقارعونهم اشد قراع،
يثبتون عند التحام الاقدام
ويتقدمون على كل مقدام
لدى الاقدام، فذاق كثير
منهم شهد الشهادة، و
سعدوا وصعدوا معارج
السعادة، "وللذين احسنوا
الحسنى وزيادة"، وما بقي
من المجاهدين الاقليل
يبيتون جياعا، ويصبحون
الى الغزو سراعا، فيقارعون
العدو قراعا، فكانوا مع جمع
من الجيش يحفظون السور
ويسدون الثغور، حتى

بہادر اور نگہبان غازی بڑے زور شور
سے یلغار کو روک رہے تھے۔
مدافعت و مبارزت میں خوب خوب
جوہر دکھا رہے تھے۔
مقابلے میں ثابت قدم تھے اور ہر
پیشقدمی کرنے والے پر آگے بڑھ کر
حملہ آور تھے۔ ان میں سے بہت سے
جام شہادت پیکر سعادت کے اعلیٰ
مقام پر فائز ہوئے۔
"نیکوکاروں کے لئے بہشت حوریں
اور اس سے بڑھ چڑھ کر بھی نعمتیں ہیں"
اب مجاہدین کی ایک مختصر جماعت باقی
رہ گئی جو بھوک پیاس برداشت
کرکے رات گذارتی اور صبح ہوتے ہی
دشمن کے مقابلہ پر ڈٹ کر نبرد آزما ہوتی
لشکریوں کی ایک جماعت کے ساتھ
ملکر یہی شہر پناہ کی حفاظت اور شہری

يالون فى مد اكلّ جهدا أ
فطفق النصارى يحملون
على البلد والوابد ويسطو
على دراسته وحماته و
المحافظين التهو دو فريق
من الجنود، لعوّقوهم عن
البلد ويصاولون ويحولو
بينهم وبين ما يحاولون،
يتجالد الفريقان ليلا و
نهارا، ركبانا ورجالا، و
كانت الحرب بينهما اربعة
اشهر سجالا ولم يجد العدى
فى تلك المدة، مع غاية
الشدة، وكثرة العدّة
والعدة الى دخول البلد سبيلا
ومجالا، بل كلما هجموا
صُدّوا، وكلما اقدموا،

پھر تو نصاریٰ، شہر اور اس کے بچانے والوں
دربانوں اور محافظوں پر حملہ کرنے لگے،
ادھر جماعت مجاہدین اور لشکریوں کے
ایک بہادر گروہ نے ان کے حملوں کو
روکنا اور ان کے مقاصد میں حائل
ہونا اپنے لئے اہم ترین فرض قرار دیا۔

دن رات پیدل اور سوار داد شجاعت
دینے لگے۔
چار[1] مہینے تک متواتر جنگ ہوتی
رہی۔ دشمن اس مدت میں کثیر لاؤ لشکر اور
ساز و سامان کے باوجود شہر میں داخل
نہ ہو سکا۔
جب بھی حملہ کرتے تھے روکے جاتے تھے،
جس وقت اقدام کرتے تھے لوٹائے جاتے تھے

[1] مئی ۸۲ء سے ستمبر ۸۲ء تک ۱۲ -

الهنادك الخوّان والمسلمین
الذین ارتدّوا بولاء النصارٰی
بعد الایمان، وباعوا دینهم
ببخس من الاثمان،
وقد أئتلف بالنصارٰی
من سکّان البلد آلاف
أئتلافاً، فالهنادك کلّهم
معهم واما المسلمون فقد
اختلفوا اختلافاً، فبعضهم
للنصارٰی قالون، وبعضهم
لهم موالون، فی حبّهم
غالون، یجدون لکسر الجنود
المنحرفة بالحیل والمکائد
جدّاً، ویجهدون فی فلّ
شوکة المجاهدین و
قلعهم وقمعهم وتبدیدا
شملهم وتفریق جمعهم لا

اور وہ بدبخت وبدکیش مسلمان بھی جو ایمان
کے بعد نصاریٰ کی محبت میں مرتد
ہو کر اپنے دین کو چند ٹکوں سے
بالعوض بیچ چکے تھے۔
ہزاروں شہری بھی نصاریٰ کی محبت
کا دم بھرنے لگے اور تمام ہندو ان
کے ساتھی ہوگئے۔ مسلمانوں میں دو
گروہ بن گئے۔ ایک گروہ تو ان
(غیر ملکیوں) کا جانی دشمن تھا۔
دوسرا گروہ ان کی محبت میں اس درجہ
غلو رکھتا تھا کہ اپنے ہندوستانی لشکر
کی بربادی، مجاہدین کی شوکت
و وقار کی خواری، اور ان کے
قلع وقمع کرنے میں، مکر وحیلہ
سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی،
ان کے اندر افتراق و انشقاق
پھیلانا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

واتقى لدى العطايا ما اتقى،
ومنهم من يستنكف للنس
المسوف عن الدخول في
الصفوف، ومنهم من
كان يجالد ويحارب، و
يحاول النصارى ويضارب،
والنصارى بعد ما وهنوا
واستكانوا استمدوا إلى الحي
هنالك العرب واستعانوا
فأمدوهم بكثير من العدد
والعُدد، وأعانوهم بمدد
بعد مدد، في أقصر المُدد
تجمع النصارى على ذلك
الجبل للحرب العوان، كثيرا
من الجنود والأعوان، فمن
جنودهم أشياعهم اليمنان،
وبعا أجرائهم من الأراذل

پر قصہ جما بیٹھے، بعض نے میدانِ جہاد
کے تنگ وسخت ہو جی گیڑے ہیں کر
صفوفِ جنگ میں داخل ہونے کو
بُرا جانا۔ صرف ایک گروہ نصاری
کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے
لڑتا رہا۔
نصاری جب لڑتے لڑتے تھک گئے
اور پست ہو گئے تو عربی ہندوؤں سے
مدد و معاونت کے طالب ہوئے
ہندوؤں نے کثیر لشکر اور ساز و سامان
حرب سے تھوڑی سی مدت میں پے
درپے مدد کی تب تو نصاری نے سخت
لڑائی ٹھان دی اور اس پہاڑی پر
بہت سا لشکر اور مددگار و معاون
جمع کر لئے۔ ان کے لشکریوں میں
گوتے ہند کے گروہ بھی تھے،
اور ذلیل ترین ہندو اجیر بھی،

قد عرجوا وعرجوا تجاه	ایک بلند پہاڑی[1] پر چڑھ کر شہر کا رُخ
المصر علی جبل شاهق، وحصنوه	کر دیا۔ شہر کا محاصرہ کر کے خندقیں کھود
وحفروا حوله خنادق،	ڈالیں، پہاڑی پر توپیں اور منجنیقیں نصب
ونصبوا علیه مجانق، یرمون	کر کے شہر پناہ اور مکانات پر گولہ
بها نحو البلد والسور	باری شروع کر دی۔ ایسا معلوم
والمساکن والدور ببنادق،	ہوتا تھا کہ بجلیاں اور تارے ٹوٹ
کأنها شهب وصواعق.	ٹوٹ کر عمارتوں پر گر رہے ہیں۔
والجنود المنحرفة أشتات	ہندوستانیوں کا برسرپیکار اور "باغی"
مختلفة، صاروا طرائق قددا	لشکر مختلف ٹولیوں میں تقسیم تھا۔
بعضهم لا یطیع أحدا،	بعض گروہ کا کوئی جنرل ہی نہ تھا۔
والبعض لا یجدون ملتحدا،	بعض کو جائے پناہ بھی میسر نہ تھی، بعض
منهم من وهنت لفقره	کی طاقت فقر و فاقہ نے سلب کر کے ہاتھ
طاقته، وأقعدته عن اللقاء	پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا، کچھ تھوڑا سا
للحرب فاقته، ومنهم من	مالِ غنیمت ہاتھ لگنے سے بے نیاز
عوقد عن المبارزة ما نهب،	ہو گئے تھے۔ کچھ ترسان و لرزاں قلب
ومنهم من هرب وقلبه	کے ساتھ بھاگ چھوٹے تھے۔ بعض
راهب، ومنهم من طغی وبغی،	طغیان و سرکشی سے بدکار عورتوں

[1] پہاڑی دھیرج ۱۲

فاخرتهم عن مقدمة الجيش
وقلبهوما في قلوبهم من القتل
والهم الحسيس عن الثبات
في قلب الجيش وسطهم
الساقة من الميمنة و
عاقهم الميسر والميسرة
عن الميسرة وكفهم من
معهم من السوقة السوقة
عن الالتحاق مع الساقة
وكذلك من يتولى خطبا
جليلا مع عدم الجلاقة
وحمل حملا ثقيلا مع عوز
الطاقة يبيتون نياما و
يظلون سكارى واذا استهوا
وصحوا فهم اعمال حيارى
وقد هجمت عليهم
بالجنود النصارى

مقدمۃ الجیش سے بھی پیچھے کر دیا۔
ان کے دلوں میں نامردی اور ذلیل
اندیشہ بیٹھ گیا اسی لیے ان کو وسط
لشکر میں ثابت قدمی سے روکا۔
شومئ قسمت نے میمنہ سے اور
فرار و تونگری نے میسرہ سے باز رکھا
ان کے جو سادی اور باراری ہم صحبتوں
نے ساقہ (پچھلا دستہ) سے بھی
علیحدہ رکھا ایسا ہی ہوا کرتا ہے
جب کسی نااہل کو کوئی بڑا کام سپرد
کیا جاتا ہے اور کمر در پر بھاری
بوجھ لادا جاتا ہے وہ رات سو کر
اور دن بدمست ہو کر گذارتے جب
بیدار و ہشیار ہوتے تو غافل
و حیران پھرے۔
لہٰذا یکبارگی نصاری
کا لشکر ان پر آ کر ٹوٹ پڑا۔

اختار والمعاشرة والمشاورة
سوقة من اهل السوق، فغامر
اولئك الاغمار في غمرا
الاتراف والاسراف و
غمرات الفسوق،
كانوا في عسر ثم فجروا، و
اذ فجروا فجروا كانوا يأخذون
من الناس بحيلة تزويد الجيوش
ويجبونهم مالاً جمّاً، ولا
ينالون شيئاً منه احداً
من الجيش فيأكلون كل ما
يأخذون اكلاً لمّاً شغلهم
قواد البغايا عن قيادة
البغايا، واقعدهم القعود
مع السراري عن السُّرى
مع السرايا، والهاهم
ملاهيهم في رخاء العيش،

نیزہ بازی کا ہی موقعہ ہوا تھا۔ انھوں نے
بازاری لوگوں کو اپنا ہمنشین و جلیس بنا لیا
اس طرح یہ ناآزمودہ کار، آرام طلبی
اسراف بیجا اور فسق و فجور میں
مبتلا ہو گئے۔
وہ تنگدست ہو چکے تھے پھر مالدار ہو گئے
جب مالدار ہو گئے تو عیش پرستیوں میں پڑ گئے
لوگوں سے، لشکروں کے ساز و سامان کے
بہانے سے کافی مقدار میں مال جمع کرتے
تھے اور اس میں سے ایک حبہ بھی کسی لشکری پر خرچ
نہ کرتے تھے جو کچھ وصول کرتے تھے خود کھا
جاتے تھے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن
ان کو تو زنانِ فاحشہ و تباہ کار نے
طوائف کی قیادت، اور کنیزوں کی شب باشی
نے لشکروں کے ساتھ رات کو چلنے سے
روک دیا۔ اور آلات عیش و طرب
نے آرام طلبی میں ڈال کر

یحکم بشیٔ جھرا وسرا ولا یملک نفعا ولا ضرا،	علی الاعلان کوئی حکم دے سکتا تھا نہ کسی نفع وضرر پہنچانے کی طاقت رکھتا تھا۔
ھذا وقد انتھض من بعض الغور والبلاد جمع من المسلمین الجلاد للجدال والجلاد، والجد والجھاد بعد الاستفتاء والاستشھاد من العلماء الزھاد، وائمتھم بوجوب الجھاد،	یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہر و دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت[۱]، علماء زہاد، اور ائمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر جدال و قتال کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔
بفتاوی ائمۃ الاجتھاد، وقد امّر ذلک الامّۃ علی الجمع من بعض من لم من الاجھاد والاساء، وکانوا من السفھاء الحدثاء المتنفرین من العقلاء الامناء،	ادھر اس ناتجربہ کار سردار نے ایسے بعض ناعاقبت اندیش، سفیہ، جاہل اور بزدل افراد[۲] کو امیر لشکر بنا دیا، یہ لوگ دیانتدار عقلمندوں سے متنفر تھے۔
لم یلتبسوا بالملحمۃ وحربا، ولم یعلموا سوا الطعام وضربا،	انہیں نہ تو میدان کارزار ہی سے کبھی واسطہ پڑا تھا اور نہ کبھی شمشیر زنی اور

[۱] مولوی ابو سعید مستفتی فتویٰ نمبر ۲ مرتب سیل وحضرات دیگر ہا ۱۲

عملہ وناموس، وھو ھمّ عمُر،
قد ردّ الی ارذل العمر، وھو
فی الحقیقۃ لزوجہ وتامورہ
ماموراً، وکان عاملہ الذی
کان فی المعنی والیا غالبا،
للنصاری موالیا، فی حبہم
غالیا، ولمن عداھم
راسیا لعداھم مُبغضا قالیاً
وکذا عشیرتہ وبعض من
عشیرتہ الاقربین، من
سرایرہ وسرایرتہ یفعلون
ماشاؤن، ویعملون
بآرائہم وفی طاعتہ یُراؤن
وھو امرؤ لا یعلم امرا،
ولا یعمل الا امرا، ولا
یامر برائہ امرا، ولا
یفقہ خیرا ولا شرا، ولا

وہ خود ضعیف، غمزدہ اور ناتجربہ کار
تھا۔ عمر کی کافی منزلیں طے کر کے بڑھاپے
کی وادی میں قدم رکھ چکا تھا، اور سچ
پوچھئے تو آمر و حاکم ہونے کے بجائے اپنی
شریکِ حیات[1] اور وزیر[2] کا مامور و محکوم تھا
اس کا یہ وزیر جو حقیقت میں نصاریٰ کی کارپرداز
اور ان کی محبت میں غالی تھا۔ صحیح معنوں
میں حاکم و والی اور نصاریٰ کے دشمنوں کا
شدید ترین مخالف تھا۔ یہی اس آمر و
حاکم کے اہلِ خاندان کا حال تھا۔ ان میں سے
بعض[3] مقرب بارگاہ اور رازدار بھی تھے یہ سب کے
سب جو جی چاہتا تھا کرتے تھے۔ اپنی آراء پر عمل
پیرا ہوتے تھے لیکن اسکی اطاعت کا دم بھرتے تھے
اور وہ سردار ایسا ضعیف الرائے، ناتجربہ کار تھا
کہ کچھ جانتا ہی نہ تھا، اس سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد
ہوتی تھیں۔ کوئی کام اپنی رائے سے نہ کرسکتا تھا نہ اچھا
برا سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ نہ کسی کو خفیہ یا

[1] ملکہ زینت محل، [2] حکیم احسن اللہ خاں، [3] شہزادہ مرزا مغل وغیرہ،

ثم ان كلاً من الجنود المفرقة قد استعصوا من معسكرهم ومقامهم بعد الفتك بامرائهم وحكامهم، وقد تطرق الوهن والاختلال فى اعمال العمال، وتمشى فى امر الطرائق الفساد والفتن، واختلت الاوامر والامور، وهاجت من وجوه من الفساد بين العباد وشاع الفساد فى البوادى والبلاد، وهى امور،

پھر تمام "باغی" گروہ لشکریاں اپنی چھاؤنیوں سے، اپنے افسروں سے نمٹنے کے بعد چل کھڑے ہوئے۔ عاملوں اور حاکموں کے نظام درہم برہم ہو گئے راستوں کے امن میں خلل و فتور مخلوق خدا میں فتنہ و فساد اور دیہات و بلاد میں شور و شغب پھیل گیا طوفان حوادث جوش میں آگیا۔

فاتى كثير من الجيوش الى دار الملك دهلى التى هى مصر مشهور، وبلد معمور، ومثوى لجمع كثير من آل تيمور، فاقاموا بها من كان من قبل من بيتهم شيئاً له

بہت سے لشکر شہر مشہور، بلد معمور، مسکن آل تیمور، دارالسلطنت دہلی جا پہنچے وہاں پہنچ کر ان سب نے ایسے شخص کو سردار و پیشوا بنا لیا جو اس سے پہلے بھی ان کا امیر و حاکم[1] تھا جس کے پاس اس کے ارکان دولت اور دربار بھی تھے لیکن

[1] سراج الدین بہادر شاہ ظفر

باذاقة شحوم البقير والمسلمين
وهم قليل نزير، باذاقة
شحوم الخنازير، فانحرف
كل من الفريقين عن الطاعة
والانقياد، حفظا لما
لهم من الدين والاعتقاد،
فاخذوا يقتلون فريقهم،
ويقطعون طريقهم
ويغتالون طرخانهم و
بطريقهم، ومنهم من
اعتدى واساء، وارتكب
الفظاظة والقساء، فقتل
الولدان والنساء، فاستحق
الخذلان والهوان، من
اغتيال النسوان، واستوجب
الخزي والصغار، من قتل
الصبية الصغار،

گائے کی چربی، اور مسلمان سپاہیوں کو جو
تھوڑی تعداد میں تھے سور کی چربی چکھانے
پر زور ڈالا۔ یہ شرمناک روش دیکھ کر
دونوں فرقوں میں اضطراب پیدا ہو گیا
اور اپنے اپنے مذہب و اعتقاد کی
حفاظت کی خاطر ان کی اطاعت
و انقیاد سے منھ موڑ لیا۔ ان کے
اس اضطراب نے خرمنِ امن پر چنگاری کا
کام کیا۔ گروہ نصاریٰ کا قتل، ڈاکہ زنی،
ان کے سرداروں اور سپہ سالاروں پر حملہ
شروع کر دیا۔ بعض لشکری حد سے تجاوز کر گئے،
انھوں نے قساوتِ قلبی اور شوریدہ
سری کا انتہائی مظاہرہ کیا، بچوں اور عورتوں
کے قتل سے بھی دریغ نہ کیا۔ چھوٹے چھوٹے
بچوں اور بے گناہ عورتوں کی قتل و
غارتگری سے رسوائی و ذلت کے مستحق
بن بیٹھے۔

والاسواء كالافتتان
مع الحماد ورفع الحجاب
من العقائل والخواتين وطمس
سائر احكام الدين المحكم المتين
عمدوا امادئ بدء ومكائدهم
الى ان يركوا احودهم من مسلميهم
واهالهم عن رسومهم
قواعدهم ويصلوهم عن
اديانهم وعقائدهم لزعمهم
ان الحمود من الاحطال اذا
ارتضوا لاديانهم بالاندال
والاطال وتلقوا احكامهم
بالقبول والامتثال لا يكون
لسرهم مساغ ومحال للنكول
مخافة النكال والانكال،
فكلموا الاماله منهم وهم
جم غفير وجمع كثير

سے روکنا، شریف و پردہ نشیں خواتین
کا پردہ ختم کرانا پھر دوسرے
احکام دین متین کو مٹانا وغیرہ لئے

لیے مکر کی ابتدا اس طرح کی کہ سب سے
پہلے اپنے ہندو مسلم لشکریوں کو ان کے
رسوم و اصول سے ہٹانے اور مذہب
و عقائد سے گمراہ کرنے کے درپے
ہوئے ان کا گمان تھا کہ جب بہادر
لشکری اپنے دین کو بدلنے اور احکام
نصرانیت بجا لانے پر آمادہ ہو جائینگے
تو پھر دوسرے باشندوں کو
سزا و عقاب کے ڈر سے خود ہی مجال
انکار نہ ہو سکے گی۔

انھوں نے ہندو لشکریوں کو جو
تعداد میں بہت زیادہ تھے

من السنابل والغلات، و يعطوا نقودا بدل حقوق الحراث والزراع، لئلا يبقى لهولاء المساكين والدهاقين والحراكين خيرة تصرف فى الغلات بالبيع والابتياع، وان يستأثروا انفسهم ببيعها وشرائها، وان يكون لهم الخيرة فى ترخيص الاسعار وارخائها، فيضطر عباد الله احتكارهم، ويشتد حاجتهم اليهم وافتقارهم، ويلجئهم اضطرارهم الى تلقي ما يروم الانصار وانصارهم، الى غير ذلك مما فى قلوبهم من المنى والاهواء، وما تكن صدورهم من الفتن

ان غریبوں کو خرید و فروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح بھاؤ کے گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خدا کی مخلوق مجبور و معذور ہو کر ان کے قدموں پر آپڑے۔

اور خوراک نہ ملنے پر ان نصاریٰ اور ان کے اعوان و انصار کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔

ان ترکیبوں کے علاوہ ان کے دل میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے

ان اختلاف الملل في الاديان
والملل من اقوى العلل لتطرق
الخلل في بقاء التسلط والعمل
وحدوث الحول في الولايات
والدول محل واكل حل و
بل لوا كل جهد لرفع هذا
الاختلاف باستدلاع الحيل
فسعوا لتعلم الاطفال والاغفال
وتلقينهم كتب لسانهم ودينهم
في القرى والبلاد مدارس
وصيّروا معالم العلوم والمعارف
والمدارس والعهود التي سبقت
في العهود السوالف دوارس
وقدّروا ادقّروا ان
يقدروا على هؤلاء الاستانات
في المآكل والاقوات بان
ياخذوا كل ما يخرج من الاصل

انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی میادیر
حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف تسلط وقبضہ
کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اور
سلطنت میں انقلاب پیدا کردے گا
اس لئے پوری جانفشانی اور تن دہی کے
ساتھ مذہب وملت کے مٹانے کے لئے
طرح طرح کے مکروحیلہ سے کام لینا شروع
کیا انھوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم
اور اپنی زبان ودین کی تلقین کے لئے شہروں
اور دیہات میں مدرسے قائم کئے پچھلے
زمانے کے علوم ومعارف، اور
مدارس ومکاتب کے مٹانے کی پوری
کوشش کی۔
دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقوں
پر تاوان اس طرح حاصل کیا جائے کہ یہ
شہر کے غلّہ کی پیداوار کاشتکاروں
سے لیکر نقد دام ادا کئے جائیں، اور

واستولوا على بلادها وثغورها،
واحاطوا باعجازها وصدورها،
وذللوا اعزة رؤسائها
بالاستقصاء، ولم يذروا
فيها من يبدى لهم قرنه
بالاستقصاء، هموا بان ينصروا
كلا من قطانها وسكانها،
ورؤسها ووجوهها واعيانها
ونبالها وارذالها واجلتها و
اذلتها، تنصيرا، ظنا بان
هولاء الضعفاء لايجدون
وليا ولا نصيرا، ولا يستطيعون
سوى الانقياد محيصا ومصيرا
ليصير الناس كلهم كمثلهم من
ملاحدة متوافقين على ملة واحدة
ولا يفترق فرقة من فرقة بان
يتدين كل بدين على حدة لتحيلهم

اور تمام ذی عزت اعیان کو ذلیل
و خوار کر کے ان میں سے ایک کو بھی اس
قابل نہ چھوڑا تھا کہ سر نافرمانی کو
جنبش دے سکے۔ انھوں نے تمام
باشندگان ہند کو کیا امیر کیا غریب
چھوٹے بڑے مقیم و مسافر، شہری
و دیہاتی سب کو نصرانی بنانے
کی اسکیم بنائی۔ ان کا خیال تھا
کہ ان کو نہ تو کوئی مددگار و معاون
نصیب ہو سکے گا۔ اور نہ انقیاد و
اطاعت کے سوا سرتابی کی جرائت
ہو سکے گی۔

یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سب لوگ انہی
کی طرح ملحد و بے دین ہو کر ایک ہی
ملت پر جمع ہو جائیں اور کوئی بھی ایک
دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے۔

من العلّام الاعلام،
روقالدرس منهم الدارس
وطمس علم العلم حتّى
من القرطاس والطرس
وذلك لواقعة فارعة
تركت الديار بلاقع، وجعلتها
لصوائب المصائب مواقع،
وامطرت على اهلها من
غمام الغموم صواعق و
صواقع، وفاقرة جعلت
الامراء فقراء صعاليك
والملوك اسرأ مماليك۔
من قصتها ان النصارى
الراطنة الاولى سموا صدّ
هم بالشماء الباطنة لعلا
ما تسلّطوا على ممالك الهند
واقطارها واوقارها وامصارها

علماء اعلام میں شمار ہوتا ہے۔
اس سے ان ظالموں کا مقصد لسان درس
وتدریس کو مٹانا اور علم کے حصہ کو بیخ گرانا
ہے، وہ صفحات قرطاس سے بھی نام ونشان
مٹانا چاہتے ہیں یہ سب کچھ اس حادثہ فاجعہ
(انقلاب ۱۸۵۷ء) کی وجہ سے ہوا ہے جس نے
آبادیوں کو ویران، اور مصیبتوں کی تیر زنی
کو نشانہ سا دیا ہے جس سے غموں کے
بادلوں سے کڑکتی ہوئی بجلیاں مصیبت زدگان وطن
پر گریں۔ اور ان پر بادشاہوں کو غلام و
قیدی، اور امراء کو محتاج و فقیر بنانے والی
محتاجی و ناداری مسلط کر گئی۔
یہ داستان الم اس طرح ہے کہ وہ ترلوی
نصاریٰ جس کے دل ممالک ہند کے دیہات
ولا دیر قبضہ، اور اس کے اطراف
واکناف و سرحدات پر تسلط کے بعد
عداوت و کینہ سے بھر گئے تھے،

وعاجز جازع فازع الی ربه
فازع، نزیع من اسرته
بالاسر یا لاسر نازع
الیهم نازع، قضی علیه بلا
مدّاع ومنازع، وسادم نادم
عادم، لکل منادم وخادم
فتّ فی اعضاده یا شتّا مصادم
ونجید فرید طرید عنّی مجلی
من ارضه وبلده، وکئیب
کریب غریب عنی فائی عن
اهله وولده، ضام ظلوم
وجباره وانئی
عنه اهله وجاره، وخلّی عنه
وعنهم وجاره، اسره فقسره
وکسره بکل ضرب من الایلام
لتصلّبه وتعصّبه فی الایمان
والاسلام، واشتهاره انه

جو اس وقت مجبور و عاجز ہے اور اپنے رب سے
لو لگائے ہوئے ہے۔ اپنے تمام اعزہ و
اقربا سے دور اور بہت دور ہے۔ مدعی
اور منازع کے بغیر اس پر فیصلہ صادر کر دیا
گیا ہے۔ وہ اپنے ہم نشینوں اور خادموں
کے سامنے شرمندہ ہے۔ اس کے
بازوؤں کو سخت تصادم سے کمزور
کر دیا گیا ہے۔ وہ غمزدہ، تنہا
اور دور افتادہ ہے۔ اسے اپنی زمین
و شہر سے جلاوطن اور اہل و عیال
سے دور کر دیا گیا ہے۔ یہ سارا ظلم و
ستم ظالم بدکیش نے روا رکھا ہے۔ اسے
اور اس کے اہل و عیال کو اپنی زندگی
کی جھاڑی میں چھوڑ دیا ہے۔ اسے قید
کر کے ہر ممکن مصیبت پہنچائی گئی ہے
اس کا قصور، صرف ایمان اور
اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنا اور

شجنوں فی مصائق سجون،
ھی مجامع فتن حون،
ومحبس متنفس من الخلاص متأیس
نظرا الی حکم محبس عطف القلب
محبس نکد من رحمۃ ربہ لیس بیئوس
عریر سلس صحیح بولس فی اسر
سر بولس وجائر جائر بانو تعس
من ظلم جائر جائر نکس شرس
ونائس انس مھی بسبب لایدرک
ینتہی الیہا قیاس قائس ومعتو
معتر مصطر فتن باس اختنا
واحتباس فی اسر اسیر سود
الکبد ازرق عباس احصب
الشعر متلون لباس
حتی رده عما کان له
من لباس، وکساه
احسن کساء وکنا باس

ایسے تنگ وتاریک قیدخانوں میں ڈال دیا
ہے جو سیاہ فتنوں کے مرکز ہیں۔
وہ محبوس و حزیں سخت دل، اکتا گئے
اور ظالم افراد پر نظر کرتے ہوئے اپنی رہائی
سے مایوس ہے مگر اللہ کی رحمت سے ناامید
نہیں ہے، وہ ایک سیدھا سادھا نرم خو
اور مریض و کمزور ہوتے ہوئے ستم پرور تند
فطرت کی قید میں ہے اور ظالم و جابر،
بد خلق و بد کردار کے مظالم سے حیران و پریشان
ہے وہ آفت رسیدہ، ایسے مصائب میں
مبتلا ہے جن کی سختیوں تک قیاس کرنے
والے کا قیاس نہیں پہنچ سکتا اور ایسا مضطر
و ممتحن ہے جو سخت عذاب و احتباس
میں گرفتار ہو چکا ہے وہ سفید رو، سیاہ دل،
متلون مزاج، ترش رو، کبھی آنکھ گندم گوں
بال والو کی قید میں آ چکا ہے جس کا اچھا عمدہ لباس
اتار کر موٹا اور سخت لبادہ پہنا دیا گیا ہے۔

الاشدّاء الرحماء، سیما الخلفاء
الخلفاء، سلّم الله وبارک علیه
وعلیهم ما سبّح الملك فی الفلك
والسّماء، وسبح الفُلك فی الفلك
والدأماء، وبعد
فانّ کتابی هذا کتاب اسیر
کسیر حسیر علی مافات منه حسیر
مبتلی بکل عسیر لایطاق ولو
فی آن یسیر، منتظر لفرج علی ربه
یسیر، ومکبول مخبول، واقع
فی احبول، علی الذی عنه والسعد
من بدء فطرته مجبول، یرجو
النّفس من کربه من نفس
ربه بدعاء مقبول ومحبوس
فی باس بئیس بُوس، وکل الی ظلوم
عبوس، عرّاه عما کان له من رئیٍّ
وزیٍّ وملبوس، وابتلاه بشجون

کریم اولاد پر اور اسکے عظیم المرتبہ، شدید ورحیم
اصحاب پر خصوصًا پاکباز وصاف باطن خلفا
پر۔ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ان سب پر نازل
ہوں جبتک فرشتے آسمان پر تسبیح وتہلیل کرتے
رہیں اور کشتیاں سمندر میں تیرتی رہیں۔
میری یہ کتاب، ایک دل شکستہ، نقصان
رسیدہ، حسرت کشیدہ، اور مصیبت زدہ
انسان کی کتاب ہے۔ جو ایک تھوڑی سی
تکلیف کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ اپنے
رب سے جس پر سب کچھ آسان ہے مصیبت
سے نجات کا امیدوار ہے۔ جو ابتداء عمر سے عیش
وفراغت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود اب
محبوس واسیر ظلم اور تباہ شدہ ہے۔ اور مقبول
دعاؤں کے ذریعہ خدا سے ازالۂ کرب کا طالب ہے۔
وہ بڑی مشکلات میں مبتلا اور ترش رو ظالموں کے
ہاتھوں میں گرفتار ہے۔ ان ظالموں نے اسے اچھے
لباس سے معرّا کرکے غم وحزن کی وادیوں اور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ عظیم الرجاء،
للاعداء من دون الاحباء،
من السلوی والبلی والسلاء،
وایلاء حسن السلام، وایتاء
الآلاء، لمن دعاہ باسنی الاسماء
لاسیما لمن ظُلم واصطفی
عند الابتلاء بالاسواء
والادواء،
والصّلوٰۃ علی سید بشیر نذیر
بسم سماء الاسماء، المرجیّ
شفاعته لدفع البلایا والادواء،
وکشف ظُلم ظلم الاعداء،
والشفاء من عضال الداء،
ووبال الشقاء، وکلّ البحاء
النقباء الکرماء، وتھجد العظماء

تمام تعریفیں اس خدائے برتر کے لئے ہیں جس
سے بغیر کسی ناامیدی کے محنت و آزمائش،
کمی و بوسیدگی، اور غم و تکلیف سے نجات
دینے کی بہت بڑی امید وابستہ ہے۔ اور جو اسے
اسکے اعلیٰ نام سے پکارے اسے بہترین عطایا
اور بیشمار نعمتیں عطا فرمانے والا ہے بالخصوص
مظلوم و مضطر کی، اسکی مصیبتوں اور بیماریوں
میں سننے والا ہے۔

سلام ہو اس خوشخبری سنانے والے
اور ڈرانے والے پر جسکی تمام ہی نوید مسرت
آمد سے آئے بلاء و وباء کے دور کرنے،
دشمنوں کے ظلم کے پردے چاک کرنے، بڑی
بدبختی اور سخت بیماری سے نجات دلانے کی،
گنہگاروں اور سیہ کاروں کو اسکی شفاعت سے
بڑی امید ہے سلام ہو اسکی تشریف و تکریم

ناسہ جہاد

الثورۃ الہندیہ

باغی ہندستان

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دردانگیز تاریخی واقعات، مجاہدین کی جلاوطنی
حبس دوام، عبور دریائے شور، مردوں عورتوں اور بچوں کا قتل عام
(انگریزی مظالم کی دل ہلا دینے والی خونی داستان)

مؤلف
مجاہد جلیل علامہ فضل حق خیرآبادی
(وفات ۱۲۷۸ھ جزیرہ انڈمان میں)

مترجم
مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی

طابع و ناشر
مولوی محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور

بار اول ۱۹۴۷ء قیمت مجلد ۹

آگرہ و متھرا و بھرتپور و الور و نواحی آں بسیار اشتداد داشت حالا بفضلہ سبحانہ تخفیف است والحمد للہ۔

امروز روز پانزدہم است کہ برخوردار نور الابصار مولوی عبدالحق سلمہ اللہ تعالیٰ نزد من رسیدہ اند چوں مہاراؤ راجہ بہادر از چندے رونق بخش راجگڈھ دوازدہ کروہے الور اند و ہنوز معاودت نکردہ اند ملازمت برخوردار صورت نہ بستہ است در اینجا شغل تدریس بیشتر است شانزدہ سبق می شود مولوی نور احمد صاحب افق المبین مع حاشیہ واعزاز جان مولوی عبدالقادر شرح اشارات و محاکمات و شرح قاضی مع حاشیہ میخوانند فہم درست دارند۔ برخوردار مولوی عبدالحق نیز سہ چہار سبق داشتہ دیگر بجز تمناچہ نویسم لازمہ محبت آنست کہ در ماہ خطے متضمن حال خیر اشتمال خود حوالہ ڈاک بیرنگ کردہ باشند خطے کہ بر ڈاک بیرنگ مے یابد بیشتر میرسد و ہمیں جہت بندہ التزام کردہ است کہ بہمہ کساں خطوط بیرنگ میفرستم والسلام

راقم محمد فضل حق ختم اللہ لہ بالحسنیٰ۔ پنجم ذیحجہ ۱۲۷۲ھ روز پنجشنبہ

برخوردار مولوی عبدالحق و مولوی نور احمد صاحب و مولوی عبدالقادر سلام و تمنا میرسانند در بارہ لالہ بنسی لال حتی الوسع توجہ دریغ نشود۔

نقل خط

نامۂ گرامی خاتم الحکما، علامہ فضل حق خیرآبادیؒ

برخوردار اعز ارجمان سعادت و اقبال نشان سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد تحیہ و ثنا و دعا و تمنا مطالعہ نماید کہ مسرت نامہ بہجت افزا مورخہ ۱۳ ار جولائی وصول مسرت آوردہ مسرور نمود و ابواب انشراح و انبساط بر روئے خاطر وانستہ کشود و بدریافت صحت و عافیت آں برخوردار و شفایافتن والد ماجد آں برخوردار کہ برائے استعلاج رونق افروز بریلی شدہ بودند سپاس ایزدی بجا آوردم از مدتے حال مقر آں برخوردار معلوم نبود و ہمیں سبب ارسال مکاتبات صورت نبست حالا از نوشتۂ اعزی شفیق مولوی نور الحسن صاحب رونق افروزی آں برخوردار در سردہنہ بدریافت آمدہ حالا انشاء اللہ تعالیٰ مکاتبت خواہد ماند وبائے ہیضہ در اینجا ہم بشدت بودہ است حالا بفضل الٰہی رو بکمی آوردہ است در شاہجہاں آباد بزور و با اشتداد است او سبحانہ کہ دافع البلیات است ایں بلیہ از ہمہ عباد دفع فرماید بحرمۃ حبیبہ و آلہ الامجاد بدریافت ارتحال مولوی محمد حسین خانصاحب مرادآبادی دل بسخت تاسف شد او یگانہ یا مرد در حقیقت دریں زمانہ مغتنم بود دریں وبا امسال در تمام ہندوستان شیوع کردہ در

عکس

نامۂ گرامی خاتم الحکماء علامہ فضل حق خیرآبادیؒ بنام مولانا سلطان حسن خاں
صدر الصدور (عہد قاضی محمد جلیل ریئس بلی) مؤرخہ ۱۲۷۲ھ
عطیۂ قاضی موصوف الصدر جناب نواب صدر یار جنگ بہادر
مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی سابق صدر الصدور مملکت
حیدرآباد دکن، آنریری سیکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس،
صدر دار المصنفین اعظم گڈھ
رئیس حبیب گنج ضلع علی گڑھ

اسی کو پاکیزہ الفاظ میں یوں کہا جا سکے گا۔

لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبیّ مُرسل

فارسی شاعر نے خوب کہا ہے،

گم شدن در گم شدن دینِ من است

نیستی در ہست آئینِ من است

ان دو اشعار پر جو زندگی کی صحیح تصویر بھی ہو سکتے ہیں، اس بے کیف داستان کو ختم کرتا ہوں:

نالۂ ما صورتے بگرفت، بلبل ساختند ۔۔۔ لختہائے دل بہ یکجا جمع شد، گل ساختند
آنچہ کم از طاقتِ ما شد بہ تمکینش فزود ۔۔۔ صبر ما بردند و در چشمش تغافل ساختند

محمد عبد الشاہد خاں شروانی
شنبہ۔ یوم عید الاضحیٰ، ۱۳۶۵ھ
مطابق ۵ر نومبر ۱۹۴۶ء

حالِ دل ہمیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا

اللہ ری گم شدگی!

تمہ فریب نگاہ و دل کی ہیں تو اس حقیقت نے کھویا
وہیں تھی دراصل اپنی منزل قدم اٹھوتی جہاں کہ پہلے

پھر کیا اس حال کو سمجھانے والے نے کوئی سراغ لگایا؟

عشق کی تعبیر مشکل عشق کی تحریک سہل
وہ مجھے ہاتھوں کو کھو کر عمر بھر ڈھونڈھا کئے

اس منزل کی راہ پر پیچ و خم میں گم ہو جانا سب سے بڑی کامیابی ہے

ہاں اہلِ طلب اکوں شے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو کئے

یا دامع الفاظ میں اسے یوں سمجھائیے۔

ڈھونڈتی پھرتی تھی پہلے تری جلوے کو نظر
ڈھونڈتا پھرتا ہے اب خود ترا جلوہ مجھکو

اس کا نتیجہ کتنا مبارک نکلتا ہے اور پھر کس قدر خوش نصیب ہے وہ انسان جسے یہ مرتبہ حاصل ہو جائے سہ

اللہ اللہ یہ مرے حسن تصور کا اثر ـــ دل کے ہر گوشہ میں پاتا ہوں تری تصویر کو

میں نے واقعات لکھنے میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے اور صرف انھیں واقعات کو بیان کیا ہے جن کا اثر کچھ نہ کچھ زندگی پر پڑا ہے، علمی اور سیاسی پہلوؤں پر بھی کچھ روشنی ڈال سکا ہوں اور انھیں سے اہل علم کو دلچسپی ہو بھی سکتی ہے

بہ پایاں آمد ایں دفتر حکایت ہمچناں باقی
بصد دفتر نشاید گفت حسب الحال مشتاقی

نیکیاں اور بھلائیاں نامۂ اعمال میں تھیں ہی کہاں، جنھیں صفحۂ قرطاس پر پھیلاتا، نیکوں کے ساتھ اپنا بھی ذکر کر دیا تاکہ لوگ ان کے ساتھ اچھے الفاظ میں یاد کرلیں۔

کیونکہ ع نسبت بہت اچھی ہو اگر حال برا ہے

اچھوں کے ساتھ بروں کی بھی کھپت ہو ہی جاتی ہے۔

اگرچہ نیک نیم خاک پائے نیکانم
عجب کہ تشنہ بمانم، سفالِ ریحانم

البتہ اگر اپنی کوتاہیوں اور سیہ کاریوں کی طویل داستان لکھنے پر آؤں تو ایک کتاب نہیں کئی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں، مگر میں نہیں چاہتا کہ اپنے قصوروں کی عفونت سے آپ کے نرد تازہ دماغوں کو مکدر کردوں اور اپنی خرافاتِ زندگی سنا کر آپ کے پاکیزہ دلوں کو منغص بناؤں،

زندگی کے کچھ خوشگوار لمحات کبھی کبھی ایسے بھی گذر گئے ہیں کہ مجھے اپنا پتا بھی نہ مل سکا ہے۔

جناب میر نثار احمد مرحوم متولی آستانہ عالیہ خواجہ بزرگ اجمیر اور نواب حاجی
محمد غلام محمد خاں حافظی مرحوم کی عنایات بے غایات کا کوئی شکریہ ادا نہیں
ہو سکتا خصوصاً آخر الذکر کی توجہ و شفقت سے ہی مجھے نہ صرف اپنے لئے
بلکہ خاندان کے لئے صدقۂ جاریہ بنایا اور بغیر کسی کبر و غرور کے تحدیث نعمت
کے طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میرے اسلاف میں کوئی مجھ جیسا نہیں ہوا اس
لئے ننگ خاندان نہیں بلکہ فخر خاندان سا۔ اور یہ بھی خدا ہی کا فضل و احسان
ہے ورنہ خاندان اہل علم کے چشم و چراغ اکثر ننگ خاندان سے ہوئے ہر طرف
نظر آتے ہیں جس کے یہاں صدیوں سے علم و فضل کا چرچا تھا آج وہ جہالت
کے دریا میں غوطہ زن ہیں، مذہباً سنی حنفی ماتریدی ہوں اور مسلکاً چشتی نظامی
حافظی، تعصب و بدعت سے دور اور تکفیر و تفسیق سے نفور اور یہ راہ اسی
علم و تحقیق کی بنا پر اختیار کی ہے نہ کہ کورانہ تقلید کی وجہ سے موجودہ بزرگوں
میں، امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد اور نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا
محمد حبیب الرحمن خاں شروانی کی شفقتوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا اول الذکر
کا فیضان علمی و سیاسی اور آخر الذکر کا فیض اخلاقی و اصلاحی ہمیشہ مشعل راہ
ہدایت بنا رہے، خواجہ عبد المجید بیرسٹر صدر آل انڈیا مسلم مجلس رئیس علیگڈھ
اور مسٹر نثار احمد خاں شروانی وزیر زراعت یو۔پی کے معتمد متوسے اور
لطف و کرم بھلانے کی چیز نہیں،

علم وخلق، امتثالِ اوامر اور اجتناب نواہی، سیاست مدنیہ، تدبیر منزل، اور
تہذیب الاخلاق کی جان ہیں، خدا کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ ان بزرگوں کی
دعاؤں کی بدولت اس حکمتِ عملیہ سے بہرہ وافرہ ملا ہوا ہے۔

دنیا میں دوست مفقود ہیں، یہ بھی اللہ کا احسان ہے کہ مجھے ایسے دوست
ملے ہوئے ہیں جو میری طرح 'دامے' درمے' قدمے' سخنے ہر وقت اور ہر موقع
پر کام آئے ہیں اور آتے رہتے ہیں، انھیں میں سے، حاجی محمد عبدالجبار خاں
خیرآبادی، ماسٹر سید ابرار احمد رضوی علیگڈھی، اور مولوی سید نجم الحسن رضوی
خیرآبادی ہیں، مخلصین میں مسٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی بی۔ اے علیگ
نبیرۂ نواب صدر یار جنگ بہادر، اور مسٹر سید اختر بجنوری خلف ارشد
مولوی مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور سب میں ممتاز ہیں، مسٹر غلام جیلانی
خاں اعجاز شروانی بی۔ اے علیگ رئیس موہن پور، مسٹر عبدالصبور خاں
شروانی بی اے علیگ رئیس بھیکن پور، اور مسٹر انتصار احمد خاں شروانی
عہد طفولیت کے دوست اور ساتھی ہیں، ہر منزل پر بے تکلف اور ہمدرد اور ہر دکھ کے
شریک کار ہیں، مولوی محمد مطعم خاں شروانی رئیس قلعہ چھترہ کا خلوص و محبت،
اختلافِ مسلک سیاست کے باوجود قابل قدر ہے، سید عباس علی اجمیری بی اے
محترم المقام سید اسرار احمد سابق متولی آستانہ عالیہ اجمیر، اور مولانا محمد یونس
خطیب شاہجہانی مسجد اجمیر کا اخلاص و کرم ناقابلِ فراموش ہے۔ بزرگوں میں

اب ایک سال سے یعنی ۲۰ ستمبر ۱۹۴۶ء مطابق ۲۱ شوال ۱۳۶۵ھ سے لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے اورئینٹل اسسٹنٹ لائبریرین کے عہدہ پر فرائض منصبی انجام دے رہا ہوں لٹن لائبریری اپنے نوادر مخطوطات کی وجہ سے بڑی دولت کی مالک ہے مولوی سبحان اللہ خاں گورکھپوری مرحوم، مولانا عبدالسلام مرحوم، سر شاہ سلیمان الہ آبادی مرحوم، مولانا احسن مارہروی مرحوم، اور دوسرے اکابر کے کتب خانوں کے شمول نے اسے اور بھی اہمیت دیدی ہے، نواب صدر یار جنگ بہادر نے اپنا نادر الوجود کتب خانہ بھی اپنی وفات سے قبل ۱۳۶۲ھ اپنی وفات کے بعد مسلم یونیورسٹی میں ایک علیحدہ عمارت کتب خانہ کے عارضی بنڈسے ساکر منتقل کرنا تجویز کر دیا ہے۔ اس کتب خانہ کے شامل ہونے کے بعد لٹن لائبریری ہندوستان کا بے مثال مشرقی کتب خانہ بن جائے گی،

علمی خدمت انسان کے لئے بڑی سعادت ہے، والد ماجد و استاذ محترم کی مرضِ وفات میں تیمارداری و خدمت اور ان کی آخری پُرخلوص دعاؤں کی بدولت یہ بلند مرتبہ نصیب ہوا ہے کہ سنِ رشد کو پہنچنے سے پہلے ہی علما و صلحا کے فیوض برکات صحبت اٹھانے اور حصول علم دین میں اوقات گذارنے کا موقعہ ملا اور زندگی عیش و مسرت سے گذارنا نصیب ہوئی

استاد کی دعاؤں نے علمی خدمات کا موقعہ دیا، حلال رزق کے مواقع مہیا کئے رشوت بے ایمانی، جھوٹ اور ظلم و تعدی کے محکموں سے دور رکھا، خدمت

کے بعد ۵ ر جمادی الاول ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء کو رخصت ہوئی، مکان کے حادثۂ آتشزدگی کے ڈھائی ماہ کے بعد خدا نے کیمیا بنائی یعنی ۱۸ ر رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ مطابق ۲۷ ر اگست ۱۹۴۵ء بروز دوشنبہ بعد عشا، فرزند بلند اقبال عطا فرمایا، آثارِ خوش طالعی چہرہ سے ہویدا ہیں،

بالائے سرش ز ہوشمندی

میتافت ستارۂ بلندی

نیک فالی کے طور پر محمد مجاہد خاں نام اور جمال میاں اور رُشدی میاں خطاب رکھا گیا، مجاہد نہ صرف شاہد کا قافیہ ہی ہے بلکہ اس نے شاہد کو مفت میں "ابوالمجاہد" بھی بنا دیا ہے اور الاسماء تنزل من السماء کے مطابق فال نیک بھی ہے۔ خدا زندگی دے تو صاحبِ رشد و ہدایت اور محق و مجاہد بنائے، یہی انسان کی سب سے بڑی معراج ہے، صحت و تندرستی اور حسن و خوبی میں ہزاروں میں ممتاز ہے، اللّٰھم احفظہ من شر النوائب ذرا سی ترمیم سے محامد مجاہد خاں شروانی تاریخی نام بن جاتا ہے، شریک حیات عہدِ طفولیت ہی میں شفقتِ مادری سے محروم ہو چکی تھیں، سوتیلی ماں کے واسطہ نے درشتیٔ مزاج عادت ثانیہ بنا دی، ازدواجی رشتہ کے بعد بھی اس میں کمی نہ آسکی، جس کی وجہ سے گھر جنت تو نہ بن سکا مگر خدا کا شکر ہے کہ جہنم بھی نہ بنا ہمیں بس است!

توکل کا یہ منشا ہے کہ اطمینان پیدا کر
نہ ہو سامان کا پاسد یا ساماں پیدا کر

آزمائشوں کا مقصد انسان کا ثبات و استقلال دیکھنا ہوتا ہے خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میں اس امتحان میں کامیاب ہوا اور اُمید ہے کہ زندگی کے ایسے بیشمار حوادث کا جو قومی زندگی کے لوازم سے ہیں مقابلہ کرتا رہوں گا۔
سیاسی طور پر میرا مسلک بالکل صاف ہے استخلاص وطن و قوم کے لئے تمام ہندستان سے اشتراک و اتحاد اور غیر ملکی حکومت کی بیخ کنی و استیصال ، ہر آزادی خواہ جماعت سے تعاون اور ہر رجعت پسند گروہ سے بیزاری و تنفر ، ہر تحریک حریت کے ساتھ صف آرائی اور ہر تحریک تابعیت سے گریز پائی ، انگریز اور ہندستانی کے سوال پر پورا ہندستانی ، اسلام و کفر کے سوال پر پکا مسلم ، شیعہ سنی کے سوال پر ٹھیٹھ سنی ، یہی میرا مسلک ہے اور یہی سیاست ، یہی میرے خیر آبادی اساتذہ کا طریقہ تھا اور یہی میرا وطیرہ ،
مکان کی تعمیر کے بعد ہی میرا نکاح ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۵ مئی ۱۹۴۲ء بروز جمعہ ، مجھلے ماموں حافظ حاجی محمد عمران خاں شروانی بھیکم پوری کی بڑی صاحبزادی سے ہو چکا تھا مفتی عبد الحمید خاں شروانی بھیکم پوری اور مفتی لطف الرحمن خاں ڈھولوی شاہد تھے ، چار ہزار سکہ رائج الوقت مہر مقرر ہوا ، مولانا شاہ سید مصلح الحسن مودودی پھپھوندوی نے نکاح پڑھایا ایک سال

ختم کرنے کی کوشش کی اور چونکہ اس قسم کے واقعات پر ہمیشہ اسی طرح پردہ پوشی کا عادی تھا اس لئے ایک حد تک کامیاب بھی ہوا پھر بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے نہ صرف اس کے بلکہ اس کے علاقوں کے کارندوں تک کے اسلحہ ضبط کر لئے پولیس کی رپورٹوں میں بھی اسے آتشزدگی کے حادثہ کا ذمہ دار قرار دیدیا گیا اور اس کا خطرناک عادی مجرم ہونا تحریر کیا گیا، اب یو۔ پی کی قومی حکومت یعنی ہوم منسٹر مسٹر رفیع احمد قدوائی نے اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے، تحقیقات جاری ہے کیا عجب ہے اس کتاب کے طبع ہونے تک سارے مجرم کیفر کردار کو پہنچ چکے ہوں، نقصان کا اندازہ موجودہ گرانی کے پیش نظر کسی طرح بیس ہزار سے کم نہیں ہے بعض ممبران اسمبلی و کونسل بھی موقعہ کا معائنہ کر چکے ہیں صوبہ کے مشہور سراغرساں انسپکٹر دلیل سنگھ خفیہ سرگرم تفتیش ہیں کچھ مال مسروقہ برآمد کر چکے ہیں، بڑے بڑے انکشافات کی کی جلد توقع ہے۔

خدا شاہد ہے کہ اس حادثہ نے میرے دل کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا، اور میں اس بے سروسامانی میں بالکل اسی طرح مطمئن رہا اور ہوں جیسے سامان راحت کی موجودگی میں رہتا تھا۔ اور حسب ارشاد خداوندی واما بنعمۃ ربک فحدث کہہ سکتا ہوں کہ حضرت جلیل مانکپوری کے اس شعر کا مصداق ثابت ہوا:

ایک منظم سازش کے ماتحت مکاں میں مٹی کا تیل اور پیٹرول چھڑک چھڑک کر آگ لگا دی گئی، اساں، چھتیں، درو دیوار سبھی کچھ جلکر بھسم ہوگیا اسکے بعض ذمہ دار طلباء میں اس آتش زدگی میں خود بھی شریک موجود رہے اور اسی کے علاقہ کے بدمعاش یہ کام انجام دیے آئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس شیطان سیرت بحری کی اس رائے پر عمل نہ ہوسکا کہ بیرونی کمرے کی ان الماریوں سے آگ کی ابتدا کی جائے جس میں عربی، فارسی اور اردو کتابوں کا مطبوعہ و قلمی ذخیرہ بند تھا۔ آپ کو سنکر حیرت ہوگی کہ کتابوں والے کمرہ کے حصہ کے سوا مکان کا کوئی حصہ نہ بچ سکا، جب مجھے تار کے ذریعہ اس کی اطلاع ملی تو آستانہ خواجہ بزرگ پر اپنے ساختہ کتابوں کی حفاظت کی دعا کی اور بس، خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ کتابیں اور جانیں بچیں ورنہ ان ظالموں نے کوئی کسر اٹھا رکھی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ اگر میں مکاں میں ہوتا تو ملا قطب الدین شہید سہالوی والد ماجد استاذ الکل ملا نظام الدین سہالوی صاحب درسیہ نظامیہ کی طرح کتابوں کے ساتھ مجھے بھی جلا دیا جاتا۔ ملا صاحب کے عزیزوں نے بارھویں صدی ہجری میں شہید مار کر ہی کیا تھا۔ ان کی بعض تصانیف بھی مکاں کے ساتھ جل گئیں جس سے دنیا محروم رہی، سو اتفاق ہے اس جرم کے مرتکب میرے بھی کسی نہ کسی نوعیت سے خاندانی عزیز ہیں۔

اس واقعہ نے بڑی بڑی رقمیں ذمہ دار پولیس افسروں کو دیکر معاملہ کو

دوسرے سنگین جرموں میں سزا پاچکے تھے۔ دو تین قریبی اعزہ کے انتقال کر جانے سے یہ دس بارہ ہزار سالانہ کے منافعہ کا رئیس ایک لاکھ سے زیادہ کی آمدنی کا مالک بن گیا، یوں اور بھی کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا، منیجر نے جس کی صورت اس کی سیرت کی آئینہ دار ہے اس رئیس کو میرے خلاف بھڑکانا شروع کیا، اور اس کے لئے اس رئیس کے ایک قدیم مصاحب کو جو مکان کی جگہ نہ ملنے سے مجھ سے نالاں بھی تھا اپنے ساتھ ملالیا، اب ان دونوں نے ریشہ دوانی شروع کی۔ ادھر رئیس کی عوام پر زیادتیاں بڑھتی چلی جارہی تھیں، سقوں سے بیگار لینا، کاشتکاروں کے بیلوں کو زبردستی پکڑوالینا، خطاکاروں کو پہرے میں بند رکھنا (جسے حبس بیجا کہنا چاہیئے) شریف عورتوں کے مکانوں میں درّانہ گھس جانا، یہ اور اسی قسم کی بہت سی حرکتیں روزانہ سرزد ہونے لگیں، اپنے سیاسی مسلک اور انسانی اصول کی بنا پر خاموش کس طرح رہا جاتا، بعض پبلک جلسوں اور اخبارات میں اس کا ذکر کیا گیا، علیگڈھ کی ایک پولٹیکل کانفرنس میں حکام کو ادھر متوجہ کیا گیا، بعض اخبارات نے نام لے کر افسران بالا کو توجہ بھی دلائی،

میں رجب ۱۳۶۴ھ مطابق جون ۱۹۴۵ء میں ایک ہفتہ کے لئے اجمیر عرس میں چلا گیا، میرے متعلقین اپنی رشتہ داری میں سہاور و بھیکن پور چلے گئے مکان مقفل اور دروازے پر آدمی سورہا تھا کہ ۵ ار جون ۱۹۴۵ء کی شب کو

نام پر "ہادی منزل" نام رکھا "تائید رحمت مقصود ہے ہادی منزل" تاریخی مصرعہ
ہے جس کا پتھر بیرونی برآمدہ کے وسط در پر نصب ہے، اس جگہ کے دوسرے
لوگ بھی خواہشمند تھے اور مدتوں سے اس کے حصول کی کوشش کر رہے تھے،
نواب صدریار جنگ بہادر نے ان سب پر راقم السطور کو ترجیح دی تھی کچھ تو اس
وجہ سے اور کچھ یوں بھی کہ میرے جمہوری کوریں لیسپرا مالیے سے اہل علم
اور عزیز و عزیز رؤسا و اکابر کی آمد و رفت رہنے لگی، علمی اور ادبی مجالس کا
انعقاد ہونے لگا۔ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ میں نواب صدریار جنگ بہادر نے
سیرت و میلاد پر ہادی منزل میں تقریر فرمائی تقریب فاتحہ علامہ کیفی متاج
مشکوۃ میں آکر موصوف نے شوال ۱۳۶۱ھ میں شرکت کی، بزم مشاعرہ کی
نواب حاجی محمد غلام محمد خاں حافظی متولی مدرسہ عربیہ دادوں نے ربیع الاول
۱۳۶۱ھ میں صدارت کی، یہی وجوہ تھے جن کی بنا پر بعض اقتدار پسند پڑوسیوں
کی آتش رشک و حسد بھڑک اٹھی، ان میں سے ایک اتفاق سے ایک ایسی
رئیس کی ریاست کا منیجر بن گیا جو اپنی بد اطواری، جہالت "چابک سواری" اور
بدعنوانی کی وجہ سے پہلے ہی سے سارے خاندان اور نواح میں مشہور تھا،
پبلک اور حکام دونوں میں بدنام تھا، حکام ضلع نے دو بار اس کے اسلحہ بھی ضبط
کر لئے تھے جو بڑی بڑی سفارشوں سے مل سکے تھے، اس کے اکثر مصاحبین و
ملازمین اخلاقی جرموں میں سزا یافتہ تھے، بعض ملازمین تو آٹھ سال کی ڈکیتی اور

دادوں سے سبکدوشی کے بعد شوال ۱۳۶۳ھ میں، نواب صدر یار جنگ بہادر نے اپنے کتابخانہ حبیب گنج میں بلاکر بعض اہم خدمات سپرد کیں، ابھی پورا سال بھی ختم نہ ہو پایا تھا کہ میں ایک اچانک حادثہ سے دوچار ہوگیا۔

اجمیر سے واپسی اور مدرسہ دادوں میں تقرر کے بعد میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ایسی جگہ سکونت اختیار کی جائے جہاں سے علمی سہولتیں حاصل رہیں آبائی وطن بھاموں سڑک سے دور خام راستہ پر واقع تھا، بھموری خاندان شروانی کا مرکز اور قدیم مسکن تھا۔ یہ دو تین ہزار کی آبادی کا بڑا گاؤں سڑک کے بالکل کنارے واقع ہے۔ دو فرلانگ پر ندی بہتی ہے، ۴ فرلانگ پر حبیب گنج و بھیکن پور اور دو میل پر جانب جنوب دادوں اور اتنے ہی فاصلہ پر جانب شمال قصبہ چھرہ ہے جہاں اناج کی بڑی منڈی، تار گھر، اور لاری اور یکہ کا اڈہ ہے، تمام ضروریات زندگی وہاں سے پوری ہوتی ہیں، مویشیوں کا ہسپتال اور طبیبوں اور ڈاکٹروں کی پرائیویٹ دکانیں بھی ہیں، قصبہ دادوں میں مدرسہ عربیہ، تھانہ، اور شفاخانہ ہے، مدرسہ عربیہ دادوں اور کتب خانہ حبیب گنج کے قرب کی وجہ سے بھموری میں مستقل سکونت اختیار کرنا طے کیا اور نواب صدر یار جنگ بہادر سے معقول معاوضہ دیکر جامع مسجد سے متصل، ایک بلند اور ہوادار جگہ عمارت کے لئے حاصل کی، اور اس پر خام اور پختہ عمارت اپنی سہولت و ضرورت کے مطابق ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء میں تیار کرا کے پیر و مرشد کے

سات سال سے صدر مدرس تھے، بریلی، اجمیر، اور دوسرے مدرسوں کے صدر مدرس رہ چکے تھے، کہنہ مشق کی سایر درسیات میں پوری مہارت رکھتے ہیں، مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری مرحوم تلمید حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کے شاگرد اور مولانا سید سلیمان اشرف بہاری مرحوم سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے ہم درس اور استاد برادر ہیں، مولوی محمد شریف خاں مدرسہ دادوں ہی کے فارغ التحصیل اور اس کے سب سے پہلے طالب علم ہیں، فراغت کے بعد اسی مدرسہ میں مدرس ہو گئے تھے، ان دونوں کے استحقاق اور قدیم علاقہ کا بھی خیال نہ کیا گیا، ہمارے بعد مولوی غلام امام یونس بدایونی کو صدر مدرس بنایا گیا، وہ بھی دو برس میں تنگ آکر شعبان ۱۳۴۵ھ میں وطن چلے گئے، اب مدرسہ جس منزل سے گذر رہا ہے اس کا ذکر اوپر آچکا ہے، خدا مولوی سید مسعود علی کو ثبات واستقلال بخشے، کہیں وہ بھی بددل ہو کر کنارہ کشی اختیار نہ کرلیں، موصوف بھی اس مدرسہ کے السابقون الاولون میں سے ہیں، رامپور اور ڈابھیل سے سند فراغت حاصل کرکے کئی سال مدرسہ قادریہ بدایوں میں مدرس رہے، بعد جناب مولوی امین الدین چھروی کی رحلت پر دادوں بحیثیت مدرس ہوئے اور دو سال سے علمی خدمات انجام دے رہے ہیں، چار میل پر آبائی وطن ہے اور ڈیڑھ میل پر والد ماجد ملازم ہیں، اس لئے موصوف قرب کی بنا پر دادوں اقامت گزیں ہیں۔

انہماک سے باز رکھا ورنہ اب تک خدا جانے ریاست کی کس منزل پر پہنچ چکا ہوتا۔

مولانا کی وفات کے ایک ماہ بعد میں اجمیر سے خیرآباد پہنچا اور وہاں ایک ہفتہ رہ کر دادوں پہنچا اور مدرسہ عربیہ حافظیہ سعیدیہ ریاست دادوں ضلع علیگڈھ میں ۲۲ صفر ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء سے فرائض درس و تدریس انجام دینے لگا، سب سے پہلے سابقہ ہدایہ جلد ثالث، مسلم الثبوت اور تفسیر بیضاوی سے پڑا، ان کے علاوہ دوسری کتابیں بھی زیر درس رہیں، خدا کا شکر ہے کہ تین سال تک اپنی بساط کے مطابق، دیانتداری سے یہ فرض انجام دیا، اور اس درمیان میں متولی مدرسہ، ارکانِ کمیٹی اور طلبہ کو کسی تعلیمی و انتظامی شکایت کا موقعہ نہ ملا۔

متولیٔ مدرسہ نواب حاجی محمد غلام محمد خاں حافظی کا ربیع الاول ۱۳۶۲ھ میں انتقال ہوتا ہے اور قانونِ وقف نامہ کے مطابق واقف کے عمزاد بھائی مولوی محمد جان خاں رئیس دادوں متولی ہوتے ہیں، موصوف مدرسہ کا یہ سال کسی نہ کسی طرح پورا کرتے ہیں، تعطیل کلاں کے بعد جب مدرسہ کھلتا ہے تو مولانا محمد امجد علی اعظمی، مولوی محمد شریف خاں دادونی، اور راقم السطور کو مطلع کیا جاتا ہے کہ مدرسہ تنخواہوں کا اس قدر بار برداشت نہیں کر سکتا ہے اس لئے آپ کی خدمات سے محرومی پر افسوس ہے، مولانا محمد امجد علی اعظمی

دوران تعلیم و قیام اجمیر میں سیاست میں حصہ لینے لگا۔ اس سے عیرتی پر آمادہ ہونے پر تمام سرپرستیوں سے ہاتھ کھینچ لیا گیا اور بے تعلق کا اظہار کر دیا گیا، یہ بھی صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیا، اب وہ وقت آیا کہ عدالت کے کٹہرے میں حق تقریر پر مقدمہ چلا تھا ان کے متعلق مجھ سے پوچھا گیا۔ میں نے تمام باتوں کا اقرار کیا، اخبار انجام دہلی، احرار سہارنپور، اور معین اجمیر اس کے شاہد ہیں، آل انڈیا مجلس احرار اور جمعیۃ العلمائے ہند کے ماطماں سے لکھا کہ اس وقت جیل جانا مقصد میں شامل ہیں، ملاوجہ سدھ ہونے سے فائدہ نہیں ساں کا مطلب یہ تھا کہ اگر فیصلہ خلاف ہو تو دیپل کی جائے، مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی، چھ ماہ کی زبان بندی کا مجسٹریٹ نے حکم سنایا اور یہ چھ ماہ اس وقت ختم ہوئے جب حضرت الاستاد دنیا سے عالم آخرت کو روانہ ہو چکے تھے قدرت کا نظام تو دیکھئے کہ زبان استاد کے جلسہ تعزیت میں کھلی جو کانگریس کمیٹی کی طرف سے ٹاؤن ہال میں ۲ فروری ۱۹۴۲ء کو منعقد ہوا تھا میں ۱۹۳۹ء میں شہر کانگریس کمیٹی اجمیر، اور ۱۹۴۲ء میں صوبہ کانگریس کمیٹی راجپوتانہ کا ممبر منتخب کیا گیا، مجلس احرار کا ذمہ دار عہدیدار بھی بنا دیا گیا، جمعیۃ العلماء ہند کا رکن مرکزی بھی رہا اجمیر سے واپسی پر ایک سال تک احباب نے صدر مجلس احرار علیگڑھ بنا دیا، صوبائی اور مرکزی کی کرسیٔ بھی سر ڈالدی، نام و نمود سے نفرت اور علمی و تعلیمی مشغولیت نے سیاسی

سیاسی زندگی کا آغاز اجمیر ہی سے ہوتا ہے، مجلس احرار اجمیر عرصہ سے ختم ہو چکی تھی، ۱۰ ر فروری ۱۹۳۸ء مطابق ۸ ر ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ کو اس کا دوبارہ افتتاح ہوا۔ مجھے بھی اس کا رکن بنایا گیا، اس سے قبل میں انڈین نیشنل کانگریس کا باضابطہ ممبر بن چکا تھا۔ ۲۱ ر جنوری ۱۹۳۸ء مطابق ۱۸ ر ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ سے مستقل کھدر پہننا شروع کر دیا۔ دونوں جماعتوں کا رکن و ممبر بن جانے کے بعد سیاست میں عملی طور پر حصہ بھی لینا پڑا، اکثر تقریریں بھی سیاسی جلسوں میں کرنا پڑتیں، اس وقت فلسطین پر بڑا جبر و تشدد جاری تھا، جو واقعات ہندستان تک پہنچتے تھے۔ انھیں پڑھ پڑھ کر خون کھولتا تھا۔ یوم فلسطین کے سلسلے میں طبیعت پر قابو نہ رکھ سکا اور پوری باغیانہ تقریر جامع شاہجہانی میں کر ڈالی، اس سے قبل تین تقریریں اسی قسم کی خطرناک اور کر چکا تھا۔ بالآخر ۱۵ ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں کئی ہزار کی ضمانت اور مچلکوں پر رہائی ہوئی مقدمہ چلنا شروع ہوا مسٹر اختر حسین اسسٹنٹ کمشنر کی "عدالت" میں ۶ ماہ تک پیہم پیشیاں ہوتی رہیں، کئی کئی گھنٹے کٹہرے میں کھڑا رہنا پڑتا، تضیع اوقات کے سوا کچھ حاصل نہ تھا۔ یہ وقت میرے لئے بڑے امتحان کا تھا حضرت استاذ پاؤں سے معذور اور صاحب فراش تھے، حصولِ علم اور خدمت شیخ اولین مقاصدِ زندگی تھے، اُدھر سرپرستوں اور بزرگوں کا تقاضہ تھا کہ یہ لکھ کر گورنمنٹ راجپوتانہ میں داخل کر دیا جائے کہ

رقیمۂ وداد موصول ہوا' آں عزیز کی روانگی کے بعد جناب مولوی حکیم
احمد علی صاحب کا سعادتی خط موصول ہوگیا تھا۔ اس کا جواب بھی دے دیا
گیا کہ تعمیل ارشاد ہوگی۔ آپ کے جانے کے بعد پھوڑے کی تکلیف میں
فقیر مبتلا ہوگیا۔ اب تک اس کے شدید درد میں مبتلا ہوں پھوڑا گردن
پر نمودار ہوا ہے عمل جراحی بھی اس پر ہوگیا ہے آپ میری جانب سے
بالکل مطمئن رہیں میں جیسا آپ کی حضوری میں تھا ویسا ہی اب ہوں
آپ صرف اپنے شوق و اخلاص پر نظر رکھیں جس قدر شوق علم اور میرے
ساتھ اخلاص آپ کو ہوگا اسی قدر میری توجہ آپ کے حال پر ہوگی
غالب کیا خوب کہتے ہیں ؎

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
یہ دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

اس فلسفہ پر آپ غور کریں گے تو ہمیشہ مطمئن رہیں گے حق تعالیٰ آپ کو
دائم المرام کرے اور سلسلہ حیدرآباد کو آپ کے دم سے زندہ رکھے ہم تو
اب قبر میں پیر لٹکائے ہیں۔ آپ ہی جیسے ارباب شوق نوجوانوں سے بقاء
سلسلہ کی توقعات قائم کئے ہوئے ہیں والسلام فقط

فقیر معین الدین کان اللہ لہ دارالخیر اجمیر
(۱۳ رجب ۱۳۵۴ھ)

ایک دوسری غزل کا یہ شعر بھی پسند فرمایا۔

انگلیاں دور سے اٹھتی ہیں جدھر جاتا ہوں
دو قدم مجھ سے بھی آگے مری رسوائی ہے

فرمانے لگے داغ نے کہا تھا

ان کے در سے جب چلا خلقت تماشائی ہوئی
آگے آگے داغ، پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی

داغ کی رسوائی سے تمھاری رسوائی بڑھی ہوئی ہے۔ حضرت ریاض کے بعد نواب فصاحت جنگ جلیل مرحوم سے تلمذ کا شرف حاصل رہا۔

نہ صرف اردو بلکہ عربی اور فارسی میں بھی طبع آزمائی کرنے لگا تھا، اور اگر اجمیر نہ پہنچ گیا ہوتا تو خدا جانے یہ خبط کہاں لیجا کر چھوڑتا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ ایسے ماحول میں سات سال گذار کر اجمیر پہنچنے پر صرف طالب علم بن جانا اُستاد کی سب سے بڑی کرامت سمجھنا چاہیئے۔ اجمیر کی زندگی کے علمی و تعلیمی واقعات علامہ اجمیری کے تذکرہ میں ضمنی طور پر گذر چکے ہیں۔ استاد کے کرم کا حال اس پہلے خط سے معلوم ہو سکتا ہے جو موصوف نے میرے خدمت میں پہنچنے سے قبل میرے خط کے جواب میں لکھا تھا، اس نامۂ گرامی سے وفا، علم، ادب، ہمت، اور استقلال کے پہلو بھی معلوم ہو سکیں گے۔

"عزیزم صانکم اللہ تعالیٰ عن النوائب، وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شاعری سے اس درجہ دلچسپی بڑھی تھی کہ پہلے منشی مدر محمد خاں اختر حیدرآبادی
مرحوم کو استاد بنایا پھر لسان الملک، جام العصر حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم
سے استفادہ شروع کیا، مرحوم کیسی خوبیوں کے مالک تھے تقریبًا ۹ برس
کاس اور اس پر شوخی و ظرافت بلا کی، مجلس میں پہنچنے کے بعد اٹھنے کو جی ہی
نہیں چاہتا تھا جمعہ کا دن فرصت کا ہوتا تھا کئی گھنٹے خدمت میں حاضری
رہتی، پُر لطف قصّے آپ بیتی اور جگ بیتی بڑے مزے لے لیکر سناتے، غزل
پر صرف اصلاح دیتے بلکہ اشعار کی غلطیاں بھی سمجھاتے، کبھی کبھی فنی نکات
بھی بتلاتے اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی رہتی کہ کسی کو غلطیوں پر ٹوکنے کی
ضرورت نہیں، مرحوم کی وفات کے بعد الناظر لکھنؤ بابت جون ۱۹۳۵ء
و جولائی ۱۹۳۵ء میں میں نے موصوف پر مفصل مضمون لکھا تھا اس سے میری
نیاز مندیوں کا اندازہ ہوتا ہے، اور اب تو میخانۂ ریاض، نثر ریاض، دیباچہ
و مقدمہ ریاض رضواں، میں مرحوم پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، نگار کے
ریاض نمبر نے بھی کافی معلومات بہم پہنچائے ہیں۔

کوئی شوخ شعر غزل میں ہوتا تو بہت پسند کرتے، حیدرآباد میں آئے دن مشاعرے
ہوتے رہتے تھے میری ایک طرحی غزل کا حسب ذیل شعر دلچسپی سے کئی بار زبان سے
دہرایا ؎ دل کے وہ ارمان نکلے جو کبھی نکلے نہ تھے

خواب میں اچھے رہے، ہم خواب کی تعبیر سے

کی رہنمائی کرتے ہوئے پولیس کے ڈنڈے کھائے اور سڑک پر خاک و خون میں تڑپے، بوڑھا باپ، نوعمر بیوی اور صاحب اولاد بہنیں جیلوں میں زندگیاں بسر کریں، سامان و املاک ضبط و قرق کرائیں۔

پھر اس کہانی میں جواہر لال ہی کی آپ بیتی نہ تھی جگ بیتی بھی تھی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا ابو الکلام آزاد، گاندھی جی، موتی لال نہرو، تصدق احمد خاں شروانی وغیرہم جیسے اکابر ملک و قوم کی داستان ایثار و قربانی بھی تھی۔ ان کی تباہ شدہ زندگیاں دیکھ دیکھ کر کلیجہ شق اور جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا تھا سونے پر سہاگہ، شیخ حسام الدین بی اے امرتسری سابق صدر مجلس احرار اسلام ہند کی مترجمہ کتاب "انقلاب ۱۸۵۷ء" کا دوسرا رخ ثابت ہوئی، اس نے غیر ملکی حکومت سے نفرت پیدا کر دی، وحشیانہ اور بہیمانہ مظالم نے خون کھولا دیا، مولانا اجمیری کا فیض صحبت، اور ذہنی و عملی رحجانات اس پر مستزاد تھے، ان سب نے ملکر دل و دماغ کو پورا باغی بنا دیا وہ انسان جسے خیرآباد میں رہ کر بہترین کپڑوں، عمدہ جوتوں، بندوق، شکار اور شعر و شاعری سے بے پناہ شوق تھا اجمیر پہنچکر بندوق ساتھ اور سامان عیش مہیا ہوتے ہوئے بھی ایک مسکین طالب علم بن گیا، اب کپڑوں کے بجائے کتابوں کے جمع کرنے کا شوق دامنگیر ہوا، سیر و شکار کے بجائے مطالعہ کتب اور معائنہ حالات ملک میں وقت گذرنے لگا، خیرآباد کے قیام میں

حصول علم کا شوق، دوسری طرف سئی سیاسی امنگ، آخر کس کمال کے مدرسے اس کے آستانہ پر بھیجا دیا جو ایک طرف فضل و کمال میں یکتا اور دوسری جانب جادۂ حریت کا مجاہد تھا۔ اجمیر علمی اعتبار سے خیر آباد سے متعین اور طریقت کے لحاظ سے اس کے لئے مفیض تھا۔ خواجہ اجمیری سے محبوب الٰہی ہوتا ہوا شاہ سلیمان تونسوی سے سلسلۂ چشتیہ خیر آباد۔ اور علامہ فضل حق سے ٹونک ہوتا ہوا علم و فضل اجمیر پہنچا تھا۔

علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری کا تذکرہ علم و فضل مولوی حکیم ظفر حق اور مولوی حکیم حافظ احمد علی خیر آبادی سے اکثر آچکا تھا خود رجب ۱۳۵۰ھ میں اپنی آنکھوں سے اس سے بڑھ کر مشاہدہ کیا، مولانا کے دربار میں شعبان ۱۳۵۱ھ میں مستقل طور پر پہنچ گیا۔ مولانا کے تذکرہ میں اپنے قیام اور تعلیمی نظام کے متعلق مختصراً سب کچھ لکھ چکا ہوں، یہاں صرف اتنا کہنا ہے، کہ مولانا کی صحبت نے ذہنی طور پر کیا انقلاب کیا درمیان میں یہ بھی بتا دوں کہ رمضان ۱۳۵۵ھ میں مولانا کے ساتھ جب بمبئی قیام رہا تو میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کی میری کہانی کی دونوں جلدیں مع الاستیعاب پڑھیں شاہ صاحب کی تقریر کی طرح جواہر لال نہرو کی تحریر نے بھی مجھ پر بڑا اثر کیا، قوم و وطن کی آزادی کے صدقے میں سارا خاندان تباہی کے غار میں جا پڑا، ناز و نعمت میں پرورش پانے والا جواہر لال آتما کش، اس کی بوڑھی ماں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے سلسلے میں جلوس

آپ کے حق میں اور نیز اس کے حق میں صدق دل سے دعا کرتا ہوں میں
ان کے مضامین اور اشعار متعدد اخبار میں پڑھتا رہا ہوں لیکن اس علمائے
قابلیت کا مجھکو وہم و گمان بھی نہ تھا، جزاکم اللہ خیرا لجزاء وحفظکم
من کل البلاء والابتلاء ۔ آمین ثم آمین "

مولوی عبدالخالق بنگالی جو ندوہ لکھنؤ سے آکر مدرسہ نیازیہ میں داخل ہوگئے تھے، اچھے مقرر اور فٹبال کے بہترین کھلاڑی تھے۔ ان سے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے مقررین کی تعریفیں سننے میں آتی رہتی تھیں، اتفاق سے ۱۹۳۵ء میں مدح صحابہ کے سلسلے میں شاہ صاحب کا لکھنؤ آنا ہوا، اخبارات میں خبر آمد و جلسہ دیکھ کر میں بھی لکھنؤ پہنچا، احاطہ شیخ شوکت علی وکیل میں عظیم الشان جلسہ ہوا، ختم نبوت پر شاہ صاحب نے تقریر فرمائی، تین گھنٹہ تقریر کی، موصوف کی سحر بیانی نے کتنا مسحور کیا الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتا، دل میں تڑپ پیدا ہوئی کہ دنیا میں آکر انسان کوئی کمال تو پیدا کرے۔ تھوڑے زمانہ کے بعد پھر شاہ صاحب لکھنؤ آئے میں پروانہ وار پھر پہنچا۔ چوک کے پارک میں سیرت پر تقریر ہوئی، اس مرتبہ نہ صرف مسحور بلکہ دیوانہ بھی بنا دیا، تقریر کیا تھی آسمان سے انوار کی بارش تھی، دل کا ایک ایک گوشہ جذبات سے معمور ہوگیا، ذہن میں انقلاب پیدا ہوا، خاندانی رجعت پسندی میں، آزادی کے جراثیم پیدا ہوئے۔ ایک طرف

کافی رقم جمع کرکے نائب امیر شریعت بہار مولانا محمد سجاد اور دوسرے دردمند حضرات کو بھی۔ اخبار النجم، حقیقت وغیرہ میں میرے مضامین بہ حیثیت ناظم انجمن شائع ہوتے رہے، خیرآباد میں رہ کر شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہوگئی تھی مشاعروں میں طرحی غزل بھی پڑھتا، رسائل پیمانہ، انتخاب اور الناظر میں غزلیں اور شاعری سے متعلق مضامین بھی شائع کراتا رہا سرگذشت علیگڈھ میں بھی اکثر کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا، مرزا ابراہیم بیگ مرحوم بڑی محبت و شفقت فرماتے تھے، علیگڈھ آنے پر موصوف ہی کے یہاں قیام رہتا ۱۹۳۳ء میں نواب بہادر محمد مزمل اللہ خاں شروانی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میرٹھ میں جو خطبۂ صدارت پڑھا اس کا عربی ترجمہ کرکے ۱۰ دسمبر ۱۹۳۴ء کو مرحوم کی خدمت میں پیش کیا موصوف ہمیشہ کی طرح بڑی شفقت سے پیش آئے اور ۱۲ دسمبر ۱۹۳۴ء کو نواب حاجی غلام محمد خاں خاطلی مرحوم کو ایک خط لکھا جس میں میرے متعلق یہ سطور بھی تھیں یہ خط میرے پاس محفوظ ہے۔

"عزیز عبدالسمد خاں نے میرے خطبۂ کانفرنس کا عربی ترجمہ دکھایا میں سچ کہتا ہوں کہ میں اس ترجمہ کو پڑھ کر حیران ہوگیا اور میرے دل نے ہزارہا تحسین و آفرین کہیں آپ کے اس خیر جاری کو کہ آپ کی مدد اور توجہ سے ایک غریب دیہاتی عزیز اس قدر قابلیت اور لیاقت سے مستفیض ہوا ہے

سترہ سو سالانہ کی جائداد وقف کرائی۔ خیرآباد کے دو عالیشان مکان جو "حافظ منزل" کے نام سے مشہور ہیں۔ درگاہ کے مہمانوں کے لئے وقف کئے اور خود ان مکانوں میں آخر تک کرایہ دار کی حیثیت سے رہے، حافظ منزل کی رجسٹری پر میرے بھی دستخط ہیں مرحوم اچھے شاعر تھے، اردو کا دیوان شروانی پریس علیگڈھ میں ۱۹۴۲ء میں چھپ چکا ہے۔ فارسی کا کلام مرتب رکھا ہوا ہے۔

خاندانی قرابت وتعلق کی بنا پر میرا قیام حافظ منزل پر رہا، پیرومرشد کی حیات میں سیتاپور جو خیرآباد سے چار میل ہے جانا ہوتا رہتا اور زیارت کی سعادت سے بہرہ ور ہوتا۔ مدرسہ میں ۲۹ر ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۳ء بروز سہ شنبہ ایک طلبہ کی انجمن بھی قایم کی جس کا نام انجمن اشاعت الدین رکھا، ہر ہفتے خاص خاص موضوع پر تقریریں ہوتیں، خیرآباد کے اکابر اور ارکان مدرسہ کو بھی دعوت دیکر شریک کرتے، متولی مدرسہ اس کے نگراں مولوی منظور المحمود خاں رامپوری مدرس مدرسہ صدر، اور میں ناظم بنایا گیا تھا، انجمن کے لئے دارالمطالعہ علیحدہ قایم کیا جس میں کتابوں کے علاوہ، رسائل و اخبارات بھی جاری کرائے۔ اکابر اسلام کی تاریخ وفات پر مختلف مقررین ان کے حالات بیان کرتے، سالانہ محفل سیرت و میلاد بھی منعقد ہوتی جس میں باہر سے کسی اچھے مقرر عالم کو مدعو کیا جاتا۔

۱۹۳۴ء میں زلزلہ بہار کے موقعہ پر ہماری انجمن نے بڑا کام کیا خیرآباد سے

وہ تعلیمی سال ختم کرکے دوسرے سال ذیقعدہ ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں
نواب صاحب سے باضابطہ اجازت حاصل کرکے میں خیرآباد چلا گیا، یہاں
مدرسہ عربیہ نیاریہ میں مولانا حاجی محمد بشیر خاں رامپوری سے ۲ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ
مطابق ۱۹۲۹ء کو طالبیں، قطبی اور ہدیہ سعیدیہ شروع کیں، دیوان حماسہ
ادیب مدرسہ مولانا حافظ عزیز الرحمن مددی سے شروع کیا، میں تقریباً
سات سال تک خیرآباد رہا ان دونوں اساتذہ نے پوری دلچسپی اور شفقت
و توجہ میرے حال پر مبذول رکھی، ہمارے ضلع علیگڈھ واطنہ کے مشہور رئیس
نواب حاجی محمد غلام محمد خاں شیروانی حانقلی، ترک وطن کرکے آستانہ پیر و مرشد
پر اقامت گزیں ہو گئے تھے اولاد میں صرف ایک صاحبزادی تھیں ان کا
عقد اپنے عم زاد بھائی مولوی محمد جان خاں شیروانی سے کرکے میتاریاں
ہمر کے ساتھ جائداد بھی صاحبزادی کے نام کر چکے تھے اپنی زندگی تک کے
لئے دو ہزار روپیہ ماہانہ کی رقم قانوناً منظور کرالی تھی، ہر ماہ یہ رقم بھیج جاتی اور
موصوف خیرآباد کے اصحاب احتیاج اور آستانے کی ضروریات پر صرف
کردیتے، فیاضی کا یہ عالم تھا کہ آخر ماہ میں مولوی ظہیر احمد فاروقی متولی
مدرسہ نیاریہ اور مولوی حاجی معنی سید فخر الحسن سے قرض منگانے کی ضرورت
پیش آجاتی درگاہ میں بہت سی عمارتوں کے ساتھ ایک شاندار مطبخ خانہ بھی
۱۳۴۹ھ میں تعمیر کرایا، صاحبزادی صاحبہ سے درگاہ کی ضروریات کے لئے

خلیفہ اور نواب صاحب مرحوم کے پیر بھائی تھے، اسی نسبت سے کبھی دادوں آجاتے تھے، نواب صاحب کے والد ماجد نواب احمد سعید خاں مرحوم اور تقریباً پورا خاندان حافظ صاحب ہی سے بیعت تھا، مولانا نے اس پیرانہ سالی کے باوجود ہمیشہ تراویح مسجد پہنچکر پڑھیں اور رمضان میں پورا قرآن پاک تراویح میں سُنا، پابند شریعت اور متبع سنت تھے، وہ مجلس وغیرہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۱۸ ربیع الاول ۱۳۴۸ھ بروز شنبہ سرائے معالی خاں لکھنؤ میں آثار شریف میں وصال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ کچھ مذہبی تقریبات کے لیے آثار شریف کے لیے وقف بھی فرما گئے ہیں، ہر سال ربیع الاول میں موئے مبارک سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جگہ زیارت ہوتی ہے۔ بڑا ہجوم ہوتا ہے مجھے یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ دفن میں شریک ہوا اور آخری بار زیارت سے بعد وفات مشرف ہوا۔ میں اس وقت خیرآباد میں پڑھتا تھا، خیرآباد لکھنؤ سے پچاس میل ہے، اطلاع آنے پر کافی لوگ وہاں سے گئے انھیں میں، میں بھی تھا۔

میں شرح تہذیب، تاریخ الخلفاء، قدوری وغیرہا پڑھ رہا تھا کہ مدرسہ میں نیا انقلاب آیا۔ مولانا وجیہ الدین احمد خاں، رامپور تشریف لے گئے اور مولانا شاہ عماد الدین سنبھلی نے مسند صدارت، فتحپوری مسجد دہلی سے آکر سنبھالی،

ماسٹر سید مظہر علیم صاحب فریدآبادی مرحوم، پرائیویٹ سکریٹری نواب صاحب مرحوم سے انگریزی بھی شروع کردی تھی، عربی ترجمہ اور خوشخطی کی مشق مولوی حاجی محمد سلامت اللہ لکھنوی خلف استاذ العلماء مولانا مفتی محمد لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے جو شرف منزل پر (جو دادوں سے نصف میل پر واقع ہے) اقامت گزیں تھے وہاں شام کو جاکر کرتا رہا۔

اسی درمیان میں ایک مرتبہ قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین مولانا الحاج محمد ہادی علیخاں سیتاپوری رحمۃ اللہ علیہ محرم کے ایام میں نواب صاحب کی استدعا، واصرار پر دادوں تشریف لائے واقعات کربلا پر کئی تقریریں ہوئیں، کچھ اس انداز سے واقعات کی تصویر کشی فرماتے کہ سننے والے بے قابو ہوکر چیخیں مارنے لگتے، یہاں میں وہ اثر تھا کہ بچے، بوڑھے سبھی روتے روتے بے حال ہوجاتے، جب تک مولانا کا قیام رہا مواعظ و تقاریر کا سلسلہ جاری رہا، میں بھی اپنی نوعمری و کم علمی کے باوجود بڑا متاثر تھا، سیکڑوں آدمی مولانا سے بیعت ہوئے، تقریباً سارا مدرسہ ہی بیعت ہوگیا انہیں میں سے میں بھی تھا۔

مولانا کی عمر نوے سال سے متجاوز تھی، کرسی پر دوسرے اٹھاکر مجلس میں لاتے، دو چار قدم سے زیادہ نہ چل سکتے تھے اور وہ بھی دوسروں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر، حضرت شاہ حافظ محمد اسلم خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے

حشر ہو، اور جس طرح اس کی شاندار عمارت زاغ وزغن کا "آشیانہ" بن کر رہ گئی ہے، خدانخواستہ یہ تعلیم گاہ بھی بوم کی اقامت گاہ نہ بن جائے۔ اور غریب افرادِ خاندان جس طرح رؤسا کی باہم چپقلش کی وجہ سے شروانی اسکول کی تباہی پر انگریزی تعلیم کی سہولتوں سے محروم رہ کر جہالت سے ہمکنار رہے اس سرچشمۂ رشد و ہدایت اور چمن زار علم و معرفت سے بھی محروم ہو جائیں۔

ایک مرتبہ مولوی امین الدین صاحب نے (جبکہ ہم پہلی جماعت میں تھے اور جماعت میں سات طلبہ تھے) امتحاناً املا لکھائی، صرف میں ہی وہ طالب علم تھا جس کی کوئی غلطی نہ تھی، مولوی ابوظفر خاں جو مجھ سے بڑے لیکن اور سب ساتھیوں میں چھوٹے تھے ان کی ایک غلطی تھی باقی سب کی کئی کئی غلطیاں تھیں، اتفاق سے مدثر اللہ خاں ساکن دہناری اسی وقت داخل ہونے کے لئے آئے ہوئے تھے، وہ بڑے متعجب ہوئے اور اب بھی جب کبھی ملجاتے ہیں اس واقعہ کا ذکر کر لیتے ہیں۔ تین چار سال دادوں میں پڑھا۔ کبھی پڑھنے یا سبق یاد نہ ہونے کے سلسلے میں اساتذہ سے نہ پٹا جبکہ تقریباً روزانہ، ساتھی پٹتے رہتے تھے۔ یہ سب والد مرحوم کی توجہ کی بدولت تھا۔

مدرسہ میں حافظ قاری مولوی غلام محی الدین خاں پیلی بھیتی اور مولوی حفیظ الدین کربانی خیرآبادی مرحوم کا تقرر بھی ہو چکا تھا، اول الذکر سے مشقِ قراءت سال ڈیڑھ سال کی۔ ان دونوں استادوں نے بھی درسی کتابیں پڑھائیں

وقف کر دیا، پھر بھی اخراجات وسیع ہوتے گئے تو نواب صاحب کی ذات
کفیل بن گئی۔ نواب صاحب کا ۱۴ رمضان ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء کو مسلسل
علالت کے بعد انتقال ہو گیا تو ازروئے وقف نامہ مرحوم کے برادر خورد
نواب حاجی محمد غلام محمد خاں حافظی رئیس اعظم موہن پور وداودن مدرسہ اور
وقف کے متولی ہوئے، موصوف نے برادر گرامی کے نقش قدم پر چل کر
مدرسہ کی شان وعظمت کو داغ نہ لگنے دیا۔ موصوف نے ۱۴ ربیع الاول
۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء کو اپنے پیر و مرشد حافظ محمد اسلم خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ
کے آستانہ پر جان، جان آفریں کے سپرد کی اور وہیں پائیں میں دفن ہوئے
مرحوم کے بعد واقف کے عم زاد بھائی مولوی محمد جان خاں تین سال سے
متولی ہیں۔ آپ کے دور تولیت میں بعض وجوہ سے طلبہ سے زیادہ کمی تعداد
نہیں ہو سکی اور نہ آئندہ کوئی توقع نظر آتی ہے۔ وقف کی اس شرط کے
مطابق کہ جو موقوف علیہم حین حیات ہیں یا اولاد تک محدود ہیں ان کے
فوت ہونے پر وہ رقم نصف مدرسہ اور نصف مساجد و مسافران کی مد میں
شامل ہو جائے گی، کافی رقم مدرسہ کی آمدنی میں اضافہ ہو چکی ہے، اس طرح
تقریباً ایک ہزار روپیہ ماہانہ مدرسہ پر بڑی آسانی سے خرچ کیا جا سکتا ہے
مگر بظاہر نظر دو تین سال سے اس کا چوتھائی حصہ بھی خرچ نہیں ہوتا۔ اور
یہی لیل ونہار ہیں تو پورا اندیشہ ہے کہ شروانی اسکول چھرہ کی طرح اس کا بھی

محمد جان خاں شروانی رئیس داؤدن کی طرف سے کارندے تھے، بھاموں
کنوبی سے ایک میل پر واقع تھا اس لئے اکثر آمد و رفت رہتی اور ہر طرح ہم
سب کی دلدہی کرتے رہتے۔ موصوف نے برادر گرامی کو تو سیاق و حساب
سکھانا شروع کیا اور مجھے داؤدن لیجا کر مدرسہ عربیہ میں داخل کر دیا۔
۱۹۲۵ء میں جبکہ میری عمر دس گیارہ سال تھی میں نے عربی شروع کی۔ چونکہ مدرسہ
کئی ماہ پہلے شروع ہو چکا تھا اور طلبہ سال اوّل کا کافی نصاب ختم کر چکے تھے
اس لئے یہ صورت رہی کہ دن میں اسباق میں شریک رہتا اور بعد مغرب
مجھے اور مولوی حبیب الرحمٰن کنوبوی کو جو میرے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے۔
مولانا وجیہ الدین احمد خاں دروس الادب اور میزان الصرف پڑھاتے۔
نواب صاحب کو مدرسہ سے بڑی دلچسپی تھی، بڑے فیاض، سیر چشم اور
عالی حوصلہ انسان تھے، علماء کی بڑی عزت کرتے اور طلبہ کو گھر سے زیادہ
آرام پہنچاتے، رسہ کشی، بیت بازی، اور فٹ بال میچ وغیرہ کراتے رہتے
اور جیتنے والوں کو انعامات واکرامات سے نوازتے طلبہ کی ساری ضروریات
زندگی کا مدرسہ کفیل تھا، نواب صاحب کی داد و دہش مزید براں تھی ہندوستان
کے ہر گوشے سے طلبہ پہنچنا شروع ہو گئے۔ اساتذہ کے تبحر اور محنت و
شفقت نے مدرسہ کو اور چار چاند لگائے۔ دیکھتے دیکھتے دارالجہل خطہ،
دارالعلوم بن گیا۔ ایک بی بی صاحبہ نے چار پانچ ہزار سالانہ آمدنی کا

روتا ہوا پھر چوری ہلانے لگتا۔ اسی سعادتمندی کا یہ نتیجہ تھا کہ سکون کے وقت میرے حق میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعا کرتے۔

اسی درمیان میں نواب محمد ابوبکر خاں رئیس اعظم دادوں ضلع علیگڈھ نے اپنی جائداد میں سے ساڑھے سترہ ہزار کے سالانہ کی جائداد ۱۹۲۲ء میں وقف کی تھی اس میں اغراض، مساجد، مسافر اور فاتحہ بزرگان دین کے ساتھ ساتھ ساڑھے تین ہزار مدرسہ عربیہ کے لئے وقف کئے اور اس میں یہ شرط بھی رکھی کہ آفات ارضی وسماوی سے اس رقم وقف میں کمی آئے تو پہلے مدرسہ کی رقم کا لحاظ رکھا جائیگا اس رقم سے کچھ بچے گا تو حصہ رسدی تقسیم ہوگا۔ چنانچہ ۲۴ نومبر ۱۹۲۲ء کو مدرسہ عربیہ کا افتتاح دادوں میں کردیا گیا مولانا وحید الدین احمد خاں رامپوری اور مولوی امین الدین چھردی مرحوم نے درس تدریس کی ابتداکی، مولوی محمد شریف خاں، مولوی نور محمد، مولوی سید مسعود علی مولوی نظام الدین بستوی، مولوی رونق علی سہارنپوری، مولوی شمعون خاں اترولوی، حافظ عبدالرؤف علیگڈھی، مولوی محمد مسلم چھردی، مولوی محمد ابوظفر خاں چھردی وغیرہم "السابقون الاولون" کا درجہ رکھتے ہیں طلبہ میں سب سے پہلے یہی لوگ داخل مدرسہ ہوئے تھے۔

انہیں ایام میں والد مرحوم کا انتقال ہوچکا تھا ہمارے چھوٹے ماموں منشی محمد عبدالحمید خاں شروانی بھیکم پوری اس وقت موضع کھوتی میں مولوی

کی تعلیم کی خاطر پہلے مولوی عبدالصمد خاں پر دردی، اور پھر حافظ عبدالسلام خاں کناوی کو بلا کر رکھا، یہ دونوں بزرگ موصوف کے عزیز بھی تھے اس لئے ہم دونوں بھائیوں پر بڑی شفقت فرماتے تھے،

والد مرحوم کا خیال تھا کہ مجھے انگریزی تعلیم کے لئے مسلم یونیورسٹی میں داخل کرائیں اور برادر گرامی کو طبیہ کالج دہلی بھیجیں، اسی لئے ان کو عربی کی کتابیں شروع کرا دی گئی تھیں۔ اس معاملہ میں نواب بہادر سے مشورہ بھی ہو چکا تھا انھوں نے دونوں کے داخل کرانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ یہی منصوبے تھے کہ اچانک والد مرحوم بیمار ہوئے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ صاحب فراش ہو گئے، مجبوراً علاقہ سے بھاموں پہنچے۔ کچھ دن بعد کاسگنج جاکر مستقل علاج شروع کرایا۔ ہم سب لوگ بھی وہیں پہنچ گئے۔ بیماری نے دق کی شکل اختیار کر لی، کئی ماہ وہاں رہنے کے بعد جب اعزہ کو مایوسی ہوئی تو پھر بھاموں آگئے۔ مزاج پہلے ہی تیز تھا، اس مسلسل بیماری نے اور بھی مشتعل بنا دیا تھا۔ مجھے موصوف سے کچھ غیر معمولی محبت تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے اور دیکھنے والے بھی اب تک تذکرہ کر لیتے ہیں کہ میں مونڈھے پر چارپائی کے برابر بیٹھکر چوری سے کھیاں مارا کرتا تھا۔ ۹ سال کی عمر تھی، کبھی چوری کا بال اتفاق سے لگجاتا یا کوئی دوسری بات خلاف مزاج ہو جاتی تو چوری ہاتھ سے چھینکر مجھے اسی سے پیٹ ڈالتے۔ پھر بھی میں وہاں سے نہ ہٹتا، آنسوؤں سے

سالوں مقدموں کا سلسلہ رہا، ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا۔ امرودی اور پیڑنی چلے تھے، مقابلہ کیا اور ایسا کیا کہ سارے خاندان میں دھوم مچ گئی تیس چالیس سال گذر جانے پر لوگ آج بھی حیرت سے ذکر کرتے ہیں اور ہمت وجرأت کی داد دیتے ہیں۔ اس مقدمہ بازی میں سب سے بڑا سوال آن کا تھا، نواب بہادر عمر، دولت اور علم سب میں بڑے تھے، ان کی خواہش بھی تھی کہ سمجھوتہ ہو جائے، مگر ان کے دروازے تک جانا کون؟ آن جاتی رہتی اسی آن کے سوال نے مکمل بربادی کر دی، ریہ بار ہوئے اور اتنے کہ ساری جائداد گھر گئی۔

مقصد حاصل ہو چکا تھا اس لئے نواب بہادر نے رویہ بدلا اور صلح و صفائی ہو جانے کے بعد بہرا کے حصّے کو بڑی قیمت پر خریدا کسادہ میں بھی کچھ حصّہ تھا وہ بھی فروخت کرنا پڑا پھر بھی قرض سے چھٹکارا نصیب نہ ہوا موصوف کے انتقال کے بعد بھائیوں کی آبائی جائداد سیٹھ کستوری لال بھورے ساکن کاسگنج نے اپنے قرضہ کے بالعوض نیلام کرالی۔ نواب بہادر نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تو اشک شوئی کے لئے والد مرحوم کو اسی علاقہ کا عامل بنا دیا، چونکہ موصوف کے تعلقات و اثرات اہل علاقہ سے دیرینہ تھے اس لئے بڑی شان سے کام چلایا ۱۰ سال قیام رہا اس درمیان میں خاص شہر اپنی ہی کوششوں سے پرائمری اسکول جاری کرایا ہم دونوں بھائیوں

بھاموں کو دو سال کے لئے ہمیں چھوڑنا پڑا، والدمرحوم موضع پنہرا ضلع علیگڈھ میں، نواب بہادر محمد مزمل اللہ خاں کی جانب سے عامل و کارندہ بناکر بھیجدیے گئے تھے، اس موضع کے ساتھ اس نواح کا پورا علاقہ جس میں دس بارہ دیہات شامل تھے، موصوف کے سپرد کردیا گیا تھا۔ اس موضع میں موصوف پہلے زمیندار کی حیثیت رکھتے تھے، ہمارے نانا محمد محمود خاں شروانی بھیکن پوری کے ترکہ سے سسرال سے موصوف کو یہ حصہ ملا تھا۔

اس موضع کا ایک حصہ نواب بہادر کے پاس بھی آگیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ نواب بہادر نے سینکڑوں عزیزوں اور مسلمانوں کی جائدادیں اچھی قیمت پر خرید کر اغیار کے قبضے میں پہنچ جانے سے بچالیں اور اسی طرح سینکڑوں کو رہن رکھ کر قرضوں کے بار سے سبکدوش کردیا مگر اس بھلائی کے ساتھ یہ برائی بھی نہیں مٹ سکتی کہ جب موضع میں کسی طرح سے ذرا سا موقع پاؤں رکھنے کا مل گیا۔ اسے پورا ہضم کرنے کی کوشش کی دوسرے آفت رسیدہ حضرات کی طرح والدمرحوم بھی اس زد سے نہ بچ سکے۔ موصوف بڑے غصہ ور اور مشتعل مزاج تھے، لوگوں کا کہنا ہے کہ اس معاملہ میں وہ پورے پٹھان تھے۔ ذرا سی بات کا تبنگڑ بناکر نواب بہادر نے مقدمہ بازی کی ابتدا کردی، والدمرحوم کے علاتی بھائیوں کی (جو نواب بہادر کے خالہ زاد بھائی تھے) پوری مدد نواب بہادر کو ملی،

رہتے تھے اس لئے سیکڑوں اشعار یاد کرا دیئے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں
کے ساتھ گاؤں کے دوسرے غریب بچے بھی پڑھتے تھے، بعض لڑکے ازراہِ
شرارت اپنی ٹوپی میں کانٹے لگا لاتے تھے میانجی صاحب کے چپت لگانے
پر وہ کانٹے موصوف کی انگلیوں میں پیوست ہو جاتے پھر ان کی ڈنڈوں سے
کافی مرمت کی جاتی، کچھ عرصہ بعد میانجی صاحب اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے
اپنے وطن چلے گئے، ہم نے کچھ دن ظہور اللہ خاں صاحب کی چوپال کو مکتب
میں منشی محمد ادریس خاں سے بھی پڑھا، پھر ہم قصبہ بہادر ضلع ایٹہ اپنی خالہ صاحبہ
کے یہاں گئے تو والد مرحوم نے مولوی عبدالرزاق عرف کلّے مولوی صاحب
مرحوم کے سپرد کر دیا، دو تین ماہ وہاں پڑھتے رہے، ماموں آنے پر چونکہ
وہاں کوئی انتظام تعلیم نہ ہو سکا تھا اس لئے موصوف نے خود پڑھانا شروع کر دیا
غرض یہ ہے کہ رسم بسم اللہ کے بعد سے زندگی کے آخر لمحات تک دیہات
میں تعلیمی دشواریوں کے باوجود والد مرحوم نے ایسا کوئی دور ہم پر نہ گذرنے
دیا جس میں تعلیمی سلسلہ جاری نہ رہا ہو، ہم کہیں رشتہ داری میں جاتے تو وہاں
بھی اس سے پیچھا نہ چھوٹتا۔ ابتدا میں ایک بار میانجی صاحب کے پاس سے
بیساب کے بہانے سے میں گھر آکر روپوش ہو گیا، والد مرحوم کو پتہ چلا تو ایسی
مرمت کی کہ آج تک اس کی "لذت" یاد ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پھر
کبھی روگردانی کی ہمت نہ ہوئی۔

بھی شرفِ نیاز حاصل تھا، فارسی درسیات کی کتابیں انھیں ازبر تھیں، فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ساری عمر اسی شروانی خاندان کی تعلیم و تدریس میں گذاری، بڑے وضعدار بزرگ تھے، آخر عمر تک عیدین کی نماز پڑھانے بھاموں آتے رہے۔

والد مرحوم کو تعلیم سے خاصہ لگاؤ تھا، فارسی کی کتابیں اور احادیث کے اردو ترجمے ان کے پاس تھے۔ برادر گرامی منشی عبدالماجد خاں مرحوم کی رسم بسم اللہ بھیکن پور میں ہوئی، حافظ سید مہدی حسن نگینوی نے کرائی، جب میں اس عمر کو پہنچا تو آبائی وطن بھاموں میں میاںجی محفوظ علی بلرامی کو مکان پر رکھا میری بسم اللہ موصوف ہی نے کرائی، موصوف شاعر بھی تھے، فارسی و اردو دونوں میں کافی دسترس تھی۔ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، اکثر جمعرات کو ہر میل پیدل چل کر قلعہ ظفر منزل نواب بہادر محمد مزمل اللہ خاں مرحوم کے دربار میں کہا ہوا کلام جا کر سناتے، علاوہ داد و تحسین کے نذرانہ بھی پاتے، مجھ پر غیر معمولی شفقت فرماتے، خالق باری مجھے پوری حفظ کرادی تھی، قرآن مجید بھی حفظ کرانا شروع کر دیا تھا سورۂ بقر ہی حفظ کر پایا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا سال بھر میں چار بار موتی جھرہ نکلا، بعض مرتبہ سرسامی کیفیت بھی طاری ہو گئی۔ ایک سال بعد جب بیماریوں سے نجات ملی تو سورۂ بقر بھول چکا تھا۔ پھر اس سعادت سے محروم رہا میاںجی صاحب بیت بازی بھی کراتے

رہتے تھے اس لئے سیکڑوں اشعار یاد کرا دیئے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں
کے ساتھ گاؤں کے دوسرے غریب بچے بھی پڑھتے تھے، بعض لڑکے ازراہِ
شرارت اپنی ڈبیہ میں کانٹے لگا لاتے تھے میاں جی صاحب کے چپت مارنے
پر وہ کانٹے موصوف کی انگلیوں میں پیوست ہو جاتے پھر ان کی ڈنڈوں سے
کافی مرمت کی جاتی، کچھ عرصہ بعد میاں جی صاحب اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے
اپنے وطن چلے گئے ہم نے کچھ دن ظہور اللہ خاں صاحب کی چوپال کی مکتب
میں منشی محمد ادریس خاں سے بھی پڑھا، پھر ہم قصبہ سہاور ضلع ایٹہ اپنی خالہ صاحبہ
کے یہاں گئے تو والد مرحوم نے مولوی عبدالرزاق عرف کالے مولوی صاحب
مرحوم کے سپرد کر دیا، دو تین ماہ وہاں پڑھتے رہے، بھاموں آئے پر چونکہ
وہاں کوئی انتظام تعلیم نہ ہو سکا تھا اس لئے موصوف نے خود پڑھانا شروع کر دیا
غرض یہ ہے کہ رسم بسم اللہ کے بعد سے زندگی کے آخر لمحات تک دیہات
میں تعلیمی دشواریوں کے باوجود والد مرحوم نے ایسا کوئی دور ہم پر نہ گذرنے
دیا جس میں تعلیمی سلسلہ جاری نہ رہا ہو ہم کہیں رشتہ داری میں جاتے تو وہاں
بھی اس سے پیچھا نہ چھوٹتا، ابتدا میں ایک بار میاں جی صاحب کے پاس سے
پیشاب کے بہانے سے میں گھر آکر روپوش ہو گیا، والد مرحوم کو پتہ چلا تو ایسی
مرمت کی کہ آج تک اس کی "لذت" یاد ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پھر
کبھی روگردانی کی ہمت نہ ہوئی۔

خاں ولد گھاسی خاں کی ہمشیرہ، ان سے راقم السطور کے پدر بزرگوار
بدالواجد خاں مرحوم اور عم محترم محمد عبدالباسط خاں مرحوم تھے۔
نے ایک لڑکا محمد شاکر خاں اور ایک لڑکی یادگار چھوڑ کر ۶ر شوال سنہ ۱۳۵۸ھ
۱۸ر نومبر سنہ ۱۹۳۹ء بروز شنبہ راہِ آخرت اختیار کی۔ والد ماجد نے سنہ ۱۹۲۴ء
ن عالمِ شباب میں وفات پائی، ہم تین بھائی، اور ایک ہمشیرہ
ندگان میں چھوڑے، برادر گرامی منشی محمد عبدالماجد خاں شروانی مرحوم
لڑکا محمد ساجد خاں سلمہ اور دو لڑکیاں چھوڑ کر ۱۶ر رجب سنہ ۱۳۶۳ھ مطابق
جولائی سنہ ۱۹۴۴ء بروز شنبہ عالمِ جاودانی کو سدھارے، مرحوم مجھ سے
ر سال بڑے تھے، کُل ۳۳ سال اس سرائے فانی میں گذارے، برادر عزیز
محمد زاہد خاں شروانی کی تعلیم مشکوٰۃ شریف، شرح وقایہ، قطبی تک ہی پائی
تھی کہ اختلاجی امراض نے آگھیرا، علاج و معالجہ کے باوجود دماغی کمزوری
نے ساتھ نہ چھوڑا، تعلیم کو خیرباد کہہ کر سیاست کی طرف مائل ہیں، دو سال
مجلس احرار اسلام صوبہ دہلی کے سکریٹری رہے اب مرکزی اور صوبائی ممبر
اور ایک روزنامہ کے چیف ایڈیٹر ہیں، ہمشیرہ عزیزہ کا عقد نکاح منشی
محمد عبدالمجید خاں شروانی بھیکن پوری سے ۱۳ر دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء مطابق ۹ر شوال
سنہ ۱۳۵۶ھ کو ہوا، اس وقت دو بچے حسن رشید خاں اور محمود رشید خاں سلمہما
گھر کی رونق بنے ہوئے ہیں میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ خاندان افغانی

کاشتکاروں کو دغا، اکا ڈھونگ رچاکر موروثی زمینوں سے محروم کردیا
اور سیکڑوں کی زمینوں پر جبرًا قبضہ کرلیا، وہیں اسی طبقے کے ایک فرد نے
جن کی زمینداری موضع مذکورہ میں ہے حکام سے سازباز کرکے غریب افراد
خاندان سے یہ زمین نکال لی اور اپنا مالکانہ تصرف کرکے انہیں موروثی کاشتکار
کی حیثیت دیکر لگان قایم کرالیا، اور اس طرح کئی سو سالہ قدیم جائداد سے
انہیں محروم بنا دیا ساتھ ہی یہ جرأت بھی قابل لحاظ ہے کہ دینی مدرسہ اور
وقف سبیل اللہ کے متولی ہوتے ہوئے سودی ڈگریاں وصول کیں، انا للہ وانا
الیہ راجعون!

واحد خاں کے بھی چار لڑکے ہوئے حسن علی خاں، نظام خاں، مردان خاں
اور محسن خاں، ان چاروں کی نسل موضع نعاموں میں موجود ہے، محسن خاں
کے دو بیٹے ہوئے ایک عبد الوحید خاں۔ جو لاولد فوت ہوئے، دوسرے ہمت
خاں، ہمت خاں کے عنایت حسن خاں، ان کے عبد العزیز خاں، عبد العزیز
خاں راقم السطور کے جد امجد نے دو شادیاں کیں، ایک نواب بہادر سر محمد
مزمل اللہ خاں رئیس بھیکن پور کی حقیقی خالہ جن سے، عبد الواحد خاں،
عبد الجلیل خاں، عبد القدیر خاں مرحوم، عبد الکبیر خاں مرحوم اور ایک صاحبزادی
ہوئیں ان میں سے کسی کے اولاد نرینہ نہیں، اول الذکر تینوں بزرگوں سے
ایک ایک صاحبزادی ہیں جو خدا کے فضل سے صاحب اولاد ہیں، دوسری

جاری ہوا، موجودہ خاندانی دیہات میں کھموری اور کناوہ کو قدامت حاصل ہے، جاٹوں اور گسائیوں وغیرہم سے زور آزمائی کر کے بہیں سو زمینداریوں پر شروانیوں نے قبضہ کیا ہے[۱]۔

اس خاندان میں نواب محمد یوسف خاں شروانی بڑے دبدبہ و سطوت کے بزرگ گذرے ہیں، راجمو ضلع علیگڑھ (جو اب علاقہ نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں شروانی مرحوم میں شامل ہے اور جس میں اب خاندان کا کوئی فرد زمانہ دراز سے سکونت پذیر نہیں ہے) ان کا مستقر تھا ان کے چار بیٹے تھے، رحمت خا کی نسل منقطع ہوئی، حسن خاں سے کنوبی، کناوہ، اور بوڑہ گاؤں کا سلسلہ چلا۔ محمود خاں سے سلسلۂ بلونہ، انھیں کی نسل میں فخر خاندان تصدق احمد خاں شروانی مرحوم اور نثار احمد خاں شروانی وزیر زراعت یو۔پی ہیں۔ چوتھے لڑکے محمد خاں سے بھاموں کا سلسلہ چلا جس کا ایک گمنام فرد یہ راقم السطور ہے اس نسل میں مورث اعلیٰ واحد خاں ہوئے، انھوں نے بھاموں سے متصل ایک موضع واحد پور بھی اپنے نام سے آباد کیا، اس موضع کی کئی سو بیگہ زمین ۱۹۴۲ء تک اہل خاندانِ بھاموں کے لئے شاہی زمانے سے معافی کے طور پر چلی آرہی تھی۔ اس جنگی دور میں جبکہ قانون برائے نام رہ گیا تھا اور سرمایہ دار طبقہ نے حکام کو اپنے سرمایہ کے زور پر مطیع بنا رکھا تھا جہاں ہزاروں

---

[۱] مصنف علیگڈھ بابت جنوری ۱۹۴۷ء

مصاحات کا نرخ کیا، عہد اکبری و شاہجہانی میں کچھ لوگ اضلاع علی گڑھ اور ایٹہ میں آکر آباد ہوئے۔ کچھ حضرات پنجاب چلے گئے ریاست مالیر کوٹلہ (پنجاب) کے دربار سے وابستہ ہیں، نواب والا جاہ کی رفاقت میں کچھ لوگ مدراس پہنچ گئے جن کا سلسلہ اب تک وہاں جاری ہے۔

علیگڈھ اور ایٹہ کے نواح میں آباد ہونے والے سب سے پہلے بعہد اکبری ۹۶۳ھ مطابق ۱۵۹۶ء میں موضع رجپوتی میں آباد ہوئے (جو اب ویران کھیڑا ہے متصل جونی موضع بہادرپور حال زمینداری ریاست لوڈھہ گاؤں قریب نیم ندی، ندی سے غرباً واقع ہے) رجپوتی سے یہ لوگ بیجوی آئے، یہاں زمینداریاں پیدا کیں،

سب سے پہلے ہندستان میں تین حقیقی بھائی غلزئی، لودھی اور سروانی آئے، جب لودھیوں کو سلطنت مل گئی تو سروانیوں کو بھی عروج ہوا، نواح علیگڈھ وایٹہ میں آنے والوں میں محمد میر اور محمد مغیث دو بھائیوں کا نام معلوم ہو سکا ہے۔ محمد میر کی اولاد دتاؤلی، پرورہ وغیرہ جاگیرسی محمد مغیث کے تین لڑکے ہوئے سالار دین، رکن الدین اور بہاؤالدین سالار دین کی اولاد کھوری، بھیکن پور، نڈولی، کوئی، بھاموں، کسادہ ڈھولنہ وغیرہ میں آباد ہوئی اور سار دھول کہلائی، سار دھولی سلسلہ میں بارہ گاؤں آتے ہیں گھوبہ، بھرسولی وغیرہ میں بقیہ دونوں بھائیوں کی نسل کا سلسلہ

کا بھی تاریخ فرشتہ وغیرہ میں ذکر موجود ہے۔ لودھیوں کے زمانے میں
اعظم ہمایوں سپہ سالار افواج کا لقب ہوا کرتا تھا، ابراہیم لودھی کے زمانہ میں
اعظم ہمایوں ایک شروانی ہی تھے۔ بابر نے شہزادہ ہمایوں کے ولیعہد ہونے
کے بعد اس لقب کو موقوف کیا تھا، اکبر کے عہد میں خان زماں خاں لودھی
حاکم جونپور کی شکست کے بعد پیر محمد خاں شروانی جونپور کے صوبیدار مقرر ہوئے
علی گڑھ کا مشہور و معروف قلعہ جواب مٹ کر محلہ بالائے قلعہ کی شکل میں
تبدیل ہوگیا ہے عمر خاں شروانی وزیر سکندر لودھی کے لڑکے محمد خاں شروانی
نے ۱۵۲۵ء میں ابراہیم لودھی کے زمانے میں تعمیر کرایا، اور اپنے نام پر محمد گڑھ
نام رکھا۔ اسی قلعہ کو نواب ثابت خاں نے (جنھوں نے موجودہ جامع مسجد
علی گڑھ ۱۱۴۱ھ میں تعمیر کرائی ہے) ۱۷۱۵ء عہد فرخ سیر میں دوبارہ تعمیر اور
درست کرا کے ثابت گڑھ اپنے نام سے موسوم کر دیا، ۱۷۴۰ء و ۱۷۵۰ء کے
درمیان سورج مل جاٹ نے آگرہ و کول پر قبضہ کر کے قلعہ ثابت گڑھ کو
رام گڑھ بنا دیا، ۱۷۷۵ء میں نواب مرزا نجف خاں کے دور وزارت اور
شجاع الدولہ کے عہد تسلط میں اس رام گڑھ کو علی گڑھ کر دیا گیا اور اب قلعہ کے
بجائے شہر کا نام ہوگیا،

شیر شاہ کی چیرہ دستی اور بنگال میں سلیمان خاں اور داؤد خاں کے مقابلہ
نے سلاطین مغلیہ کا طرز عمل شروانیوں کی طرف سے بدل دیا، شروانیوں نے

اور یہی مولد و مستقرِ طفولیت بھی یہیں ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں محمد سے نصف صدی قبل یہ محرلِ فضل و کمال منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکا تھا۔
متعنا اللّٰہ بطول بقائہ

ان دونوں گرامی قدر ہستیوں کے بعد پروفیسر ہارون خاں شروانی کا نام بھی خاندان کو اجاگر کرنے والوں میں ملتا ہے موصوف نے مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی قابلیت سے کافی متاثر کیا ہے۔ موصوف ہسٹری کانگرس ۱۹۳۸ء میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور بعض اجلاس کی صدارت بھی کی، تمام دنیا کے تاریخ دانوں کا اجتماع ہوا تھا موصوف نے اسی سلسلہ میں دوسرے ممالک کا سفر بھی کیا، تمام حالات سفر کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

یہ شروانی خاندان ہندوستان میں کب سے آباد ہے اس کی صحیح تاریخ تو طلب مشکل ہے، البتہ لودھی سلاطین کے زمانہ میں اس کا تذکرہ بھی ملتا ہے بہلول لودھی ۸۵۵ھ میں بادشاہ ہوا ۸۹۴ھ میں وفات پائی، عمر خاں شروانی اس کے زمانے میں بااقتدار تھے، بہلول کے بعد سکندر لودھی کو تختِ سلطنت پر عمر خاں شروانی ہی نے بٹھایا تھا اور پھر اس کے وزیر بھی ہوئے عمر خاں شروانی کے علاوہ، اعظم خاں شروانی، بابو خاں شروانی، ابراہیم خاں شروانی جار خاں شروانی ہیبت خاں شروانی، احمد خاں شروانی، اور سعید خاں شروانی

ہیں، ایک مسٹر تصدق احمد خاں شروانی مرحوم بیرسٹر اور دوسرے نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شروانی سابق صدر الصدور مملکت دکن۔ اول الذکر نے اپنی قومی و وطنی خدمات کی بنا پر ملک بھر میں شروانی خاندان کو روشناس کیا، اور آخر الذکر نے اپنی تصنیفات و تالیفات علمی فضل و کمال، اور نایاب نادر الوجود کتابخانہ کی بدولت سارے ملک میں خاندانی وقار کو دوبالا کر دیا۔

فاضل مصنفین مصری مطبوعات کے دیباچوں میں بھی نواب صدر یار جنگ بہادر اور ان کے کتابخانہ کا تذکرہ و شکریہ ادا کرتے نظر آتے ہیں، جرمنی اور بغداد وغیرہما کو اس شروانی کتابخانہ کی کتابیں مقابلہ کے لئے جاتی رہتی ہیں، یورپین اور غیر ملکی سیاح و اہل علم اس کی زیارت کو آتے ہیں، اور اب تو ہندستان بھر میں تنہا آپ ہی کی ذات گرامی ہے جسے امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد سابق مدیر الہلال جیسا یگانۂ روزگار ادیب و انشا پرداز اپنی علمی۔ ادبی و تاریخی مراسلت و مکاتبت کے لئے منتخب کر چکا ہے "غبار خاطر" اور "کاروان خیال" دونوں مجموعۂ مکاتیب اس کے شاہد ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ اگر ایک طرف دادھیالی سلسلہ اول الذکر جیسے نامور فرد سے چند پشتوں میں ملجاتا ہے تو ننھیالی سلسلہ چھ پشت پر آخر الذکر جیسی ہستیٔ گرامی قدر سے ملتا ہے۔ ایک طرف اگر آبائی مسکن اول الذکر کے مسکن سے ملا ہوا ہے تو دوسری جانب مادری وطن خاص بھیکن پور ہے

ان آثار سے اتنا پتہ تو چلتا ہے کہ یہ خطہ، مجاہدوں اور غازیوں کا آماجگاہ رہا ہے۔
پھر ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں اس شرف سے کیسے محروم رہتا،
یہ دیہات شروانی خاندان کی آبادی کے لحاظ سے مرکز کی حیثیت رکھتے
ہیں تحصیل کاسگنج ضلع ایٹہ، اور تحصیل اترولی ضلع علیگڈھ میں یہ خاندان زیادہ تر
آباد ہے ان دیہات سے مشرقی سمت پر قصبہ سہاور ضلع ایٹہ تقریباً ۲ میل ہے
اور ریاست لوڈھا ضلع علیگڈھ بھی جانب مغرب اتنی ہی مسافت پر ہے اس چالیس
میل کے رقبے میں یہ شروانی خاندان آباد ہے اسی لئے اسے خطہ افغانستان
بھی کہدیا جاتا ہے جہاں جہاں اس نسل کے افراد سکونت پذیر ہیں وہ قصبات
و دیہات اب تک مشرقی تہذیب کے حامل ہیں، مساجد پختہ اور آباد ہیں
جس جس موضع میں یہ آباد ہیں وہاں انہیں کی زمینداری و علمداری ہے گرد و نواح
کے دیہات بھی انہیں کی جاگیر میں شامل ہیں خاندان میں تعلیم کی کمی ہے۔ مگر
جو ادھر متوجہ ہوگیا اس نے ملک میں اپنی جگہ بنالی ہے، علماء و ادیب و پروفیسر وکیل
و بیرسٹر مصنف و مقرر اخبار و ڈاکٹر، نثرنگار و شاعر، تحصیلدار و ڈپٹی کلکٹر، وزیر
و ہوم ممبر لیڈر و ملیڈر، ان میں مختلف میدان کے مرد ملیں گے۔ دوسری
طرف بہت سے خان صاحب خان بہادر، سر، نواب اور نواب بہادر بھی
نظر آئیں گے۔

اس خاندان کو ملک اور بیرون ملک تک شہرت دینے والے دو بزرگ

ہوئے ہیں۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ اس کا سلسلہ پہلے میاوں تک پھیلا ہوا تھا، بھاموں میں بھی آبادی سے متصل ہی کچھ درخت باقی ہیں۔ جن میں پختہ قبریں ہیں اور کنارہ میں تو یہ گھنا گنجِ شہیداں بنا ہوا ہے۔ بیسیوں قدیم پختہ قبریں موجود ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ یہ سب شہاب الدین غوری اور سیّد سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھی مجاہدین شہداء کے مزارات ہیں۔ انھیں میں سے حضرت ملک پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ہے۔ جن کا مزار بھیکن پور کے پُل کے قریب زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ ان بزرگ کے متعلق نواب صدر یار جنگ بہادر اپنی قلمی یادداشت میں تحریر فرماتے ہیں

"مولنا عالم علی صاحب مرحوم محدث مرادآباد کے کشف کو جناب عم محترم عبدالشکور خاں صاحب مرحوم نے مجھ سے فرمایا تھا۔ ملک پیر صاحب کا نام مولنا منہاج الدین شہید ہے۔ شہاب الدین غوری کے لشکر کا مرور، عبور گنگا کے لئے بھیکن پور کے متصل ہو کر ہوا، اس موقعہ پر شہید ہوئے، مزار کی مرمت کی خواہش جناب عم محترم حاجی غلام احمد خاں صاحب مرحوم نے فرمائی تھی ملک پیر صاحب نے مولنا مرحوم کی وساطت سے نارضامندی کا اظہار فرمایا۔ مولانا نے اپنے مرید میاںجی صدر مرحوم کی نسبت فرمادیا تھا کہ جب مولانا کی غیبت میں ان کو وحشت ہو تو توجہ فرمائیں۔ چنانچہ جب مزار پر حاضر ہوتے تو تسکین پاتے"

کی سابر قومی حکومت یوپی نے اگست ۱۹۴۶ء میں وزارت زراعت کے منصب پر مقرر کیا ہے' زراعت کے ساتھ دوسرے محکمے بھی سپرد کردیئے ہیں انھیں مذکورہ بالا دیہات سے متصل تھامون سے ایک میل پر انقلاب ۱۸۵۷ء کا وہ مشہور مقام ہے جو میدان کارزار کے نام سے مشہور ومعروف ہے اور اب دیہاتی اصطلاح میں اسے "کالا عارہ" کہا جاتا ہے یہاں انگریزی فوجوں اور مسلمانوں میں مورچہ لگا تھا دونوں مقابل جماعتوں نے خوب داد شجاعت دی' قسمت کی بدنصیبی سے بڑے زور کی آندھی آئی جس کا رُخ مسلمانوں کی جماعت کی طرف تھا ان کی گولیاں بے اثر اور ان کی جماعت منتشر ہوگئی۔ اُدھر گوروں کی تازہ دم فوج بھی آندھی کے ساتھ ساتھ پہنچ گئی' نتیجہ یہ ہوا کہ سارے مسلمان چاروں طرف سے گھیر کر تہ تیغ کر دیئے گئے یہیں لڑائی کا خاتمہ ہوا جو انگریز افسر یہاں مارے گئے ان کے نام ایک پتھر پر کندہ ہیں اور وہ پتھر دیں اب تک نصب ہے چونکہ یہ واقعہ کوئی سے بالکل متصل ہوا تھا اس لئے اس کی آبادی پر قدرتی طور پر اثر پڑا اور یہ بڑا گاؤں آناً فاناً اُجڑ گیا اور ایسا اُجڑا کہ آج تک پورے طور پر آباد نہ ہو سکا اس موضع میں ایک بہت پرانی مسجد' کنواں' اور پختہ قبریں ہیں جس سے اس کی قدامت کا پتہ چلتا ہے۔ موضع کناوہ میں ایک گھاں جنگل ہے جسے "گھنا" کہتے ہیں' اس میں جھاڑیاں اور بڑے بڑے درخت دور دور تک پھیلے

اول الذکر نے نہ صرف اپنے خاندان بلکہ ملک و قوم کے نام کو بھی اپنی غیر معمولی قابلیت اور جدوجہد حریت سے چار چاند لگائے، شروانی خاندان کو نہ صرف ہندستان بلکہ دوسرے ممالک میں بھی روشناس کرایا، اور یہ خاندان اپنی قدیم روایات کی بنا پر جس عظمت وجلالت کا مستحق تھا انھوں نے اپنے بلند کردار کی بدولت دنیا کے سامنے اسے ویسا ہی ثابت کردکھایا، ایک طرف اگرچند خود غرض، جاہ پرست، اور رجعت پسند نوابان درؤساء خاندان غیر ملکی حکومت کے دست وبازو بنکر خاندان کے دامن پر بدنما داغ لگارہے تھے تو دوسری جانب، تصدق اور اس کے دونوں بھائی شمع آزادی ملک وقوم پر پروانہ وار نثار و فدا ہوکر خاندان کا نام روشن کررہے تھے۔

استخلاص وطن کی آرزو لیئے ہوئے ۲۲ مارچ ۱۹۳۵ء مطابق ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ کو نمونیہ اور گردن توڑ بخار میں مبتلا ہوکر بزمانۂ کہولت یہ شبیر بیشۂ حریت خم فنا کی جھاڑی میں جا چھپا اور ساڑھے چار سال بعد ۱۳ اگست ۱۹۳۹ء کو برادر خرد فدا احمد خاں شروانی مرحوم بھی برادر گرامی کی خدمت گذاری کے لئے انھیں کے پاس جا پہنچے، والد ماجد حاجی عبدالرشید خاں شروانی بھی یکے بعد دیگرے بڑھاپے میں سینے پر دو داغ کھاکر خبر گیری فرزندان سعادتمند کی خاطر وہیں پہنچ گئے۔ اب پورے خاندان کے سرتاج مسٹر نثار احمد خاں شروانی ہیں جن کو سابقہ خدمات (اسیری زندان فرنگ اور ترک عہدۂ جلیلہ پوسٹ آفس وغیرہ)

راقم السطور محمد عبدالشاہد خاں شروانی

عمت در دست حاکم را بیداکم کر چوں گریم
دلا احوں تو کہ تار حال حودیک لحظہ حوں گریم

اس وقت حکم ہلالِ سرور و بہجت فلک صحافت پر اُفق کلکتہ سے طلوع ہوکر بدر کامل بننے سے قبل ہی خسوف وکسوف صبط و مع کی منزل میں داخل ہو رہا تھا یہ ہلال سوم دکس آسمان دنیا پر نمودار ہوا یعنی جوری ۱۹۱۵ء میں یہ ننگ خلائق، ناواقف حقائق و دقائق اپنی ننہیال ریاست بھیکم پور ضلع علیگڈھ یو پی میں پیدا ہوا آبا و اجداد کا مسکن موضع بھاموں ضلع ایٹہ بھیکم پور سے ۸ میل پر واقع ہے بھاموں اضلاع علیگڈھ اور ایٹہ کی سرحد پر آباد ہے، اس کے جانبِ غرب ایک میل پر موضع ملوہ علیگڈھ کی حد میں اور جانب شرق اسی قدر فاصلہ پر موضع ڈھولنہ ایٹہ کی حد میں ہے جانب جنوب موضع کناوہ اور جانب شمال موضع کوئی ہے کناوہ ایٹہ اور کوئی علیگڈھ میں محسوب ہے۔

موضع ملوہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی سرزمین پر فخر خاندان مسٹر احمد تصدق خاں شروانی سر سٹر مرحوم امداں کے دونوں بھائی مسٹر نثار احمد خاں شروانی وزیر زراعت یو پی اور مسٹر فدا احمد خاں شروانی مرحوم متولد ہوئے۔

نذرِ عقیدت

بہائے[1] ذی رفعت مولانا معین الدین اجمیری
۱۳۵۹ھ

مرجعِ خلق و ملاذِ خاص و عام
مخزنِ الطاف و مخدومِ انام

مہرِ عالمتابِ علم و معرفت
زہد و حلم و فضل کے ماہِ تمام

یمِّ تفسیر و حدیث و فقہِ دیں
بحرِ ذخّارِ معانی و کلام

فنِ تاریخ و ادب میں بے نظیر
منطق و حکمت کے لاثانی امام

تھا لقب علامۃ الہند آپ کا
اور معین الدین اجمیری تھا نام

وعظ و افتاء، درس و تالیفِ علوم
رات دن اس کے سوا کچھ تھا نہ کام

تھی زبانِ فیض گویا ہر گھڑی
فرقِ باطل کے لئے حق کی حسام

راہِ آزادی میں کیں قربانیاں
سجنِ یوسف بھی بنا دار القیام

خدمتِ ملک و وطن میں پیش پیش
تھا سیاست میں بہت اونچا مقام

"فضل حق" سے تھے امامِ حرّیت
کارزارِ حق میں تیغِ بے نیام

ہو نہیں سکتا خصائل کا شمار
اس دعا پر اب ہو شاہد اختتام

اپنی رحمت سے عنایت کر خدا!
جنت الفردوس میں عالی مقام

چشمۂ فیضاں رہے جاری سدا
رحمتوں کا ہو نزول ان پر مدام

---

[1] یہ مصرعۂ تاریخ خاص ضعیف دیکھا ہے حضرت پیر مرشد مولانا ہادی علی خاں صاحب میتاپوری رحمۃ اللہ علیہ استاد محترم سے ۱۱ سال قبل رحلت فرما چکے تھے دونوں بزرگوں کے ناموں کا اس موقع پر اجتماع جبکہ ہادی تعداد میں [illegible] نام [illegible]

حاصل مسلّم معصرہ کمالات علم و عمل اسی حسن قبول کا اہل تھا۔ جو غیب سے ظاہر ہوا تبحر علم، مروت و حلم، زہد و اتقا، صبر و استقلال تحریر و تقریر، وسعت اخلاق، اسیرت حسنی، ہمدردی عام، جرأت تام، رواداری و مساوات، استغنا و توکل تسلیم و رضا غرض جملہ محاسن صوری و معنوی کی جامعیت جیسی قدرت نے آپ میں ودیعت رکھی تھی بہت کم دیکھنے میں آئی ہے افسوس کہ مولانا کی وفات سے مسند علم و فضل خصوصاً اخیر میں بے رونق ہو گئی۔ تمام مستفیدین متفرق و منتشر ہو گئے۔ جن کے لئے مولانا کی ذات نے احمر کو مرکز توجہ ساز رکھا تھا۔ افسوس

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

انا للہ وانا الیہ راجعون

عہد حاضر کا مورخ موجودہ دور کے علماء کی تاریخ میں جس مرتبہ پر آپ کا نام نامی درج کریگا وہ اخبارات کے کالموں میں دیکھئے یا خاندان ملک و ملت کے ان صدمات سے پوچھئے جو عالمانہ میں مرکے نام سے شائع ہوتے والے ہیں یا ہو سکے۔ افسوس کہ حضرت علامہ کا یہ نقش آخر استار خاص ابھی زیور طبع سے آراستہ ہونے پایا تھا کہ مصنف علام واصل بحق ہو گئے۔

ان مشاغل کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا کہ حضرت علامہ کا محبوب ترین مشغلہ بلکہ غذائے روح یہی تھا۔ چنانچہ دورۂ حدیث شریف کا درس، وفات سے دو ہفتہ قبل تک جاری رہا اور اس دریائے علوم کے مستفیان میں سے دور آخر کے خوش نصیب مستفیض طلبہ تکمیل علوم کے لئے اس حالت میں شبانہ روز مولانا کے گرد حلقہ زن رہتے تھے۔ خصوصًا جناب مولانا شاہد شروانی اور جناب مولوی نجم الحسن صاحب خیرآبادی کے متعلق مولانا کی دلی خواہش اور پوری سعی وکوشش تھی کہ ان دونوں جوہر قابل شریف زادوں کو مجسمۂ کمال علمی بنا دیں۔ کیونکہ ہر دو اولوالعزم سعادتمند جوان صالح طالبان علوم نے خود کو مولانا کی خدمت ورضاجوئی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کی تکمیل اور اس کتاب کی ترتیب کے متصل ہی آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اس خدمتِ علم (تدریس) اور اس نذرِ عقیدت (تصنیف نثار خواجہ) کا صلہ تھا جو اس حسن قبول کی صورت میں ظاہر ہوا کہ عشرۂ محرم کے روز سیدنا امام حسین (علیہ وعلی جدہ السلام) کی عین شہادت کے وقت مولانا نے جان، جان آفریں کو سپرد کی۔ اور جنازہ بھی اس تزک و احتشام سے اٹھا کہ باوجود بلیاں لگا دینے کے لوگوں کو کندھا دینے کا موقعہ نہ ملا اس شان قبول کے ساتھ احاطہ درگاہ عالم پناہ میں اندرون خطۂ صالحین (جاریا) متصل محراب جامع مسجد شاہجہانی آپ مدفون ہوئے۔ الحق کہ یہ مجاہد اعظم

امداد سے فیصل کیا ہے کہ پڑھ کر وجد آجائے اور ضمناً بعض مذہبی اختلافی مسائل پر لطیف اشارات کے ساتھ پُر لطف بحث فرمائی ہے کہ ہر منصف کو سوائے تحسین و تسلیم کچھ ہے۔

کاش مولانا مرحوم چند سال قبل صحت جسمانی اور فراغ خاطر کے وقت اس تصنیف کا موقع پاتے تو وسعت بیان اور اس تالیف کی وقعت و شان بہت ہی اعلیٰ اور ارفع ہوتی یہ تو مولانا نے اس ماحول میں تصنیف فرمائی ہے کہ ایک طرف جسمانی عوارض نے آپ کو چند سال سے مُضغہ گوشت سا دیا تھا کہ نشست و برخاست تو کجا کروٹ بدلنا بھی بلا دوسرے کی امداد کے ناممکن تھا۔ دوسری طرف خدام ملک شاگردوں (بہوس اقتدار کے بھوکے جنٹلمینوں) نے مولانا کے وجود کو اپنے لئے سنگ راہ سمجھتے ہوئے حکومت کی نظر میں مشتبہ کر دیا حتیٰ کہ دار العلوم معینیہ عثمانیہ کے منصب صدارت (صدر مدرسی) سے بحکم گورنمنٹ نظام خلد اللہ ملکہ ہٹا کر مولانا کا فراغ خاطر مفقود کر دیا لیکن اس جوش مخالفت اور اس بے دست و پائی کے عالم میں بھی آپ حمایت ملت اور تحریکات حاضرۂ اصلاح امت میں برابر مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کے لئے سربکف رہے اور اس معذوری کی حالت میں عامی جلسوں میں ہمیشہ تقریر فرماتے یہاں تک کہ حجے لوہے کے عالم آشوب حادثہ میں وہاں پہنچ کر رہنمائی کی اور تحریک ہجرت کو روکنے کی تلقین فرمائی۔

بلا امتیاز شاہ و گدا فوج در فوج اور موج در موج آپ کے آستانے پر پروانہ وار فدا ہو رہی ہے۔ اس کشش و جاذبیت کی حقیقی لِم۔ اور اصلی راز معلوم کرنے کی روز افزوں طلب نے اس گروہ کو محوِ حیرت بنا رکھا تھا کہ ایسا مرکزِ عقیدت خواجہ جس کی سات سو برس گذر جانے پر یہ شان ہے اپنے دورِ حیات میں کیسا آئینہ دارِ جمال و کمال ہوگا۔ ہر متین و مہذب شخص انگشت حیرت بدنداں کہ ایسا مقبول و مسلّم ولی اللہ اور اس کے صحیح حالات و سوانح اس درجہ پردۂ خفا میں کہ چند زبان زد رطب و یابس روایات کے سوا علمی دفعات مخفی و مستور۔ اس کمی اور اس طلب کو دیکھ کر حضرت علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری علیہ الرحمۃ نے قصد فرمایا کہ آپ کے مستند و قائع و حالات آپ کے مسلّم کمالات و کرامات مورّخانہ شان اور محققانہ آن بان کے ساتھ کتابی صورت میں مرتب و مدوّن کئے جاویں۔ اور اس طرح کہ ارباب عقیدت کی ایمانی آنکھ کا سرمہ نور افزا ثابت ہوں اور اصحاب علم و روایت کے لئے مستند دلیل و رہنما۔ فللہ الحمد کہ یہ تصنیف لطیف اسی جامعیت کی حامل و حادی مرتب ہوئی حضرت خواجہ کے سوانح حیات۔ آپ کا علم و عمل۔ آپ کا زہد و ورع۔ آپ کا جہاد و مجاہدہ غرض زندگی کا ہر شعبہ انوار قرآنی اور معارف ربانی کی تفسیر ہے ہر قدم شریعت کی روشنی میں اٹھا ہے، ہر عمل اسوۂ نبوت کا عکس اور پرتو ہے۔ مورخین کے گمراہ کن اختلافات کو تاریخ ہی کی شہادت سے ایسی مجتہدانہ

جیسا کہ گذر چکا ہے مولانا نے ستار خواجہ، صاحب فراش ہوتے ہوئے مرتب کی تھی، وفات کے دوسرے سال طباعت کی نوبت آئی، مولانا محمد یونس صاحب سابق ناظم دارالعلوم معینیہ عثمانیہ وخطیب جامع شاہجہانی درگاہ معلّی اجمیر شریف نے خاتمہ کتاب میں جو اظہار عقیدت کیا ہے اس کا کچھ حصّہ نقل کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

آخر میں اپنے چند اشعار قطعہ وفات، نذر عقیدت کے طور پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں

خاتمۂ کتاب ورحلت مصنّف علّام

یہ کتاب مصنف علام نے جس محققانہ طرز اور مجتہدانہ رنگ میں لکھی ہے اپنی آپ نظیر ہے۔ حضرت خواجہ کے حالات طیبات میں اب تک ایسی مستند تاریخ مرتب نہیں ہوئی جس کی بڑی ضرورت تھی خصوصاً تہذیب جدید کا حامل کثیر التعداد گروہ جو ہر منقول کو عقل و فلسفہ کی روشنی میں دیکھنا چاہتا ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ جو ہر روایت کو درایت کی میزان میں تولنے کا خوگر ہے، اُس کے لئے وہ تمام تصانیف جن میں جوش عقیدت سے کام لیا گیا ہے ناقابل تسلیم ہیں اور عوام کی زبان پر جو روایات جاری وساری ہیں پایۂ اعتبار سے ساقط، اور حضرت خواجہ کی اس مقبولیت عامہ کا مشاہدہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بلاتفریق قوم وملت مخلوق خدا

گھنٹوں تقریر کر سکتے تھے، میرا ذاتی مشاہدہ ہے،

شعبان ۵۵ھ میں احمد آباد، سورت اور بمبئی کا سفر ہوا، دو دوسرے طالبعلموں کے ساتھ مجھے بھی ہمرکابی کا فخر حاصل تھا۔ رمضان کا پورا مہینہ تقریباً بمبئی ہی میں گذرا، ترمذی شریف، اور سراجی کے اسباق جاری رہے کبھی سحری اور کبھی نماز فجر کے بعد یہ سلسلہ رہتا، اسی درمیان میں مولانا نے علم و معلوم پر تحقیقی مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ نہایت باریک قلم کے ۳۰ صفحات لکھ ڈالے درمیان میں بیسیوں کتابوں اور افاضل کے حوالے دیئے گئے حالانکہ ہمارے علم میں ہے کہ ایسی کوئی کتاب اس وقت مولانا کے پاس نہیں تھی جس سے فائدہ اٹھا سکتے۔ مولانا سے استفادہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مولانا کا سینہ علوم و فنون کا گنجینہ تھا علم در سفینہ نہ تھا۔ افسوس

آں قدح بشکست واں ساقی نہ ماند

جامع مسجد شاہجہانی درگاہ معلی اجمیر کی پشت پر خاص محراب کے متصل احاطہ "چار یاری" میں یہ کوہ عزم وثبات، پیکر علم و عمل، اور مخزن فضل و کمال، ۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ سے آسودۂ خواب ہے، اور اس کی قبر بھی علمی جلالت شان کا پورا مظہر بنی ہوئی ہے۔ علیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ، ؎

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز
عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقیست

ان دو حضرات کے سوا کسی اور کا بیعت کرنا میرے علم میں نہیں ہے بیعتِ مصافحہ و صیانہ تک کے لیے اذن عام تھا اکثر حضرات کو اجازت بھی دی گئی ۔
۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء مطابق ۲۱ رشعبان ۱۳۵۸ھ پنجشنبہ کو مجھے اور رفیق محترم مولوی سید نجم الحسن حیدرآبادی کو بھی یہ سعادت نصیب ہوئی ، حدیث مصافحہ و صیانہ مع اسناد پڑھ کر مصافحہ فرمایا اور " اسودین " پانی اور کھجور سے ضیافت کی اسناد پر دستخط ثبت فرما کر اجازتِ بیعت بھی مرحمت فرمائی ۔

مولانا مفتی کفایت اللہ ، علامہ سید سلیمان ندوی ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی اور دوسرے اکابر علماء مولانا سے بڑی عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے ، اول الذکر دونوں حضرات کبھی کبھی فنی و علمی مسائل کی تحقیق گفتگو بھی کرتے ۔

علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم جب یورپ گئے اور وہاں انہیں لیکچر بھی دینا تھا تو جناب میر غلام بھیک نیرنگ کی معرفت مولانا سے زمان یا دہر پر مضمون لکھایا تھا اس کی انگریزی کر کے وہاں کی علمی مجلس میں وہ مضمون پڑھا جو بید پسند کیا گیا وہاں سے واپسی پر مولانا کو شکریہ کا خط لکھا تھا مولانا نے ایک موقع پر وہ خط مجھے بھی دکھایا تھا معلوم نہیں اب بھی کاغذات میں وہ محفوظ ہے یا نہیں ؟

مولانا کو فلسفہ کے مسائل پر اس قدر عبور تھا کہ اہم سے اہم مسئلہ پر برجستہ

درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا ہزاروں طلبہ مستفید ہوئے۔ بہت سے تلامذہ سے اب بھی دریائے فیض جاری ہے، مولوی منتخب الحق بہاری مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں مولوی عبید اللہ جامعہ عباسیہ بھاولپور میں، مفتی محمود حسن، دارالعلوم راندیر میں، مولوی سید نجم الحسن، درگاہ مخدومیہ خیرآباد میں طلبہ کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں بھی مولانا کے ایک شاگرد درس دے رہے ہیں۔ صاحبزادہ قمر الدین سجادہ نشین سیال شریف (پنجاب)۔ صاحبزادہ ہاشم جان سندھی، مولوی طاہر حسین امام عیدگاہ دہلی، مولوی غازی محی الدین اجمیری، مولوی نورالدین خلف مولانا قمر الدین اجمیری، مولوی عبد الشکور بہاری، مولوی عبد الحئی اجمیری، مولوی افتخار احمد چھپروی بہاری، حضرت مخدوم الانام شاہ مقبول میاں قلندر خیرآبادی اور حکیم نصیر الدین ندوی وغیرہم قابلِ ذکر تلامذہ ہیں۔

مولانا حافظ مفتی سلطان حسن اکبرآبادی اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی استفادہ کیا ہے۔

مولانا ہزار اصرار پر بھی کسی کو بیعت نہ فرماتے تھے، مولانا احمد علی ناظم انجمن خدام الدین لاہور نے خطوط کے ذریعہ اصرار کی انتہا کر دی، خود بھی حاضر ہوئے، سینکڑوں التجاؤں کے بعد شرفِ پذیرائی بخشا گیا۔ اسی طرح سیٹھ عبد المجید احمد آباد (تالے والے) ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے تو مجبور ہو کر ان کو بیعت کرنا پڑا۔

تحریکِ خلافت میں علم و علماء اور مجاہدین زعماء کی خدمت اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔ مولانا جیل میں تھے کہ یہ دیندار بزرگ دنیا سے اٹھ گیا، مولانا سے بڑا خلوص و اعتقاد رکھتے تھے، اسی بنا پر ترتیب سوانح حیات سے ردۂ حادثہ سنا دیا۔

جناب مولانا احمد رضا خاں بریلوی مرحوم جمعہ کی اذان ثانی کو مسجد سے باہر ضروری سمجھتے تھے، ممبر کے سامنے اذان کو غیر مشروع مانتے تھے "القول الاظہر" اور "تجلیات خوالمیس" اسی کا جواب اور جواب الجواب ہیں ضمناً دوسرے فقہی مسائل بھی آگئے ہیں۔

جناب مولانا احمد رضا خاں بریلوی مرحوم اور جناب مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم میں خیالات و عقائد کے لحاظ سے بعد المشرقین تھا مگر جہاد حریت کے خلاف تحریک خلافت کے دور میں دونوں بزرگ متفق ہو گئے تھے "کلمۂ حق" میں مولانا نے اسی پر تبصرہ فرمایا ہے باقی تصنیفات کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔

عربی میں دو رسالے، رسالہ فی بیان العمرہ اور رسالہ مسائل الحج والعمرہ بھی لکھے جو غیر مطبوعہ ہیں "قاضی" کے بعض مقامات استدار کا حل بھی اردو میں کر دیا ہے۔

مولانا نے قمری حساب سے ۶۰ سال کی عمر پائی جس میں ۴۰ سال مسلسل

نت کے سازگار نہ رہنے سے اوسط درجہ تک عربی تعلیم حاصل
تحان دینے پر اکتفا کیا، اب انٹرنس کا امتحان دے رہے
نے مولانا کی علمی خدمات کی بنا پر وفات کے بعد سے پچاس
ماندگان کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ جو برابر جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ
ت بخشے۔

ں، ازالۃ الاوہام[1] الغفول، ازاحۃ شبہات[2] الشادی، چہار
ۃ طیبہ، چہل حدیث، نثار خواجہ، القول الاظہر، تجلیات
اف، اور کلمۃ الحق، مطبوعہ ہیں۔

مذہ مولانا فضل حق رامپوری پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور نے
نا عبدالحق خیرآبادی کے حاشیۂ شرح مواقف پر بعض شبہات
ئے تھے، اول الذکر دونوں کتابیں اسی کے جواب جواب بجوا
، ضمناً فنی و تحقیقی مسائل پر شرح و بسط سے روشنی پڑ گئی ہے
ہیں۔ چہار تازیانۂ قہار مختصر روداد ہے اس مناظرہ کی جو مولانا
م برکات احمد ٹونکی اور مولوی عبدالوہاب بہاری کے درمیان
وا تھا۔ اس میں بھی بعض فنی مسائل مذکور ہیں۔ حیوۃ طیبہ نواب
ر رئیس بوڑہانسی ضلع بلند شہر و جاگیردار بیچپور کی سوانح حیات
می مسائل سے مملو ہے۔ نواب صاحب موصوف نے

جلد فنوں پر یکساں عبور تھا مدارس بدے اپیا تجربہ یہ ہے کہ ہر فن اس طور سے پڑھاتے تھے کہ امام فن معلوم ہوتے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس فن کے سوا انہیں دوسرا فن آتا ہی نہ ہوگا۔

ریاضی میں مولانا حکیم برکات احمد بہاری ثم ٹونکی زیادہ درک نہ رکھتے تھے اس لئے علیگڈھ آکر استاذ العلماء مولانا مفتی محمد لطف اللہ علیگڈھی کی چھ ماہ تک جوتیاں سیدھی کرکے اس فن پر کماحقہ عبور حاصل کیا تھا۔

ایک بار مولوی حکیم ظفر الحق میرٹھ شمس العلماء مولانا عبد الحق خیرآبادی سی کسی بات پر ٹونک میں خفا ہوئے تو فرمایا کہ

میاں تم سنگ خاندان ہو اور میں فخر خاندان ہمارے خاندان علم و فضل میں کوئی تم سا نہیں ہوا اور میرے خاندان میں آج تک مجھ جیسا نہیں گذرا'

استاد کے استاد زادہ سے یہ سخت کلامی اس وجہ سے ہوگئی تھی کہ موصوف ان کو تکرار اسباق بھی کراتے تھے اور استاد کے حکم کے مطابق پوری توجہ اور خیال رکھتے تھے۔

پسماندگاں میں ایک بیوہ' ایک صاحبزادی جن کی ۵ اربیع الاول ۱۳۶۳ھ کو شادی ہوچکی ہے اور ایک صاحبزادے مولوی عبد الباقی سلمہ ہیں جن کا نکاح شوال ۱۳۶۵ھ میں ہوا ہے اور مہتمم ہائی اسکول کیکڑی میں تحریر ہیں ،

بیماری نے نازک صورت اختیار کی اور موصوف کو مایوسی ہوئی تو فرمایا۔

"اُفوضُ امری الی اللہ، اِنَّ اللہَ بصیرٌ بالعباد ہ"

جب تک زبان نے کام دیا بار بار اپنی حالت کو دیکھ دیکھ کر اس آیت کی تکرار فرماتے تھے۔ اور سورۂ یٰسین تسکینِ خاطر کے لئے پڑھوا کر سنتے تھے۔ صحابۂ کرام میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر جان فدا کرتے تھے۔ ان کے ایمان و ایقان کی نظیر نہیں بتاتے تھے۔ فرماتے تھے انھوں نے خدا کو پہچان کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا نہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر خدا کو جانا۔

حضرات اہل بیت کے ساتھ خاص انس اور لگاؤ تھا۔ بخاری شریف میں حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے سلسلے میں حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا جب یہ قول پڑھاتے کہ اے انس تمھارے دلوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر مٹی ڈالنا کیسے گوارا کر لیا، تو بیساختہ ایک چیخ نکل جاتی اور ایک عرصہ کے لئے ربودگی سی پیدا ہو جاتی۔ جب بھی حدیث شریف میں یہ موقعہ آیا ہے یہی کیفیت ہوئی ہے۔ ایک بار زمانۂ علالت میں دورانِ گفتگو میں یہ واقعہ زبان پر آگیا، چیخ نکلی، حالت متغیّر ہو گئی، بدن پر رعشہ طاری ہو گیا،

خیرآبادی خاندانِ علم میں اس جامعیت کا کوئی دوسرا فرد نہیں گذرا، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، فقہ، منطق، فلسفہ، ریاضی، اصطرلاب، ادب وغیرہا

ایک ماہ صاحب فراش رہ کر تبدیل آب وہوا کے لئے حیدرآباد و علیگڈھ چلا گیا وہاں سے ۵ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۶ جنوری ۱۹۴۰ء کو واپس آمیر پہنچا۔ اپنی بدنصیبی پر جتنا بھی ماتم کروں کم ہے کہ ان آخری ایام میں حدیث واستفادہ سے محروم رہا واپسی پر پھر مسلم شریف کے اسباق شروع ہوئے۔ اس زمانہ علالت اور آخری ایام حیات میں میں اور مولوی سید نجم الحسن ہم دونوں ہی حد شگراری اور استفادہ کے لئے مخصوص ہوگئے تھے ۸ فروری ۱۹۴۰ء مطابق ۸ ہر ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ یکشنبہ تک اسباق واستفادہ کا سلسلہ رہا یکم محرم الحرام ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۱ فروری ۱۹۴۰ء شنبہ کو مرض نے شدت اختیار کرلی صحیح بخاری اور آیۂ کریمہ کا ختم کیا گیا، بکری ذبح کی گئی، شام کو کچھ افاقہ ہوا، تیسرے روز حالت کچھ اور سنبھل گئی ۸ محرم الحرام کو حالت مایوس کن ہوگئی، دوسرے دن اطباء بھی ناامید ہوگئے آخر تیسرے روز ۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹ فروری ۱۹۴۰ء یکشنبہ کو ٹھیک تمہید کربلا سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت اسی یوم عاشورہ میں یہ آفتاب علم وعمل اور ماہتاب رشد و ہدایت ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گویا آخری حالت سے دس روز پہلے تک درس حدیث جاری رہا، منطق وفلسفہ جو خاص فن تھا اس کا سلسلہ دو ماہ قبل ہی منقطع ہوچکا تھا جب

کے لحاظ سے کچھ کم نہیں ہے۔ مولانا کی وسعتِ نظر اور مہارتِ علوم نقلیہ کا اس سے اچھی طرح اندازہ ہوجاتا ہے۔ اصل مسودہ مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا موصوف کے کتابخانہ میں مولوی عبدالباقی سلمہٗ کے پاس محفوظ ہے، اس پر جابجا حاشیہ مولانا نے میرے نام (الشاہد الشروانی) سے چڑھایا ہے۔

مولانا معضلاتِ فن کی تشریحات بھی فرماتے رہتے تھے، خاص خاص مسائل پر مبسوط مضمون بھی تحریر فرمادیتے تھے، چنانچہ علم و معلوم، دہر اور وجود پر مبسوط مضامین خود مولانا کے دست مبارک کے لکھے ہوئے میرے پاس موجود ہیں، آخری مضمون شوال ۵۵ھ میں ختم کیا تھا۔ زمانۂ علالت و معذوری میں بھی بعد عصر یہ سلسلہ جاری رہتا چنانچہ جمادی الاخری ۱۳۵۸ھ سے لے کر ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۹۳۹ء۔ وفات سے ایک ماہ پچیس روز قبل تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ وجود رابطی، متعلق تصدیق، حقیقتِ تصدیق، تحقیق اجزاء قضیہ و تصدیق، مقولات عشر، کلّی طبعی وغیرہا جیسے معرکۃ الآرا فنّی مسائل کی املا کرائی۔ ۸ نومبر ۱۹۳۹ء۔ مطابق ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ دوشنبہ کو بخاری شریف اور ۲۸ نومبر ۱۹۳۹ء مطابق ۱۶ شوال ۵۸ھ منگل کو سنن ابی داؤد ختم ہوئیں، اس کے بعد ۲۹ نومبر ۱۹۳۹ء مطابق ۱۷ شوال ۵۸ھ کو مسلم شریف شروع کرادی گئی، کچھ اسباق ہو پائے تھے کہ میں سخت بیمار پڑ گیا اور تقریباً دو ماہ اس کا چکر رہا

کے ساتھ بخاری شریف شائع ہو چکی تھی جس میں امام اعظم اور دوسرے ائمہ ثلثہ کے مسالک پر جا بجا چوٹیں بھی تھیں، ملمدا ما نگ دعووں کے باوجود جب اُسے تاج کمپنی نے تجارتی مصلحتوں کی بنا پر طبع نہ کرایا تو بہت برہم ہوئے۔

جناب میر نثار احمد مرحوم متولی درگاہ معلیٰ و معتمد دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر اور دوسرے بعض مخلصین کی فرمائش پر، مولانا نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح حالات مرتب کرنا شروع کئے تھے، اس کی تکمیل بھی اسی زمانہ علالت میں فرمائی جو انتقال کے ایک سال بعد "نثار خواجہ" کے نام سے شائع ہوئی اور پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا، میر نثار احمد کے نام کی رعایت سے "نثار خواجہ" نام تجویز فرمایا، مولانا محمد یونس مرحوم ناظم دارالعلوم معینیہ عثمانیہ و خطیب جامع شاہجہانی درگاہ معلیٰ نے کتاب کے آخر میں مولانا اور کتاب سے متعلق جو صفحات لکھے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اس میں اپنی مہربانی سے میرا اور مولوی سید نجم الحسن کا ذکر بھی کیا ہے کہ ہم دونوں نے استاذ مکرم کا حق رفاقت آخر تک کس طرح ادا کیا اور مولانا نے کس کس طرح نوازا۔

اسی زمانہ علالت میں ترمذی شریف کی شرح لکھنا شروع کی جب ایک جزو ہو جاتا تو ہم دونوں بھی نقل کر لیتے، ابواب الطہارۃ بھی ختم نہ ہونے پائے تھے کہ زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا بہرحال جتنا کچھ ہو گیا ہے وہ بھی اپنی اہمیت

وجودِ واجب میں تشکیک باعتبار شدۃ وضعف مانتے ہوئے ایک توجیہ کی ہے۔ مولانا نے اپنے استاذ الاستاذ سے اختلاف کیا ہے۔ اور مؤدبانہ الفاظ میں ایک مضمون کا املا کراتے ہوئے تحریر کرایا تھا کہ یہ اعلیٰ توجیہ فقیر کے ذہن اسفل سے بعید ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے کہ جب ۱۹۳۵ء کے آخر میں مولانا کے کاربنکل (اربٹھ پھوڑا) نکلا تھا اور گردن میں چھ انچ گہرا شگاف دیا گیا تھا تو بلا کسی بیہوشی کی دوا کے اتنا بڑا آپریشن کرانے پر اس لئے کمر ہمت باندھ لی تھی کہ مسئلہ مذکورہ بالا میں فاضل خیرآبادی سے عالم تصور میں مناظرہ شروع کر دیا تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ اسی استغراق میں تمام منزلیں طے ہو گئیں۔

تعلیم و تدریس اور تصنیف و مطالعہ سے آخر وقت تک پوری دلچسپی رہی۔ بخاری شریف کے پاروں کے شرحی نوٹ تاج کمپنی لاہور کی فرمایش پر اردو میں تحریر فرمانا منظور کر لئے تھے اور ایسی حالت میں پہلے پارہ کے حاشیہ پر نوٹ تحریر فرمائے جبکہ بیٹھنے کی جگہ پھوڑا نکلا ہوا تھا، برادر خورد حکیم نظام الدین اجمیری کے مکان پر علاج کی غرض سے قیام تھا، چلنے پھرنے سے معذور ہو ہی چکے تھے، بعض مقامات کی شرح اپنے ہاتھ سے لکھی اور اکثر کا مولوی سید نجم الحسن سے املا کرایا، اس میں مولانا کو دلچسپی یوں بھی بڑھ گئی تھی کہ غیر مقلد مولوی وحید الزماں حیدرآبادی کے اس قسم کے شرحی نوٹوں

حوض کے بارے میں دہ دردہ کو ضروری نہ سمجھتے تھے احادیث اور سرزمین عرب میں پانی کی قلت سے دلائل پیش کرتے تھے، فرماتے تھے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کسی مسجد میں بیٹھے تھے بار کثیر سے متعلق سوالات کئے جارہے تھے آپ نے اس مسجد کے حوض کی طرف اشارہ کر دیا بعد میں جب اس کی پیمائش کی گئی تو اتفاق سے دہ دردہ نکلا، لوگوں نے اسی کو دلیل بنا لیا۔

جمعہ صحیح ہونے کے لئے فقہاء حنفیہ نے مصر کی شرط لگائی ہے، پھر مصر کی تعریف میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں مولانا نے ملا نظام الدین استاد الکل کا مسلک اختیار فرمایا تھا جو رسائل الارکان الاربعہ میں مولانا عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی سے منقول ہے کہ مصر وہ ہے جہاں انسانی ضروریات میسر آسکیں۔

ما اُھِلّ بہ لغیر اللہ میں حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے حرمت کے دائرہ میں ان جانوروں کو بھی داخل کر لیا ہے جو کسی بزرگ کے فاتحہ وغیرہ کے نام سے موسوم و متعین ہو جائیں، مولانا کا مسلک شاہ صاحب کے مخالف تھا، اس پر ایک مسوط متفرعانہ مضمون بھی لکھا تھا جو ضائع ہو گیا اور دوران ضعف صحت کی خرابی نے دوبارہ لکھنے کا موقع نہ دیا۔

مسئلہ تشکیک میں جہاں مولانا عبد الحق خیر آبادی نے شرح مرقات میں

وجد آگیا۔ دورانِ قیام میں چھ مرتبہ شریکِ درس ہوئے اور فرمائشی اسباق کی سماعت کی خلعتِ شاہانہ اور ایک ہزار روپیہ سے نوازا، اور مدرسہ معین الحق کو دارالعلوم معینیہ عثمانیہ میں تبدیل کرکے ایک ہزار سے زیادہ مشاہرہ مقرر فرمایا جو اب تک بدستور جاری ہے۔

مولانا نقلی وعقلی مسائل میں اپنی مستقل رائے رکھتے تھے اور کافی تلاش وجستجو اور تحقیق وتدقیق کے بعد نتائج پر پہنچے تھے۔ مختلف فیہ مسائل میں امام ابن تیمیہ کے فضل وکمال کے مدّاح تھے، "حدیث لا تشد الرحال" وغیرہ پڑھاتے وقت ان کے مسلک کا ردّ بلیغ فرماتے۔

کلام پاک کی آیات کے سلسلے میں فرمایا کرتے تھے کہ ہر آیت علیحدہ علیحدہ ہے لہٰذا ربط پیدا کرنے کی کوشش بے سود ہے؛

سورۂ یوسف کی آیت "فلما رأینہ اکبرنہ وقطعن ایدیھن وقلن حاش للہ ما ھذا بشرا ان ھوالا ملک کریم" میں عام اہل تفسیر کی رائے سے اختلاف تھا، فرماتے تھے کہ زنانِ مصر کی یہ کیفیت، حسنِ یوسف کی بنا پر نہیں بلکہ ان کی عظمت وجلالت وعفت کی بنا پر ہوئی تھی ورنہ "ملک کریم" کہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس باب میں بخاری شریف کی کتاب التفسیر سے بھی استشہاد فرماتے تھے اور یوں بھی بہترین تفسیر بخاری کی کتاب التفسیر ہی کو سمجھتے تھے۔

ہدایہ جلد ثالث، ترمذی شریف، قاضی مبارک، شرح جیمنی اور بیضاوی شریف بڑی دلچسپی سے پڑھاتے تھے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑی کتابیں پڑھانے والے اساتذہ، ابتدائی کتابوں میں وہ ذوق اور مہارت نہیں رکھتے جو بالائی کتابوں میں ہوتی ہے لیکن مولانا کو یکساں کمال تھا، فرزند سعید مولوی عبدالباقی سلمہ کو سمجھانے اور یاد کرانے کے لئے مرقات اور سکندر نامہ کی سماعت پر مولوی نجم الحسن کو مامور فرما دیا تھا، موصوف کا بیان ہے کہ اس خوبصورتی اور سہولت سے سمجھاتے تھے کہ بہ آسانی ذہن نشین ہو جاتا تھا لطف یہ ہے کہ فارسی میں بھی پورا پورا تبحر تھا چنانچہ سکندر نامہ میں اکثر مولوی نجم الحسن سوالات بھی کرتے رہتے تھے، برادر عزیز محمد زاہد خاں سلمہ کو میری استدعا پر انوار سہیلی شروع کرادی تھی جب موجودہ نظام حیدرآباد سلطان العلوم میر عثمان علی خاں بالقابہ اجمیر شریف حاضر ہوئے اور مدرسہ معین الحق (قائم کردۂ مولانا) میں اپنے استاد نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں صدر امور شرعیہ دکن کے ہمراہ پہنچے تو مولانا کی درسگاہ میں جاری سبق کو دلچسپی سے سنا اور نورالانوار (اصول فقہ کی اوسط کتاب مصنفہ ملا احمد جیون رحمۃ اللہ علیہ استاذ عالمگیر بادشاہ) کے درس کی فرمائش کی۔

مولانا نے اس کے سبق کی ایسے مدلل طریقہ پر تقریر کی کہ نظام صاحب کے

تشریف لے گئے۔

احادیث میں کنز العمال اور لغت حدیث میں مجمع البحار بہت پسند فرماتے تھے۔ تفسیرات احمدیہ، رسائل الارکان الاربعہ، آب حیات اور حاشیہ قاضی علامہ فضل حق خیرآبادی اکثر و بیشتر مطالعہ میں رکھتے، آخر الذکر کے متعلق فرماتے تھے کہ حاشیہ فضل حق کا میں نے برسوں سفر و حضر میں اس طرح مطالعہ کیا ہے جس طرح کوئی قصہ کہانی کی کتاب پڑھتا ہے۔ نصب الرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ کا بہت اشتیاق تھا۔ فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ میں مولانا عبدالباقی فرنگی محلی لکھنوی مہاجر مدنی مرحوم نے مجھ سے فرمائش کی تھی موصوف کی ٹھوس قابلیت اور کمال علمی کے مولانا معترف تھے، فرماتے تھے کہ حکیم صاحب (مولانا برکات احمد ٹونکی بہاری) بھی ان کی تعریف کیا کرتے تھے ایک روز مولوی نجم الحسن نے نصب الرایہ کے زیر طبع ہونے کی خوشخبری سنائی تو بہت مسرور ہوئے۔

فقہاء کے بہت مداح تھے، ہدایہ جلد ثالث خاص ذوق اور توجہ سے پڑھاتے تھے، امام صاحب کی دلیل بیان فرماتے وقت چہرہ جوش سے سرخ ہوجاتا تھا، فرماتے تھے کہ ایسا شخص کوئی دوسرا پیدا ہی نہیں ہوا۔ عام طور پر فقہاء کی نکتہ رسی و دقیقہ سنجی کے بہت مداح تھے، فقہاء کے خلاف اگر کسی کی زبان یا تحریر سے کوئی بات آپ کے علم میں آتی تو سخت برہم ہوتے تھے۔

تو ہمارے وارثوں سے کون لڑے گا۔ ہاں اگر ایسی زندگی کا اطمینان دلادو تو کتاب کا اطمینان میں بھی کر لوں گا۔ کتابوں کی طباعت و کتابت کی طرح عمدہ جلدوں سے بھی شغف تھا، کلکتہ کی بندھی ہوئی جلدوں کا بہت شوق تھا، علی العموم دہلی جلد بندھوایا کرتے تھے، ایک مرتبہ جلد کی خوبصورتی کا ذکر ہو رہا تھا مولوی محمد عباس بہاری نے دو جلدیں کلکتہ کی بندھی ہوئی دکھلائیں دیکھتے ہی گرویدہ ہوگئے فرمایا افسوس میرے کتب خانہ میں ایک جلد بھی ایسی نہیں ہے۔ انتقال سے تین چار ماہ پیشتر بمبئی اور سورت سے کتابیں منگوائیں، اس کے بعد کلکتہ جلد بندھنے کے لئے بھیجیں جس کا بے چینی سے انتظار رہتا۔ روزانہ مولوی نجم الحسن کو اسٹیشن پتہ لگانے کے لئے بھیجتے، خدا خدا کر کے پارسل آیا۔ جلدیں واقعۃً قابلِ دید تھیں۔ الماری میں اپنے سامنے ترتیب سے رکھوائیں پھر فرمایا اب دیکھو میرا کتب خانہ کیسا معلوم ہوتا ہے۔ مولوی نجم الحسن نے تعریفوں کے پل باندھ دئے تو بہت خوش ہوئے میں نے بھی شرح جامی اور فرائد کی جلدیں ساتھ ہی بندھوا کر منگوائیں اور مولوی محمد عباس بہاری کی وہ دونوں کتابیں بھی خریدلیں جن کی جلدیں مولانا کو دکھائی گئی تھیں، یہ کتابیں حاشیۂ عبدالغفور اور اس کا ضمیمہ تھیں، افسوس مولانا ان خوشنما جلدوں سے زیادہ عرصہ تک محظوظ نہ ہوسکے اور نہ ان مجلد کتابوں کے مطالعہ کا موقعہ ہی ملا کیونکہ ایک ماہ بعد دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو

آ گئے، سیکریٹری لائبریری نے تار دیا کہ یا تو کتاب بھیجئے ورنہ دو سو روپیہ وصول کیا جائیگا۔ مولانا نے فوراً ہی تار کے ذریعہ رقم مطلوبہ روانہ کر دی۔ اور کتاب پر قبضہ کر لیا۔ فرماتے تھے کہ اگر پانچسو طلب کرتے تو بھیجتا۔ قرآن شریف عمدہ کاغذ اور بہتر کتابت وطباعت کے ہدیہ کرتے، اس قسم کے تمام قرآن پاک زینتِ کتبخانہ تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میرے کتبخانہ سے اگر ایک کتاب بھی چلی جائے چاہے وہ کتنی ہی معمولی ہو تو میں سمجھوں گا کہ سارا کتب خانہ چلا گیا۔ ہر سال کتابوں کو دھوپ دلوانے اور باقاعدہ جائزہ لیتے، کتابیں سب موجود ہوتیں تو شیرینی وغیرہ سے متعلقہ طلبہ کو نوازتے۔

اصطرلاب سے متعلق بست باب کی شرح برجندی قلمی مولانا کے کتابخانہ میں تھی، میں نے اس کی نقل کی اجازت چاہی جو خوشی سے مل گئی۔ میں نے نقل شروع کی ہی تھی کہ رمضان کا مبارک مہینہ آ گیا، اسی مہینے ہم لوگوں کو اپنے وطن جانے کی اجازت ملجاتی تھی۔ جب میں چلنے لگا تو برجندی کے متعلق دریافت کیا کہ رمضان کے اوقاتِ فرصت میں خوب نقل کر لونگا التجا منظور نہ ہوئی، بار بار اصرار پر بھی نفی میں جواب ملا۔ میں نے عرض کیا آپ مجھ پر اطمینان نہیں کرتے، فرمایا تم پر بیٹے سے زیادہ بھروسہ ہے۔ لیکن تمھاری زندگی پر بھروسہ نہیں، خدانخواستہ تمھارا انتقال ہو جائے،

۲۷ جنوری ۱۹۳۹ء کو جامع مسجد جے پور کے دروازے کی توسیع کے سلسلے میں جب گولی چلی اور بیسوں مسلمان خاک وخون میں لتھڑ کر شہید ہوئے اور وہاں کے مسلمانوں نے جے پور سے ہجرت کی ٹھانی تو حضرت الاستاذ ۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو معذوری کے باوجود اہام وتفہیم کے لئے دوسری بار جے پور تشریف لے گئے۔ ہم دونوں بھی ہمرکاب تھے۔ عبدالرحمن تنور گر کے مکان میں قیام ہوا کہ یہی امیر جماعت مہاجرین تجویز ہوئے تھے عبدالرحمن مذکور کے پاس کعبۂ معظمہ کا ایک نقشہ تھا جس میں ایک ایک چیز وہاں کی دکھلائی گئی تھی، دوران قیام میں میزبان نے وہ سب سامان باقاعدہ مرتب کرکے دکھایا اور اس کے ساتھ حدیقہ حکیم سنائی کا ایک قلمی نسخہ دکھلایا جو ایران کے کسی خوشنویس کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا دریافت کرنے پر ایک ہزار قیمت بتائی گئی مولانا دیکھ کر پھڑک اٹھے تھے، آخر تک بھیجے پر کئی بار فرمایا کہ اگر ہزار روپئے ہوتے تو ابھی خرید لیتا، اور شوق کے دباؤ کے ماتحت مولوی محمداللہ خطیب جامع مسجد جے پور و معتقد خاص کو خط لکھدیا کہ کسی صورت سے وہ نسخہ حاصل کر دیکھیں ایک ہزار سے کم پر عبدالرحمن رضامند نہ ہوئے۔

ایک بار جے پور کا کتب خانہ دیکھنے تشریف لے گئے اسعاد اللہ کی چار جلدیں مطالعہ کے لئے باضابطہ لائبریری سے حاصل کیں، اور ان کو لیکر اجمیر

سبکدوشی کے بعد دارالعلوم کی جانب سے قاعدہ کے مطابق غالباً بارہ سو روپیہ ملا تھا، ہم سب کے اصرار اور حاجی عبدالستار کے اہتمام سے گور غریباں کی افتادہ زمین پر مختصر مکان تعمیر ہوا جس کا نام مولانا نے "زاویہ" رکھا دنیاوی جائداد میں اولاد کے لئے صرف یہی ترکہ پدری تھا۔

کتابوں سے عشق تھا۔ بہترین الماریاں اور درازیں بنوانے اور ترتیب سے کتابیں رکھنے مضمون کے علاوہ کتاب کی عمدہ کتابت وطباعت بھی پسند آنے کے لئے کافی تھی۔ کتاب پسند آنے پر ہر ممکن قیمت پر خرید فرماتے۔ مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی کے پاس استنبولی طباعت کی دسوقی شرح مختصر معانی تھی جس کے حاشیہ پر مختصر اور حوض میں شرح تھی، مولانا کے پاس جو دسوقی تھی اس میں کئی کتابیں تھیں، مولانا کی خواہش تھی کہ ایسی دسوقی ملجائے جس کے ساتھ اور کتابیں نہ ہوں، مولوی نجم الحسن نے اپنی کتاب دکھلائی تو پھڑک گئے۔ فرمایا کہیں ایسی دسوقی ملجائے تو مجھے ضرور منگا دو، شاگرد تھے مزاج شناس، کہنے لگے اگر حضرت اپنے مجموعۂ شروح تلخیص کے ساتھ مصفّٰی شرح مؤطا عنایت فرمائیں تو کتاب حاضر ہے، فوراً معاملہ ہوگیا، خود راقم السطور کی مسلم شریف کے عوض جو سبز کاغذ پر عمدہ چھپی ہوئی تھی، اپنی مسلم شریف اور الف لیلہ (عربی) کی دونوں جلدیں عنایت فرمائیں۔ بعد میں کسی وجہ سے اقالہ فرمالیا تھا۔

کرتے ہوئے سیاست سے کنارہ کشی اور علمی خدمات ہی میں توجہات کے انحصار کی التجا کی۔ مولانا نے بات کی تہ تک پہنچکر فرمایا جہاں تک علمی خدمات کا تعلق ہے حصول علم کے بعد سے کوئی دور ایسا نہیں گذرا کہ اس سے غفلت برتی گئی ہو، تحریک خلافت کی دو سالہ قید میں جیلخانہ کی چار دیواری میں بھی دوسرے فنون کے ساتھ دورۂ حدیث بھی ہوتا رہا تھا (مولانا کے ساتھ بعض تلامذہ بھی شریک حبس ہوگئے تھے) جو اصول مقصد زندگی بن چکا ہو اسے اس حیات مستعار میں کیونکر چھوڑا جا سکتا ہے۔ وفد واپس چلا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۹ء مطابق ۲ محرم ۱۳۵۸ھ کو بحکم دولت نظام مولانا کو مدرسہ کی خدمات سے سبکدوش کیے کی اطلاع متولی درگاہ معلیٰ اور معتمد مدرسہ میر نثار احمد صاحب مرحوم کے پاس آگئی مولانا کی زندگی کا یہ آخری سال تھا پورا سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ دس روز قبل ہی ۱ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ کو سفر آخرت اختیار فرمایا۔ یہ آخری سال مولانا کا بڑی عسرت کے ساتھ گذرا پاؤں سے معذوری اور مسلسل علالت کے ساتھ یہ مالی پریشانی ناقابل برداشت تھی۔

حق و صداقت اور اصول پروری کی پاداش میں یہ صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور یہ سنکر حیرت ہوگی کہ وفات کے وقت کل خزانۂ عامرہ "سولہ روپیہ کچھ آنہ خاص صندوقچہ سے نکلا تھا۔

مولانا کا سیاسی مسلک تحریکِ خلافت سے لیکر آخر وقت تک ایک ہی رہا، غیر ملکی حکومت کا خاتمہ، اور استخلاصِ وطن کی جدوجہد میں تمام اقوام ہندستان سے اشتراکِ عمل، مجلس احرار اسلام، جمعیۃ العلمائے ہند آل انڈیا خلافت کمیٹی، انڈین نیشنل کانگریس، ہر آزادی پسند جماعت کے رکن رکین تھے صوبائی اور مرکزی صدر و ڈکٹیٹر رہے۔ آخر عمر میں جبکہ ۲۰ مارچ ۳۶ء مطابق ۷ ارمحرم ۵۵ھ کو وجع الورک میں مبتلا ہو کر پاؤں سے معذور بھی ہو چکے تھے، اور اس معذوری کے باوجود سیاسی سرگرمیاں حسبِ دستور جاری بھی تھیں، حریفانِ حرص و آز اور خواہشمندانِ اقتدار نے آخری حربہ استعمال کیا۔ ایک دہلوی مرزا جو منافقت کی مکمل تصویر تھا، بظاہر مولانا کی شاگردی اور عقیدتمندی کا مدعی لیکن بہ باطن مولانا کو اپنے منصوبوں کی تکمیل میں سب سے بڑا سنگ گراں سمجھتا تھا، ایک طرف حکومت سے سازباز اور دوسری طرف مسلمانوں کا سیاسی "وکیل" بنے رہنے کی کوشش کرتا رہتا، بعض اہلِ غرض افراد کو شریک سازش بنا کر حکومتِ نظام سے مراسلت کا سلسلہ شروع کیا کہ حضور نظام جس دارالعلوم (معینیہ عثمانیہ اجمیر) کے کفیل ہوں اس کا صدر المدرسین "بارو فادار" کے حلیف کی بیخ کنی میں مصروف رہے، تحقیقاتی وفد رجب ۵۷ھ میں اجمیر پہنچا۔

اس وفد نے مولانا سے عقیدتمندانہ انداز میں ریاست کی مجبوریاں ظاہر

ایک بڑے عہدیدارِ ریاست ان کے ہمرکاب تھے، ایک مجلس میں کسی نے مولانا کا تعارف نواب صاحب سے کرایا، مولانا کے علم و فضل اور بلند شخصیت کا اظہار کرنے پر بھی نواب صاحب نے کوئی خاص اہمیت دی، لیکن جب مولانا کا امیری ہونا معلوم ہوا تو بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ دست بوسی کی، مولانا کو جلال آہی تو گیا ارشاد ہوا ہم نے ۱۴ برس حصول علم قرآن و حدیث میں آنکھیں پھوڑیں، اللہ و رسول کا علمِ دین حاصل کیا لیکن یہ علم کسی عظمت کا مستحق نہ ٹھہرا، صرف امیری ہونا سب سے بڑی کرامت ہوگئی امیر ہیں تو کافر و فاسق، کلب و خنزیر سبھی بستے ہیں، اگر صرف امیری ہونا عزت کی نشانی ہے تو مدینہ کے کافر، کتا اور سور سبھی قابل تعظیم ہوئے نواب صاحب بڑے خجل و شرمسار ہوئے۔

ایک دوسری مجلس میں یہی نواب صاحب نرالے نظام تعلیم پر تبصرہ فرما رہے تھے، اس کی فرسودگی پر دلائل پیش کر رہے تھے مولانا سے رہا گیا فرمایا کیا کریں ہم تو اسی نظام تعلیم پر مجبور ہیں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر تمام نرالی چیزیں بدلوا دیں نماز، روزہ، حج، اور زکوٰۃ سب نرالی چیزیں ہو چکیں جب تک یہ جاری رہیں گی ہدایہ، شرح وقایہ، اور قدوری وغیرہا کا درس بھی جاری رہے گا آپ ان سب چیزوں کو بدلدیں ہم سا نظام تعلیم خود بخود بدل جائے گے اس طرح وہ نواب صاحب خاموش ہوئے۔

وغیرہ سب بند کرادیا، میرے قیامِ اجمیر کے زمانے میں ایک مرتبہ
محرم جمعہ کو پڑا۔ عین جمعہ کی نماز کے وقت درگاہ کے متصل بازارو
نقاروں اور شور و شغب کا طوفان برپا ہوا۔ جمعہ کی نماز کے بعد خدا کا
کھڑا ہوا اور جامع شاہجہانی میں تحفظ ناموسِ اسلام پر ایسی مدلل و پر
تقریر کی کہ ہزارہا مسلمانوں کا یہ اجتماعِ عظیم زار قطار رو رہا تھا، ایسا
ہوتا تھا کہ مولانا بھولا . . . . ہوا سبق قوم کو یاد دلا رہے ہیں۔ عوا
رجحان کے خلاف آواز اٹھانا بھی بڑا جہاد ہے۔ ایک مرتبہ شب کو
جلسہ میں شاہجہانی مسجد میں تقریر فرما رہے تھے کہ اطلاع ملی کہ دہا
سے متصل محلّہ میں مسلمان ناچ دیکھنے میں مشغول ہیں، کسی تقریب میں
مسلمان صاحب نے رنڈی کا ناچ کرایا تھا، تقریر سے فارغ ہو کر کچھ
کو لے کر چل پڑے، مولانا کو آتا دیکھ کر بعض مسلمان وہاں سے ٹل گئے
اپنے مشاغل تفریح میں خلل انداز دیکھ کر آمادہ پیکار ہوئے۔ ایک بلن
پر پہنچکر مولانا نے پیغامِ حق پہنچانا شروع کیا، اس طرح وہ مجلس رقص و
محفل وعظ و نصیحت سے بدل گئی۔

اس معاملہ میں مولانا کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے سامنے بھی نہ
جھکتے تھے ۱۳۵۲ھ میں جب حج کے لئے روانہ ہوئے تو آپ کو ایسی
پر جگہ ملی جس پر ملکہ دکن سفر کر رہی تھیں، نگران کار کے طور پر خطاب یا

اپنا حصۂ مکان ان کے نام کر دیا، اور خود عمر بھر کرایہ کے مکان میں رہے
صرف آخری ایک سال اپنے معمولی تیار کردہ مکان میں شہر سے دو میل
دور گور غریباں میں مع اہل وعیال گذارا،
آپ کے دو علاتی بھائی بھی تھے، ان دونوں کی پرورش و تعلیم و تربیت
اولاد کے مثل کی، مولوی قاری محی الدین اجمیری عرف پیارے میاں اور محمد میاں
آپ ہی کے پاس رہے آخر الذکر کا انتقال مولانا
کے دو سال بعد مولانا ہی کے مکان پر ہوا، اول الذکر خلافت کمیٹی کے
سکریٹری بننے کی وجہ سے بمبئی چلے گئے تھے اور وہاں سے آنے پر متاہل
ہونے کے بعد علیحدہ اقامت گزیں ہو گئے۔ اچھے مقرر اور اسا پردازیں
اجمیر کی سیاست میں کافی ہاتھ رہتا ہے درگاہ کمیٹی اجمیر کے ممبر بھی ہیں
اعلاء کلمۃ اللہ اور اعلان حق میں بڑے جری تھے حکومت ہند، سرادان
وطن، اور فساق مسلمانان سے حرمت امور شرعیہ وملکیہ پر مقابلے رہے
احاطۂ درگاہ میں فاحشہ عورتوں کا گانا ہوتا، رنڈیوں کا اجتماع رہتا مولانا
نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا، مسلمانوں کی ایک دیندار جماعت کو
ساتھ لے کر آواز اٹھائی، دنیادار اور عیش پرست طبقہ آڑے آیا، بالآخر
حق کی فتح ہوئی اور جناب میر نثار احمد متولی درگاہ معلی نے یہ اعلان کر دیا
کہ رنڈیاں فاحشہ بھی نقاب کے بغیر داخل احاطہ نہیں ہو سکیں اور ان کا گانا

دوستوں کے ساتھ جس اخلاص سے پیش آتے اس کی نظیر کم دیکھنے میں آتی ہے۔ دوستی تعلقہ داروں، نوابوں، ساہوکاروں سے نہیں بلکہ غریب طبقہ کے افراد سے تھی، حکیم سید انظار الحسن خیرآبادی عرف سید میاں، بابو عبد الحکیم، منشی رمضان بخش، اور حاجی عبد الستار، یہ چار مخصوص مخلصان باوفا اور محبان بے ریا تھے۔ دوسرے تیسرے روز ان کا حاضر خدمت ہونا، دکھ درد میں شریک رہنا، اور مشوروں پر عمل کرنا، ان کے لئے لازمی تھا، مولانا کے قایم کردہ دارالعلوم حنفیہ صوفیہ کا خوش اسلوبی سے چلانا اور اس کے لئے سرمایہ کا انتظام کرنا، انھیں حضرات کے سپرد تھا، انھوں نے آخر وقت تک حق رفاقت ادا کیا، نزاعی کیفیت میں پلنگ کی پٹی سے جدا نہ ہوئے، روح نے قفس عنصری سے انھیں کے ہاتھوں پر پرواز کی۔ یہ تھا اخلاص و محبت اور دوستوں کا حق رفاقت! [۱]

رشتہ داروں سے بڑی محبت سے پیش آتے، آپ کا دو منزلہ عالیشان آبائی مکان درگاہ کے بالکل متصل ہے، اب برادر خرد شفاء الملک حکیم نظام الدین کی قیام گاہ ہے، مولانا چونکہ شہر کے شور و شر کو علمی مشاغل کے لئے مضر سمجھتے تھے اور فطرۃً تنہائی پسند واقع ہوئے تھے اس لئے کرایہ کے مکان میں شہر کی چپقلشوں سے دور پہاڑی پر سکونت پذیر ہوگئے تھے، برادر زادہ حکیم نصیر الدین ندوی سے غیر معمولی محبت کرتے تھے اس لئے

[۱] مولوی محمد اللہ خطیب جامع مسجد جے پور، مسٹر عبد الرحمٰن نصیر آبادی اور مولوی سیٹھ ظہور محمد قریشی رئیس

سن شعور کو پہنچکر عالم آخرت کو سدھار چکے تھے، اس پر بابا کے دربار میں طالب علم بیٹے کی یہ قدر تھی کہ معمولی کھدر کا لباس استعمال کراتے اور کوئی موجودہ فیشن کی چیز نہ استعمال کرنے دیتے، ہم پیر دلی کمرے میں تین سال سے زیادہ رہے۔ اس درمیان میں کبھی بیوی صاحبہ یا صاحبزادی صاحبہ کی آواز باہر سننے میں نہیں آئی حالانکہ صرف چند گز کا مشکل سے فاصلہ تھا آپ کو سنکر حیرت ہوگی کہ زمانہ علالت و نزاعی کیفیت میں بھی رونے کی آواز نہ سنی جاسکی بلکہ اس تہیدِ علم و عمل کی وفات اور روانگی جنازہ پر بھی جبکہ ہم تمام حلقہ گوش اعزہ و احباب داماں صبر ہاتھ سے چھوڑ چکے تھے، وہ پیکرِ استقامت اور حالتیں رسول کی تربیت یافتہ خواتین بدستور کوہ عزم و وقار بنی رہیں! دھڑاشا ہے کہ گھر کے اندر بھی آواز گریہ کسی مرد نے سنی یہ بھی صحیح تعلیم اور سچی تربیت!

عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ تھا، میرے علم میں ہے کہ بعض غریب عزیز اکثر آکر مہینوں رہتے کتنے ایسے بھی تھے جن کی مستقل امداد کرتے، تیں ہمشیرگاں میں سے دو بیوہ حیات تھیں جن میں سے ایک بیوہ اور ضرور تمند تھیں ان کی ہر ماہ مستقل طور پر خبرگیری فرماتے یہ سب سے بڑی بہن تھیں ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ مطابق یکم فروری ۱۹۳۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔

چودہ پندرہ سال تھی کھانا لاکر ساتھ کھاتے، اور اس کے بجائے کہ ہم خدمت کرتے اُلٹی ہماری خدمت کرتے، اس پر بھی حضرت کا اصرار یہی تھا کہ ہمارے کھانے کا بار خود اٹھائیں، بڑی التجاؤں کے بعد یہ صورت گوارا فرمائی گئی کہ جتنے افراد کا کھانا پکتا ہے اور جتنا اس پر صرف ہوتا ہے اسی حساب سے مصارف ادا کئے جائیں۔ چنانچہ آخر تک یہی سلسلہ رہا، اہل وعیال کی تربیت اس طرح فرمائی تھی کہ بچوں کو کبھی اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی طرف راغب نہ دیکھا۔ باقی میاں سلمہ کے متعلق جب کبھی ہم لوگ توجہ دلاتے تو فرماتے کہ انکو طالب علم بنکر ہی رہنے دو، صاحبزادہ بنا کر رکھا گیا اور تم میں سے کبھی کوئی میرے بعد ادھر آنکلا تو کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ ملے گا۔ بیوی صاحبہ کا یہ عالم تھا کہ دونوں وقت اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کرکے ہم پانچ طلبہ کو اوقات مقررہ پر بھیجتیں، صبح کو ناشتہ نماز کے بعد ہی تیار کردیتیں، مہینوں ایسا ہوا ہے کہ حضرۃ الاستاذ نے صبح کی نماز گور غریباں سے آکر درگاہ کی اکبری مسجد میں پڑھی ہے اور ہم دونوں نے بھی پہاڑی سے اتر کر وہیں جاکر نماز ادا کی ہے۔ اس کے فوراً بعد بیضاوی یا کسی دوسری کتاب کا سبق شروع ہوگیا ہے۔ ان ایام میں ہمارے چلنے سے پہلے جبکہ کافی اندھیرا ہوتا تھا ہمیں چار اور ناشتہ تیار ہوکر اندر سے آجاتا تھا۔ لا ہو لے باقی میاں سلمہ ہوتے تھے۔ باقی میاں تنہا صاحبزادے تھے، ان سے پہلے دو بھائی

طابق ماہ جمادی ۱۳۴۹ھ تسمہ کو حمداللہ ہدایہ اولین، شرح ہدایۃ الحکمۃ، اور
میر زاہد رسالہ کے اسباق شروع کرائے گئے۔ ہم دونوں کو اپنے دو لکڑہ
میں رہنے کا حکم دیا، اس وقت تارا گڑھ کے راستہ میں پہاڑی پر ایک مکان
میں اہل وعیال کا قیام تھا، خود حضرت شہر سے دو میل دور گور غریباں کی
ایک مسجد سے متصل حجرہ میں قیام فرماتے تھے، وہیں حضرت کا کتب خانہ تھا،
دو تین طلبہ بھی وہاں رہتے تھے جن کا کھانا پہاڑی سے تیار ہو کر وہیں
پہنچتا تھا، صبح کی نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر دو میل چل کر دارالعلوم
معینیہ عثمانیہ درگاہِ معلی کی مسند تدریس کو رونق بخشتے، ۱۲ بجے تک سات
آٹھ اسباق پڑھا کر ٹھیک دوپہر میں چار پانچ فرلانگ، چڑھائی کی مسافت
طے کر کے پہاڑی پر تشریف لاتے کھانا تناول فرما کر کچھ دیر قیلولہ کر کے
ظہر کی نماز جماعت سے ہم لوگوں کے ساتھ ادا فرماتے اور یہیں عصر تک
پڑھاتے رہتے، عصر کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے مستقر گور غریباں
چلے جاتے، شب کو وہیں مطالعہ کتب، فتویٰ نویسی، اور دوسرے علمی مشاغل
میں مصروف رہتے، یہ معمولات جاڑے، گرمی، اور برسات تینوں موسموں
میں اسی التزام کے ساتھ پورے فرماتے، ان تین طلبہ کے ساتھ ہم دونوں کا
کھانا بھی اندر ہی سے آتا ایک خورد سال صاحبزادی اور بی بی صاحبہ کے سوا
کوئی ملازمہ بھی نہ تھی، خلف رشید مولوی عبدالباقی سلمہ جن کی عمر اس وقت

وہاں سے رخصت ہو کر مکان اور مکان سے ۴ر شعبان ۱۳۵۴ھ مطابق یکم نو۔ ۱۹۳۵ء کی صبح کو وارد اجمیر ہوا، دولتکدہ پر پہنچکر معلوم ہوا کہ ہسپتال میں صاحب فراش ہیں، اربٹھ پھوڑا گردن پر نکلا تھا جس کا آپریشن ہو چکا ہے، میں سیدھا ہسپتال پہنچا، حضرت چارپائی پر استراحت فرما تھے، اردگرد تلامذہ اور عقیدتمندوں کا ہجوم تھا، کچھ دیر بعد باریابی ہوئی، مسرت و شفقت کا اظہار فرماتے ہوئے وہیں قیام کا حکم دیا، تقریبًا دو ہفتے وہاں رہ کر خدمت کی سعادت نصیب ہوئی۔

اس پھوڑے کی رگیں مغز دماغ تک پہنچ گئی تھیں، چنانچہ آپریشن کے وقت آلات سے ایک ایک رگ کو نکالا گیا، اور یہ سنکر حیرت ہوگی کہ ادویہ بیہوشی وغیرہا کے بغیر آپریشن کرایا، فرماتے تھے کہ فلسفہ کا ایک مسئلہ سامنے رکھ لیا تھا اس کے حل کرنے میں منہمک ہوگیا اور اس کا پتہ بھی نہ چلا کہ گوشت کہاں سے اور کتنا کاٹا گیا۔ جو لوگ موجود تھے وہ بھی حیرت زدہ تھے، یہ تھا علمی استغراق!

ہسپتال سے نکلکر کچھ دن کے لئے تبدیلِ آب وہوا اور ضروریات دار العلوم حنفیہ صوفیہ اجمیر کے پیشِ نظر احمد آباد کا سفر فرمایا، میں بھی ہمرکاب رہا، رمضان میں واپسی ہوئی، شوال میں میرے ہمدرس و رفیق عزیز مولوی سید نجم الحسن خیر آبادی کے پہنچ جانے پر سلسلۂ درس شروع ہوا، چنانچہ ۲۲ر شوال ۱۳۵۴ھ

مطالعہ کیا اور اس کا سلسلہ تادم تحریر جاری ہے لیکن ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، دو مرتبہ خود جاکر پیہم تقاضے کئے ہر طرح منت سماجت کی مختلف دوستوں کو واسطہ بنایا لیکن لاحاصل رہا۔

بیشکار سعید الدین صاحب نے کیوں وہ مجموعہ دینے کو تیار نہیں حالانکہ ان کے شہر اور دیار کے ایک باکمال روزگار کے کمالات علمی وعملی سے دنیا روشناس ہوتی جو ان کے لئے بھی باعث افتخار ہوتا اگر اس وقت وہ مواد میری نظر ہوتا تو بعض اہم حصول کا اور اضافہ ہوسکتا تھا

میں رجب ۱۳۵۵ھ کے پہلے ہفتے میں سلسلۂ عرس حضرت خواجۂ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ، اجمیر حاضر ہوا تھا، اس وقت حیدرآباد میں ہدایہ، بیضاوی، میر زاہد رسالہ وغیرہا زیر درس تھے، دار العلوم معینیہ عثمانیہ کے دورۂ حدیث کے طلبہ کے امتحان اور دستار بندی کے سلسلے میں حضرت میر نثار احمد متولی درگاہ ومہتمم دار العلوم کے دولتکدہ پر علماء ومشائخ کا اجتماع تھا، میں بھی حاضر ہوگیا، سب سے پہلی بار یہیں حضرۃ الاستاذ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اس اجتماع اماثل میں علم وفضل کا یہ تلل جھک رہا تھا، گفتگو میں سب پر چھایا ہوا تھا ہر بات دلنشیں ہوتی چلی جاتی تھی جی لے اسی ڈیوڑھی کی کی دریوزہ گری کی ٹھانی، دوسرے وقت دردولت پر حاضر ہوکر مدعا ظاہر کیا، بڑی خندہ پیشانی سے شرف پذیرائی بخشا گیا، میں حیدرآباد واپس ہوا اور

یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک عاشورہ محرم میں جب لوگ
واقعۂ کربلا سے سوگوار تھے، اس شہید علم و عمل نے دنیا سے کوچ کیا،
اور اجمیر میں اہلِ دل نے دوہرے محرم کا سوگ کیا"!

میری باریابی و حاضری

علامہ سید سلیمان ندوی کی زبانی حضرۃ الاستاذ کی مختصراً ۶۰ سالہ کہانی
آپ سُن چکے، میں نے چاہا تھا کہ فاضل اجمیری کی وفات کے بعد معین
اخبار اجمیر کا "مولانا معین الدین نمبر" نکلجائے، تاکہ زندگی کے ہر پہلو پر مختلف
اہلِ قلم روشنی ڈال سکیں، ادارۂ معین پہلے ہی سے تیار تھا میری گفتگو کے
بعد اس نے نمبر نکالنے کا اعلان کر دیا، میں نے حضرۃ الاستاذ کے تلامذہ
اور عقیدتمند احباب کو توجہ دلائی اکثر نے کچھ نہ کچھ لکھکر بھیجا، ہندستان کے
مشہور شعراء نے قطعات تاریخ لکھے وہ بھی ایک جگہ جمع کئے۔ خود میں نے
مفصل سوانحعمری لکھی، جب سب مواد اکٹھا ہو گیا تو مسٹر سعید الدین پیشکار
درگاہ معلیٰ کے (جو اس وقت معین کے مہتمم خاص تھے) حوالہ کر دیا، اور ظاہر
ہے کہ اجمیر میں قیام کی وجہ فاضل اجمیری سے استفادہ و استفاضہ تھا۔
اس کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا کچھ روز قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد وطن واپس
چلا آیا، میں نے ادارۂ معین کو بار بار توجہ دلائی دو ایک بار خود بھی جا کر
گفتگو کی لیکن وعدوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا، مجبور ہو کر جمع کردہ مواد کا

کے مہیا فرماتے، کلکتہ کے بہترین کارخانہ میں بھجکر اعلیٰ قسم کی جلدیں مدھواتے تھے،

۵ محرم الحرام ۱۳۵۳ھ کو ایسے بیمار ہوئے کہ آخر وقت تک پاؤں سے معذور رہے، دل ودماغ اللہ صحیح رہے، اور اس حالت میں بھی سلسلۂ درس وتدریس جاری رہا، وفات سے دس یوم پیشتر تک حدیث کے اسباق ہوتے رہے، زندگی ہی میں عرصۂ دراز سے گور غریباں کو اپنا مسکن بنالیا تھا، احباب کے اصرار سے وہیں ایک مختصر مکان بن گیا تھا، جس کی تکمیل دارالعلوم کی اس رقم سے ہوئی، جو کمیٹی نے بطور اعتراف خدمات مولانا کو پیش کی تھی، اسی مکان میں مولانا کا انتقال ہوا، ہزارہا مسلمانوں نے جنازہ میں شرکت کی، جنازہ کی چارپائی میں لمبی لمبی بلیاں باندھی گئی تھیں، ایک وقت پچاسوں مسلمان کندھا دیتے تھے پھر بھی ہجوم اور لوگوں کے اشتیاق کی کوئی حد نہ تھی، خواجہ اجمیری کی درگاہ میں مسجد شاہجہانی کے زیر سایہ تدفین ہوئی، قبر میں اتارتے وقت در ودیوار اور درختوں پر انسانوں کا ہجوم تھا، پسماندگان میں دو بچے (مولوی عبدالباقی صاحب اور ایک صاحبزادی) اور ایک بیوہ ہیں،

اجمیر کے قیام کی مدت ۲۴ سال اور کل مدت حیات ۷۱ سال ہے!

علی ابیك بعد الیوم" (آج کے دن کے بعد تمہارے باپ پر مصیبت نہیں ہے)
تو اس جملہ پر حضرت مولانا بیتاب ہو جاتے، آنسو نکل آتے، چیخ نکل جاتی،
بسا اوقات غشی طاری ہو جاتی، مدرسہ میں درس دیتے وقت ہر مرتبہ
یہ واقعہ پیش آیا ہے"!

طلبہ اور علماء سے بہت محبت فرماتے تھے، ہونہار طالب علم مولانا کا
مرکزِ توجہ بن جاتا تھا، ہر سال موسم بہار میں طلبہ کا ایک تفریحی جلسہ
جس کو اجمیر کی اصطلاح میں "گوٹ" کہتے ہیں منعقد ہوتا، اس جلسہ میں
ہر ملک کے طلبہ کے مروجہ کھیلوں کا مظاہرہ ہوتا تھا، مولانا طلبہ
کی خاطر اس تفریحی اجتماع میں بھی شرکت فرماتے، بیت بازی ہوتی،
اس میں ایک فریق کی طرف مولانا بھی ہوتے آپ ہی کا فریق اکثر
غالب رہتا، اس لئے کہ مولانا کو اردو و فارسی کے ہزارہا اشعار
یاد تھے؛

یہ واقعہ حیرت کے ساتھ سنا جائے گا، کہ ڈیڑھ سو روپیہ مشاہرہ
پاتے تھے لیکن تیس روپیہ ماہوار کے سوا، باقی پوری رقم طلبہ، سامانِ
تعلیم اور نادر کتب کی فراہمی پر صرف کر دیتے تھے، کتاب کتنی ہی قیمتی
ہو، لیکن امکان بھر اس کو ضرور خریدتے، اور خواہ دوگنی، سہ گنی قیمت
ادا کرنا پڑتی، مگر بہتر نسخہ خریدتے، قرآن پاک بہتر سے بہتر طباعت

فرنگی محلی مرحوم اسے بیعت تھے ۔

استغفار، رجوع الی اللہ توکل وغیرہ آپ کی طبیعتِ ثانیہ بن چکے تھے آخری سال تو بڑے ہی صبر و استقامت اور متوکلانہ زندگی کے تھے، درس تعلیم و افتاء اور رشد و ہدایات کی ادائیگی کے بعد کسی لوگوں میں ملاپ درست نہ سمجھتے، ارباب دولت اہل دنیا خصوصاً امراء و حکام سے ہمیشہ بے تعلق رہے لیکن جب کوئی خدمت والا اس حاضر ہوتا تو اسے قلب میں مولانا کے اخلاق فاضلہ کا خاص اثر لیکر واپس جاتا ۔

عبادت کا یہ حال تھا کہ فرائض کے سوا، نوافل و مستحبات کے بھی ہمیشہ پابند رہے تادم واپسیں اپنے اوراد و اشغال میں فرق نہ آنے دیا، حق گوئی میں کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہیں ڈرے، اسلاف کی سنت کے مطابق قید و بند کی مصیبت سے بھی دوچار ہوئے لیکن اس کو بھی خوشی خوشی برداشت کیا، اور ہمیشہ ذہبی کیا، جو ایک مجاہد اور ربانی عالم کو کر جانا چاہیے ۔

ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ بخاری وغیرہ میں جب یہ حدیث آتی کہ حضور کے مرض وفات کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بے اختیار کار اٹھیں، "یا ابتاہ" (اے میرے باپ) سرکار دو عالم نے فرمایا، "لا کرب

بدعات کا خاتمہ کیا، اسلامی نقطۂ نظر سے ملک کی صحیح رہنمائی میں، باوجود چند در چند مشکلات کے کبھی مطلق کمی نہیں فرمائی۔

تحریک خلافت میں مذہبی فتوی کے جرم میں دو سال کی قید و بند کو اس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادران نے قدم چوم لئے! جس زمانہ ابتلا میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماء قید و نظر بندی کی تکلیف اٹھا رہے تھے، اس وقت تحریک کی رہنمائی کے لئے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لیجاتے، اور جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مسائل حاضرہ پر تقریر فرماتے، جمعیۃ العلماء کے اجلاس امروہہ کی صدارت فرمائی، اور مستقل نائب صدر رہے، صوبہ راجپوتانہ کی مجلس خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا، تحریک کشمیر کے زمانہ میں مجلس احرار اسلام کے ڈکٹیٹر رہے مسلمانوں کے سوا برادران وطن بھی آپ کی سیاسی بصیرت کے معترف اور اس سے متاثر تھے۔

ان علمی اور سیاسی مشاغل کے ساتھ ساتھ سلوک اور تزکیۂ باطن کی طرف بھی پوری توجہ تھی، مولانا کے والد حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت تھے، اور خود مولانا شاہ صاحب کے صاحبزادہ حضرت مولانا شاہ عبدالوہاب صاحب (والد حضرت مولانا عبدالباری صاحب

سرکار نظام دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے آپ الگ ہو گئے، لیکن اس علیحدگی کے بعد بھی حلقۂ درس پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رہا،

اس زمانۂ درس و تدریس میں دوسرے علمی مشاغل بھی جاری رہے، چنانچہ مولانا نے تصانیف کا ایک معتد بہ ذخیرہ چھوڑا ہے جس کا اکثر حصہ ابھی طبع نہیں ہو سکا ہے، مثلاً ترمذی شریف کا ایک ناتمام حاشیہ[51] وجود علم و معلوم، کلی طبعی، اور مسئلہ دہر پر مکمل اور جامع تقریریں، حضرت خواجہ غریب نواز کی محققانہ سوانح عمری[52] وغیرہ ایہ چیزیں انشاء اللہ جب اہل علم کے سامنے آئیں گی، اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ اجمیر کے اس بوریا نشیں کی نگاہ تحقیق کتنی بلند تھی،

آخری زمانے میں درگاہ ل کی اصلاح کے متعلق جو دستور مولانا نے مرتب فرمایا تھا، وہ اس قدر جامع اور موثر تھا کہ ایک طرف تو ہندستان اور حرمین کے علما نے اس کی تاکید کی، اور دوسری طرف ممبران اصلی نے اس ل کے ان تمام نقائص کو دور کیا جن کا شریعت اسلام سے تصادم ہوتا تھا،

یہ تھی مولانا کی علمی زندگی، عملی زندگی کا یہ حال تھا کہ اجمیر میں صدہا

---

[51] شاہ خواجہ کے نام سے حلاقی نشہ میں شائع ہو چکی ہے ۱۲ مشاہد ترابی۔
[52] اسامہ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے ۱۲ مشاہد سروانی۔

خالص علمی مسئلہ پر ہوا تھا جس کا نتیجہ بصورت کتاب شائع ہو چکا ہے۔
ڈھائی سال مدرسۂ نعمانیہ لاہور میں صدر مدرس رہنے کے بعد ۱۳۲۶ھ میں اجمیر کو شرف سکونت بخشا، اور ۱۳۲۷ھ میں مدرسہ معین الحق قایم کیا۔ سرکار نظام جب اجمیر تشریف لائے اور حضرت مولانا کے درس میں مسلسل چھ وقت شریک ہوئے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ خلعت شاہانہ سے سرفراز فرمایا اور مولانا انوار اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر مدرسہ معین الحق کو معینیہ عثمانیہ قرار دیکر ساڑھے بارہ سو روپیہ ماہانہ اس کے لئے جاری فرما دیا۔ مولانا اس مدرسہ کے صدر مدرس ہوئے اور پندرہ سال تک یہاں درس دیا ۱۳۴۲ھ میں کارپردازان مدرسہ اور مولانا میں اختلاف ہوا، چنانچہ انھوں نے استعفا دیکر محرم ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم حنفیہ صوفیہ کے نام سے ایک دوسرا مدرسہ قایم فرمایا اور ۱۲ سال تک اس مدرسہ کے طلبہ کو اپنے فیوض علمی و عملی سے سرفراز فرمایا۔ یہ مدرسہ اب تک قایم ہے اور شہر کے غریب مسلمان اس کو چلا رہے ہیں، دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے علیحدگی کے باوجود اس کے اراکین، مدرسین، طلبہ اور دیگر متعلقین سے تعلقات خوشگوار رہے، ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ کے اراکین حضرت مولانا کو پھر اپنے یہاں واپس لائے لیکن سیاسی اختلافات کے نتیجہ کے طور پر ۱۲ مارچ ۱۹۳۶ء مطابق ۱۳۵۵ھ کو بحکم

حد معقول و منقول کی تکمیل مولانا برکات احمد صاحب ہی سے ہوئی،
علم ریاضی حضرت مولانا لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل
فرمایا بائیس سال کی عمر میں علوم میں ایسا رسوخ ہوگیا کہ جس کی نظیر
کم دیکھی گئی ہے۔ اسی وقت سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوگیا
ہندستان اور بیرون ہندستان سے ماورالنہر، بخارا، میں، افغانستان اور دوسر
ممالک سے طلبہ جوق در جوق آنا شروع ہوگئے۔ اسی زمانہ میں ایک
خاص واقعہ نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے واقعہ یہ ہے کہ مولانا
عبدالحق صاحب صاحب تفسیر حقانی کے زیر اہتمام آریوں سے ایک
مناظرہ ترتیب پایا تھا آریوں کی طرف سے پنڈت دیانند جی
بحث کر رہے تھے مسلمانوں کی طرف سے بھی بڑے بڑے مناظر
گفتگو کر رہے تھے، تین دن سے سلسلہ جاری تھا جب مولانا کی باری
آئی تو آپ نے روح، مادہ، پرمیشر کی قدامت کے سلسلے میں حدوث
و قدم کی طویل بحث کو اس خوبی سے بیان فرمایا کہ صرف ہمت
میں پنڈت جی لاجواب ہوگئے، اور موافق و مخالف آپ کے تبحر علمی
کے قائل ہوگئے۔"

اسی قسم کا ایک مکالمہ ہز ہائنس نواب حامد علی خاں مرحوم والی رامپور
کی تحریک پر مولانا عبدالوہاب صاحب منطقی بہاری مرحوم سے ایک

امیرانہ ٹھاٹھ اور رئیسانہ شان کا کبھی مظاہرہ نہ کیا!

قسمت کی خوبی اور نصیب کی بلندی نے خاتم المحققین حضرت مولانا سید برکات احمد صاحب (بہاری ثم) ٹونکی سے تلمذ کا رشتہ قایم کرایا، اس تعلق سے مولانا کا سلسلۂ تلمذ یہ ہے!

حضرت مولنا معین الدین صاحب اجمیری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولنا سید برکات احمد صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولنا عبدالحق صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولنا فضل حق صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولنا فضل امام صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ملا عبدالواجد صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ملا اعلم صاحب سندیلی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ الکل حضرت ملا نظام الدین صاحب[1] سہالوی رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] معارف: مشہور یہی ہے کہ ملا اعلم سندیلی، ملا نظام الدین سہالوی کے براہ راست شاگرد تھے مگر میری تحقیق میں یہ صحیح نہیں ہے، ملا اعلم، ملا کمال الدین سہالوی کے شاگرد تھے اور وہ ملا نظام الدین کے، میں واقعہ یہ ہے کہ ملا اعلم سندیلی دونوں کے شاگرد ہیں، ملا کمال الدین ملا نظام الدین کے ابن العم اور شاگرد رشید استاذ کے زمانے ہی میں سلسلۂ درس و تدریس کمال کو پہنچ چکا تھا، میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تحریر مآثر الکرام کے وقت بقید حیات تھے ۱۱۷۵ھ میں وفات ہوئی۔ اور ملا نظام الدین نے قریبی زمانے میں یعنی ۱۱۶۱ھ میں صرف ۱۴ سال قبل رحلت فرمائی تھی۔ ملا اعلم کا دونوں کا شاگرد ہونا مولانا حکیم سید برکات احمد نے حسرۃ العلما

مجاہدہ واستقامت، اور تقویٰ و طہارت کی ایک ایسی مسند خالی ہوئی جو غالباً عرصہ دراز تک خالی رہے گی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس سے ہماری مراد حضرت مولنا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا سانحہ ارتحال ہے، یہ حادثہ محض مولانا کے اہل خاندان یا مسلمانان اجمیر ہی کے لئے نہیں ہے، بلکہ سارا اسلامی ہند اس سے متاثر اور اسی غم میں پر نوحہ کناں ہے۔

وما کان قیس هلکہ هلك واحد
ولکنہ بنیان قوم تهدما

مولنا ایک نومسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، والد ماجد مولنا عبدالرحمن صاحب مرحوم ٹلیا کے رہنے والے نومسلم راجپوت تھے اور والدہ بھی داخل اسلام ہوئی تھیں، اور دانا پور (بہار) ان کا گھر تھا تعلق راجوتانہ سے اس طرح پیدا ہوا کہ مولانا عبدالرحمن صاحب ریاست ٹونک میں سیکرٹری کونسل تھے چار پانسو روپیہ ماہانہ تنخواہ تھی اسی علاقہ میں دیولی (راجوتانہ) میں ۲۵ صفر ۱۲۹۹ھ کو پیدا ہوئے اور ماں باپ کے زیر سایہ زندگی کی ابتدائی منزلیں طے ہوئیں، بچپن ہی سے سعادت و بزرگی کے آثار نمایاں تھے، چنانچہ دولت و ثروت کی گود میں پلنے والے اس نوجوان نے ہمیشہ طالب علموں میں مساوات ہی کی زندگی بسر کی،

کار ائقہ وخیریت مزاج سے یاد فرماتے رہیں گے۔ حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی غیر مطبوعہ تصانیف کا سلسلۂ اشاعت عنقریب شروع کیا جاویگا اور انشاء اللہ جناب کے لئے اس کے مطالعہ کا موقعہ ہوگا۔ فقط

نیازمند

کمترین ابو الحسنات محمد احمد الہاشمی معالج خصوصی فرمانروائے ٹونک

ناظم اعلیٰ و صدر المدرسین دار العلوم نظامیہ خلیلیہ ٹونک (راجستان)

علامۃ الہند مولانا معین الدین الاجمیری رح

۲۵ صفر ۱۲۹۹ھ ـــــ ۱۰ محرم ۱۳۵۹ھ

البحر العلام، والبحر القمقام، اللوذعی الفہامۃ، والمنطیق النکلامۃ، علامۃ الہند حضرۃ الاستاذ مولانا الحاج معین الدین الاجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کے بعد، ہندستان کے مشہور فاضل علامہ سید سلیمان ندوی نے معارف اعظم گڈھ، اپریل ۱۹۴۰ء میں جو تعزیتی مضمون سپردِ قلم فرمایا تھا پہلے وہ نقل کرتا ہوں اس کے بعد اپنی معلومات ومشاہدات کا کچھ حصہ مختصر طور پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔

"۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ عین عاشورہ کے دن علم وعمل فضل وکمال

میرے نام منتقل ہوچکی ہے، میں ذمہ دارانہ حیثیت سے کام کررہا ہوں نیز
مدریس کا سلسلہ باقاعدہ ۱۳۰۳ھ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء سے جاری
کررکھا تھا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی کی وجہ سے غیبت کی
واسطہ تھا اور فرائض مستحب کا درجہ رکھتے تھے، اب فرائض فرائض
ہیں خدا کے فضل سے دار العلوم کے کل طلبہ پورے جوش و مستعدیت
کے ساتھ تعلیم حاصل کررہے ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مجھے اپنا
تدریسی نظام الاوقات بدل دینا پڑا۔ اپنے اکثر اسباق ماتحت مدرسین کے
پاس منتقل کرنا پڑے تاکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقہ اسباق اپنے ذمہ
لے سکوں، چنانچہ میں نے ایسا کیا، پھر میں نے حضرت موصوف کے بعد
مولانا عبدالرحمن جیسی دستاگر درشید حضرت رحمۃ اللہ علیہ و مدرس مدرسہ
منصوری دہلی کو بیا اسسٹنٹ کرکے بلالیا ہے۔ اور وہ بھی مصروف
تدریس ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ اعلم حضرت مولانا نصیر احمد
صاحب مدظلہ خصوصیت کے ساتھ درس تفسیر و حدیث میں مصروف
ہیں مجھے امید ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فیض علمی انشاء اللہ
ہمیشہ اسی طرح جاری رہے گا اور آپ اس کے لئے اوقات مخصوصہ
میں دعا فرمائیں گے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار میں ایک مسجد اور
چاہ کا بھی سنگ بنیاد رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ آپ حسب مراسم قدیم

اسرارِ الٰہی میں سے تھا کہ تین روز سے آنکھوں میں ایسی غیر معمولی چمک دمک اور دلآویزی اور جاذبیت پیدا ہو گئی تھی کہ عام عیادت کنندگان نے بھی اس کا احساس کر لیا تھا اور ایک دوسرے سے متعجبانہ تذکرہ کرتے تھے۔ آہ وہ آنکھیں تین بجے شب کو ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں لیکن قلب برابر ۵ بجے تک جاری رہا۔ عوام اس واقعہ کو بنظر استعجاب دیکھتے تھے اور حقیقت شناس حضرات کہتے تھے۔ "للہ الحمد ٹھکانے لگی محنت انکی"

حکامانِ ریاست نے تمام دفاتر سرکاری میں جنازہ و نمازِ جنازہ میں شرکت کے واسطے عام اجازت دی۔ اور دارالعلوم خلیلیہ میں نمازِ اولیٰ ادا ہوئی اور چوک دفاتر کے قریب ترصحرا میں نمازِ ثانی ادا ہوئی، دوسرے روز حسب فرمانِ خسروی، ریاست میں تعطیل ماتمی ۱۹ اگست ۱۹۲۶ء کو دی گئی۔

فقیر حقیر پر غم کا جو پہاڑ ٹوٹا اور سر سے جو سایۂ طوبیٰ اٹھا، ایک طرف ذمہ داریوں کا طوفان امنڈ آیا وہ سب سے بالاتر ہے۔ کمترین نے ایک ہفتہ بعد (یعنی ٹھیک اس روز سے جب اعلیٰ حضرت ...

... سرکارِ عالی وقار دام ملکہم و اقبالہم نے تشریف ارزانی فرما کر رسمِ تعزیت ادا فرمائی اور فرمایا کہ اب فرائضِ منصبی یعنی معالجۂ سرکاری و محلاتِ حضوری، انجام دو اور مدرسہ کا کام شروع کرو) سب کام شروع کر دئے ہیں۔ وعلی اللہ التوکل وبہ الاعتصام، سرکاری معالجہ کی خدمت اگرچہ باقاعدہ مع تنخواہ چہار صد روپیہ و جاگیر موضع ٹھکریہ، اپریل ۱۹۲۶ء کی

ایسے قوی تر اور روشن دلائل و حجج ساطعہ اور براہین قاطعہ سے ثابت
کیا گیا ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جیسا امام وقت ہی کر سکتا تھا۔ تیسری
کتاب تصوف کے مسائل مشکلہ کے حل میں بہترین کتاب ہے۔ ان
ہر سہ کتب کی تصانیف شروع مرض میں اس امر سے مطلع ہونے کے
بعد کہ اب دنیا سے کوچ ہے، شروع کی گئی اور وفات حسرت آیات
سے چند ساعت پیشتر اختتام کو پہنچائی گئیں[1] یوم الرحیل میں بعد عصر
سے مغرب تک عیادت کے واسطے جوق جوق لوگ آتے رہے نہایت
متبسم چہرہ اور خندہ پیشانی سے بات چیت اور تلقین ارشاد میں مصروف
رہے نماز مغرب سے فارغ ہونے کے بعد عشاء تک درود و وظائف
کا سلسلہ جاری رہا اور عشاء کے بعد خلاف معمول مدت دراز کے بعد
تناول طعام فرمایا تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ دس بجے تک آرام فرمایا۔ پھر
پوری قوت کے ساتھ بیدار ہو کر دو بجے تک اولاً تلاوت قرآن شریف
اور پھر ذکر بالجہر میں مصروف رہے دو بجے سے جہر کی شدت میں
فرق آنا شروع ہوا اور یٰسین شریف جو ایک مدت سے رات کو
پڑھی جاری تھی ختم کرائی اور پھر ذکر میں مصروف ہوئے تا آنکہ ٹھیک
۳ بجے اسی حالت میں جان بحق تسلیم ہوئے اور وہ زبان ہمیشہ کے لئے
بند ہو گئی جس کی تذکیر و تلقین سے عالم گونج اٹھا، خدا جانے یہ کیا

[1] آپ کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں: الرسالۃ طرد، الفتاوی کبریات، تحقیق اہل السرائر، الصمصام القاطع، التحاف سماس

غرۂ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ کو شب کے ۳ بجے غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تھدما

وفات شریف سے ایک شب پہلے وصیت فرمائی کہ

"میرے مدرسہ[1] اور رباط[2] کا پوری طرح خیال رکھنا، درس تدریس کا سلسلہ پوری قوت کے ساتھ قایم رکھنا، میرے والد ماجد (حضرت مولانا حکیم دایم علی صاحب بہاری) رحمۃ اللہ علیہ کا عرس ضروری جاری رکھنا، میرے فاتحہ کا بہت خیال رکھنا"

دورِ علالت کامل پانچ ماہ قایم رہا مگر ایک روز بھی مشغلۂ علمی ترک نہ ہوا۔ جمعہ کے روز حضرت کی زندگی کا اخیر دن اور یوم الرحیل تھا میں جمعہ کی نماز سے واپس ہوا تو التعرف فی حقیقۃ التصوف کے مطالعہ میں مستغرق تھے۔ انھیں ایام علالت میں تین عمیق علمی تصانیف فرمائیں جن کا اختتام زندگی کے لمحات کے اختتام کے ساتھ ہوا ہے۔ اور جن کو حضرت علیہ الرحمۃ کے معلومات کا نچوڑ سمجھنا چاہیے۔ اور جن میں امتناع نظیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وامتناع کذب الواجب جل مجدہ کو

---

[1] دار العلوم نظامیہ خلیلیہ ٹونک ۱۲ [2] مسافر خانہ حضرت موصوف ۱۲

ہو گیا ہے کہ ضعف معدہ کی شکایت تھی۔ سال گذشتہ اسی حالت میں ذی الحجہ
دیدار دار زیارت سلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم درج ثانی کے لئے
روانہ ہو گئے چونکہ موسم نہایت تیز و تند تھا اور طبیعت پہلے ہی سے
معطل تھی اس لئے اسہال معدی میں زیادتی پیدا ہو گئی بعد مبارک
سے معاودت فرمانے کے بعد برابر سلسلہ اسہال جاری رہا عدالتے
دو وقت کے ایک وقت ہو گئی ریاست کی کثرت، درس و تدریس
کی پوری محویت تصنیف و تالیف میں کامل انہماک کا نتیجہ یہ ہوا،
کہ ضعف یوماً فیوماً بڑھتا گیا اور مرض الموت کی ابتدا یوم عید الفطر
۱۳۴۳ھ سے اس طرح شروع ہوئی کہ سدت سے دفعۃً بخار ہو گیا اور
کامل تیئیس روز تک معارق رہا اور پھر ورم جگر، سوء القنیہ ہو کر
نوبت باستسقاء رسید، امراض کا اس طرح ہجوم تھا مگر وہاں صحت
جسمانی کی طرف تغافل اور بے توجہی کا وہی عالم تھا جو ہمیشہ رہا اور
جس نے صحت کو بالآخر اس اخیر درجہ کو پہنچا دیا۔ تکالیف کے احاطہ کی
اس طرح کوشش جاری تھی، ذکر و شغل، حبس دم، پاس انفاس کا
سلسلہ برابر جاری تھا اسی وجہ سے دو مرتبہ قے الدم بھی ہوئی، ماہ صفر
کے اخیر عشرہ میں مرض کی انتہائی سدت ذبل سویہ کی صورت میں ظاہر
ہوئی جس کی کمر درحمایت تاب نہ لاسکی اور آفتاب فضل و کمال۔

یونیورسٹیوں کے امتحانات بھی دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف نسلی بلکہ علمی یادگار بھی ان دونوں کو بنائے۔ بعض مطبوعہ اردو اور عربی علمی رسائل بھی مرحوم کی یادگار رہے ہیں انہیں میں سے "احسن الکلام فیما یتعلق بالاجسام" بھی ہے۔

وفات

ستر برس کی عمر کے بعد یکایک آپ ہستی کی اس منزل پر پہنچ گئے، جہاں انسان دنیا میں غروب ہو کر آخرت میں طلوع ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کی وفات کے حالات کے متعلق مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نجل سعید خلف ارشد مولانا حکیم محمود احمد مرحوم کے اس مطبوعہ خط کو نقل کر دیا جائے جسے انھوں نے اقطارِ ہند کے تعزیت ناموں کے جواب میں شائع فرما کر متعلقین کے پاس بھیجا تھا۔[۱]

جناب محترم ... السلام علیکم وعلی جمیع من اتبع الھدیٰ،
آنجناب کا تار و مکتوب گرامی بہ سلسلۂ تعزیت و بہ طلب حالات مفصل علالت و وفات والدی سراج الملۃ والدین حضرت مولانا برکات احمد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ موجب ممنونیت و تسکین خاطر نقیر حقیر ہوا؛ جواباً التماس ہے کہ حضرت علیہ الرحمۃ کو دو سال سے کچھ زیادہ عرصہ

---

[۱] مکرمی مولوی حکیم ظفر الحق خیر آبادی نے ۷ ستمبر ۱۹۶۲ء کو میری حاضریٔ خیر آباد پر یہ خط عاریتًہ مجھے عنایت فرمایا۔

خلف رشید مولانا حکیم محمد احمد مرحوم کی والدہ ماجدہ تھیں۔ اور محمد میاں کے سوا کوئی دوسری نسلی نشانی موجود نہیں تھی لیکن جس کی علمی دریت ریتی کے کناروں تک پھیلی ہوئی ہو کیا ہوا اگر ایک اکلوتے بیٹے کے سوا اس نے اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی'

از صدائے سخن عشق ندیدم خوشتر
یادگارے کہ دریں گنبد دوّار بماند

مولانا حکیم محمد احمد علماً و مصنفاً و دیناً و عملاً اپنے والد مرحوم کے سچے جانشین تھے۔ والد کے بعد والی ٹونک کے معالج خاص مقرر ہوئے اور موصوف کی جگہ درس و تدریس کی باگ آپ نے ہاتھ میں لی تھی کہ دو تین سال کے بعد والد ماجد کی خدمت گذاری کے لئے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ اور یہ حادثۂ علمی بالکل اسی صورت سے واقع ہوا جیسا کہ حکیم صاحب کے استاد شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادیؒ کو پیش آیا تھا شمس العلماء کے دو سال بعد ہی آپ کے صحیح جانشین مولانا اسدالحق اعزہ و اقارب کو داغ مفارقت دیکر نسلی سلسلۂ علم کو منقطع کر گئے تھے۔

مولانا حکیم محمد احمد نے دو یادگاریں چھوڑی ہیں' مولوی محمود میاں اور مولوی احمد میاں' دادا کے شاگرد مولانا محمد شریف صدر مدرس دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف کی خدمت میں رہ کر تحصیل علوم کر رہے ہیں اور

پینتیس برس تک انتظام کیا بلکہ سچ یہ ہے کہ انھوں نے ان بچوں کو مہربان ماں کی طرح پالا۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ بعض دفعہ انھیں غریب الدیار طلبہ کے مصارف کے سلسلے میں اپنے زیور خفیہ طور پر فروخت کرنے پڑتے تھے۔ طلبہ کی کیسی نازبرداری کرتی تھیں اس واقعہ سے اندازہ ہو سکے گا۔ مولوی حکیم ظفر الحق خیرآبادی کو حکیم صاحب تعلیم کے لئے ٹونک لے گئے۔ یہ استاد کے پوتے تھے اور دودمانِ عالی کے تنہا چشم و چراغ، ان پر حکیم صاحب کی توجہ و مہربانی سب سے سوا ہونا ہی چاہئے تھی۔ موصوف کے حصے میں بھی خاندانی جلال کافی آیا ہوا ہے اور وہ زمانہ تو شہزادگی اور صاحبزادگی کا تھا ہی۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ صاحبزادہ کو کھانا ناپسند ہوا یا دیر میں پہنچا تو آپ نے سالن کی رکابی اٹھا کر باہر سے حویلی میں پھینک دی اور جو کچھ جی میں آیا کہہ سنایا۔ لیکن اس نیکبخت بیوی صاحبہ نے کبھی شکایت کا ایک حرف زبان پر لانا گناہ سمجھا اور ہر طرح معذرت و خوشامد سے رضامند کرنے کی کوشش کی۔

موصوف جب اپنی زبان سے اس قسم کے واقعات سناتے ہیں تو ان فرشتہ خصلت انسانوں کے تذکرہ پر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر بیوی صاحبہ نہ ہوتیں تو شاید برکاتی سلسلے کے ان علمبرداروں کو علمی آبادیوں میں نہیں پایا جا سکتا تھا۔ آپ ہی حضرت کے

مولانا عبیداللہ الاصم البہاری، مولانا عبدالحمید ترہتی، مولانا محمد شریف مبارکپوری، مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولانا فضل کریم بہاری، مولانا احمد کریم بہاری، مولانا عبدالواسع، مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہم حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں اکثر ہندستان کے مرکزی مدارس کے صدر مدرس یا مدرس رہے ہیں اسلامی علوم کے حلقۂ علمی میں وقعت دعزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔ ان تمام حضرات کا دریائے فیض پورے ستان کے ساتھ بہتا رہا۔ ان میں سے اب جو باقی رہ گئے ہیں ان سے اجمیر، بہار، حیدرآباد وغیرہ کی مسند درس بافتار رونق مارہی ہے۔ ایک عالم دریائے علم کی ان نہروں سے سیراب ہوتا رہا اور اب بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ سیراب ہو رہا ہے۔

اہل وعیال

حضرت کی پہلی شادی میر گمر (آبائی وطن) میں ہوئی تھی کچھ ہی دنوں کے بعد ان کا انتقال ہوگیا، ان سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کے بعد بہار کے ایک بزرگ مولانا عبدالرحمن ساکن بتر ہٹہ ضلع مونگیر کی صاحبزادی سے آپ کا دوسرا نکاح ہوا حضرت کی یہ بیوی صاحبہ حقیقت یہ ہے کہ ان گرامی قدر خواتین اسلام میں سے تھیں جنھوں نے اپنے کو علم ودین کی خدمت میں اپنے شوہر کا دست راست ثابت کیا تھا بیوی صاحبہ نے حضرت کے تمام علمی مہمانوں کی خاطر مدارات میں نہ صرف ان کے قیام وطعام کا تیں

کچھ لکھا۔
ستر برس کی عمر میں یہ چند شاذ مثالیں ہیں اور یہ بھی کسی خاص وقتی جوش یا ہیجان کا نتیجہ تھا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی چھوٹی باتوں سے اللہ نے آپ کو بہت ارفع و اعلیٰ پیدا کیا تھا۔

تلامذہ

وسط ایشیا، ترکستان کے شہروں خصوصاً بخارا، تاشقند وغیرہ سے لے کر بنگال کے آخری حدود تک تقریباً ہر بڑے شہر میں آپ کا کوئی نہ کوئی شاگرد ضرور نظر آئے گا۔ اور اچھی حالت میں نظر آئے گا۔ بیرون ہند سے آپ کے پاس طلبہ خاصکر اس لئے زیادہ آتے تھے کہ علاوہ درس نظامیہ کے آپ خصوصیت کے ساتھ ابن سینا، طوسی، قوشجی، دوانی، خوانساری، میر باقر داماد وغیرہم کی کتابیں پڑھاتے تھے جو اس زمانے میں ہندستان ہی میں نہیں بلکہ شاید دنیائے اسلام میں بھی اس انداز میں نہیں پڑھائی جاتی تھیں، ماوراءالنہر کے طلبہ میں ان مصنفین کی کتابیں پڑھنے کا خاص شوق تھا۔

علمائے ہند میں، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا خلیل الرحمٰن ٹونکی، مولانا نصیر احمد کھیلتی، مولانا عبدالرحمٰن چشتی حیدرآبادی، مولانا اشرف ملتانی، مولانا عبدالسبحان بہاری، مولانا مقبول احمد دربھنگوی، مولانا محمود سندھی،

نواب صاحب لیٹ کر کہنے لگے کہ مولوی برکات احمد صاحب اعلیٰ کو تو ملتے ہوئے لیکن مجھے، چھوڑ دیا بھائی ٹونک سے تو تم مجھے دفن کر کے ہی جانا۔ کیا معلوم تھا کہ معاملہ بالعکس ہونے والا ہے انھوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

ٹونک ہی میں ایک واقعہ آپ کی مالی آزمائش کا پیش آیا تھا، اسوقت چاہتے تو چھ لاکھ روپئے جائز طریقہ پر آپ کو مل جاتے، لیکن بعض لوگوں کی مروت سے آپ نے اس روپیہ کو بُری طرح ٹھکرا دیا۔

جدال ومناظرہ سے نفرت

بے نظیر فلسفی اور منطقی ہونے کے باوجود آپ جدال ومناظرہ سے متنفر تھے کبھی کسی سے زبانی مناظرہ نہیں فرمایا۔ رئیس رامپور نواب حامد علی خاں کے بار بار طلب فرمانے پر صرف ایک بار مولوی عبدالوہاب بہاری سے کچھ مکالمہ ہوا، اور بس! اس مناظرہ کی کیفیت حضرت الاستاذ مولانا احمدی نے اپنے رسالہ چہار تاریانہ' فہار میں تفصیل سے لکھی ہے، اور ان فنی مسئلوں کو بھی تحریر فرمایا ہے جن پر گفتگو ہوئی تھی۔ بعض عقلی اور چند مذہبی جزئیات پر آپ میں اور آپ کے بعض معاصرین استاذ الاساتذہ مولانا فضل حق رامپوری مرحوم پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور اور شمس العلماء مولانا عبداللہ ٹونکی وغیرہما میں نوک جھونک رہی۔ پھر بعض مسائل دیوبندیہ کے متعلق آپ نے کبھی کبھی

کبھی کبھی الٹا پاجامہ پہنکر تشریف لے آتے، پان کھلنے کی عادت بہت
زیادہ تھی، کپڑے اور سامنے رکھی ہوئی کتابیں، منہ سے چھالیاں اُڑا کر
خراب کر دیتی۔ آپ کی وارفتگی کے نقشے بہت مشہور ہیں۔ ایسا بھی اکثر دیکھا
گیا کہ عربی یا حیدرآبادی رومال کے بجائے کندھے پر بچہ کا ہنا لچہ ڈالکر باہر
چلے آئے۔ ایک دن عمامہ کے بجائے پاجامہ سر سے باندھ کر دربار میں
پہنچ گئے۔ نواب صاحب کے ٹوکنے پر متوجہ ہوئے۔ یہ بھی بسا اوقات ہوتا
کہ کسی نے فیس دی، رومال جو کندھے پر اکثر ڈالے رہتے تھے، اسکے کونے
میں باندھ دی۔ لیکن اس طرح کہ رومال میں گرہ لگ گئی مگر روپیہ باہر ہی
رہا جس کا جی چاہتا لے لیتا۔ کوئی دیانتدار ہوتا تو پیش کر دیتا۔ علمی انہماک اور
فکری استغراق میں اس قسم کے "محقرات امور" میں ایسے افعال کا صادر ہونا
نادر نہیں ہے۔

قناعت

مزاج میں حرص کا شائبہ مطلقاً نہ تھا، مہاراجہ اندور نے مختلف ذرائع
سے آپ پر زور دیا، بارہ سو مشاہرہ دینا منظور کیا اس کے سوا اور بھی وعدے
کئے لیکن آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ ان باتوں کا اثر نواب صاحب پر بہت پڑتا تھا،
خود فرمایا کرتے تھے کہ نواب یہ خیال کرتے ہیں کہ میں ان کو چھوڑ دونگا۔ حالانکہ
ان کا یہ عجیب خیال ہے۔ حیدرآباد دکن کسی ضرورت سے جانے لگے تو

ساتھ مخفی طور پر آپ بہت سلوک فرماتے تھے خصوصاً اقربا کے ساتھ آپکا
سلوک بالکل غیر معمولی تھا، تنخواہ کا ایک بڑا حصہ ہر مہینہ ان عزیزوں کو مشاہرہ
میں تقسیم کردیا جاتا تھا، حیدر میں عربوں کی مہمان نوازی کا جذبہ آپ پر بہت
غالب ہوگیا تھا محبت رسول کی آگ جوں جوں تیز ہوتی تھی، دیار محبوب
کا ہر آنے والا آپ کو لے میں کر دیتا تھا یہاں تک کہ اسی شوق کے پیش نظر
آپنے چند سال پہلے، عربوں کے لئے ایک مستقل سرائے اپنے مصارف
سے تعمیر کرائی تھی اور اس کا نام رباط رکھا تھا جس میں ہر قسم کے آرام کا سامان
آپ کی طرف سے تھا تو ملک میں جو عرب آتا خصوصاً اگر مدینہ کا ہوتا، تو
اس کے سامنے معمولی خادم کی حیثیت سے اپنے کو پیش کرتے، خود دیتے،
امراء سے دلاتے، اور نواب صاحب سے کچھ نہ کچھ وصول کرکے ان عربوں
کو دلوانا اپنے اوپر لازم کرلیا تھا حیدرآباد اور دوسری ریاستوں کو اپنے
اپنے تعلقات واثرات کی بنا پر عربوں کی سفارش کے خطوط تحریر فرماتے،
بہرحال آپ کی اخلاقی صفات میں جود وبخشش کی صفت آپ میں بہت
نمایاں تھی۔

سادگی اور وارفتگی واستغراق

لباس اور سواری وغیرہ میں آپ بالکل سادہ تھے، معمولی لباس
زیب تن فرماتے، مزاج میں وارفتگی حد سے گذری ہوئی تھی، درسگاہ میں

حضرت سے بعض لاہوتی مسائل پر گفتگو ہوئی اس کے بعد حضرت آبدیدہ تھے اپنی گذشتہ محنت پر پچھتاتے تھے۔ تقریباً ایک ماہ تک حیدرآباد قیام رہا وقت کا اکثر حصہ انھیں بزرگ کی چٹائی پر متحیرانہ بسر کرتے تھے، وہ کچھ کہتے جاتے تھے اور حضرت سنتے رہتے تھے۔

یہ بزرگ مدراس کی جماعت صوفیہ کے ایک بڑے اصلاحی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے سلسلہ کے بزرگوں نے عربی فارسی میں ایک خاص قسم کا ذخیرہ مختلف کتابوں کی شکل میں مہیا کیا ہے۔ حضرت نے ڈھونڈھ کر یہ کتابیں قلمی و مطبوعہ مہیا کیں اور شاہ صاحب سے اجازت لے کر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے۔ آخر زندگی میں ان کا مشغلہ ان ہی کتابوں کا مطالعہ اور ان سے مطالب استنباط کر کے کئی کتابوں کی تدوین رہ گیا تھا۔ مچھلی شاہ صاحب نے ایک بار فرمایا کہ میں حکیم صاحب کو عالم مثال میں دیکھتا ہوں کہ ان کے سر پر تاج زرنگار ہے اور وہ کسی منصب عالی پر سرفراز کیے گئے ہیں یہ واقعہ حضرت مچھلی شاہ نے حکیم صاحب کی زندگی ہی میں بیان فرمایا تھا۔

سخاوت

حضرت کا سینہ نہایت وسیع اور چشم کشادہ تھی، طالب علموں کے ساتھ جو برتاؤ تھا معلوم ہو چکا، اس کے سوا غریبوں، بیواؤں، اور دوستوں کے

بالکل تھک کر بیٹھ گئے یہ تو آپ کا ہمیشہ سے معمول تھا کہ رات کے تین کے ساڑھے تین بجے اُٹھ جاتے تہجد کی نماز پڑھتے، پھر جہر کے ساتھ صبح تک ذکر کرتے صبح کی نماز مٹھو کی مسجد میں با جماعت ادا کر کے ایک خاص سطر قال دیداس کے بعد یہ ہوتا تھا کہ نماز کے بعد طلوع آفتاب تک مسلسل بور زور سے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر ادعیہ ماثورہ کا ایک سلسلہ نہایت تحمات سے شروع فرماتے تھے، مسجد سے اُٹھ کر گھر آتے، تانگہ تیار رہتا تھا علی الصباح مدرباغ نواب صاحب کو دیکھنے جاتے، اور راستہ میں قرآن مجید اور دلائل الخیرات کے اوراد ختم کرتے۔

آپ پر حج و زیارت کا شوق مسلط ہوا اور حجاز کے سوا شام وفلسطین اور مصر ہوتے ہوئے آپ ہندوستان آئے اس کے بعد آپ کا رنگ ملامیہ فقرا اور درویشوں کے یوں تو ہمیشہ سے معتقد تھے لیکن اسکے بعد اس جماعت کی دامن آویزی کا جذبہ بہت تیز ہوگیا۔ اسی عرصہ میں ایک ضرورت سے حیدرآباد جانا ہوا وہاں تلاش فقرا میں آپ کی نگاہ ایک ایسے فقیر پر پڑی جو اپنی ظاہری شکل وصورت میں ایک معمولی سے آدمی تھے اور رسمی علوم میں بھی ان کا پایہ کچھ بلند نہ تھا، لیکن فلسفہ ومنطق کا یہ ہمگ جب اس فقیر کے آستانہ پر حاضر ہوا تو پچاس سال کے سارے سرمایہ کو ان کے قدموں پر نثار کر دیا۔ ان کا نام حضرت کمال اللہ شاہ عرف مچھلی شاہ تھا۔

شرح منار فارسی کا عربی ترجمہ ہے۔ کاش شائع ہو جاتی تو نصاب کے لئے بہترین کتاب ہے۔

آخر عمر میں آپ پر تصوّف کا غلبہ ہو گیا اور چند اہم کتابیں اس موضوع پر لکھیں، جو سب کی سب غیر مطبوع ہیں۔ آپ نے دیانند سرستی کے فلسفیانہ اصول کی تردید میں بزبان اُردو کچھ نوٹ کرائے تھے جس کو باضابطہ مرتب کر کے صدقہ جاریہ فی ردّ آریہ کے نام سے حضرت کے خلف رشید مولانا حکیم محمد احمد نے شائع بھی کرا دیا ہے۔ اُردو میں اگر حضرت کی کوئی یادگار ہے تو یہی ہے۔ بعض نزاعی جزئیات کے متعلق چھوٹے چھوٹے رسائل بھی ہیں۔ ترمذی شریف کی ایک ضخیم شرح کا بھی آپ نے آغاز کیا تھا۔ بہر حال حدیث و تصوف کے سوا آپ کی تمام تالیفی کوششوں کا تعلق ایسے مسائل سے ہے جس کی مانگ، علم کے دور جدید میں مشکل سے ہو گی۔

ایک رسالہ تار کی خبر پر اعتماد یا عدم اعتماد اور دوسرا نوٹوں کے ہنڈی کی طرح ہونے یا نہ ہونے پر بھی تصنیف فرمایا گیا ہے۔ اول الذکر رسالہ چھپ چکا ہے۔ دونوں میں دلائل و براہین میں کافی زور صرف کیا گیا ہے۔

مجاہدات و ریاضات

حضرت میں تقویٰ، انابت، اخلاص باللہ اور عشق نبوی کے جوہر ابتدا سے منور تھے لیکن ان میں آب و تاب اس وقت آئی جب علم و عقل سے آپ

موصوف نے ٹونک میں آٹھ سال گذار کر حکیم صاحب کے دریائے فیض میں شناوری کی ہے اس لئے اکثر و بیشتر واقعات و حالات چشم دید ہیں کہیں کہیں حضرت الاستاد مولانا امیری اور دوسرے اکابر سے سنے ہوئے حالات بھی ہیں نے درج کردیئے ہیں اس میں مولانا ماطر حسن کے قائم کردہ عنوانات کے ماتحت انہیں کی عبارت حسب موقعہ حذف و اضافہ کے ساتھ درج کرتا ہوں۔

دور تالیف

تقریباً بیس سال تک مختلف علوم و فنون کی مسلسل تعلیم و درس کے بعد ادھر پچھلے دس پندرہ سال سے حضرت نے اپنی توجہ، درس سے زیادہ تصنیف و تالیف کی طرف پھیر دی تھی ان کی کل کتابیں عربی زبان میں ہیں، جن میں بعض تو چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں، اور مختلف مضامین، درسی کتابوں کے مشکل مقامات کے حل سے متعلق ہیں۔ ایک ضخیم کتاب آپ نے الحکمۃ البازغۃ کے نام سے لکھی جس میں مابعد الطبیعات کے چند اہم ابواب پر مجتہدانہ انداز سے گفتگو فرمائی گئی ہے نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں مرحوم (استاد حضور نظام) نے اس کو حکومت آصفیہ کی جانب سے شائع کرا بھی دیا ہے۔

ایک کتاب آپ نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کی، یہ مولانا بحر العلوم کی

آپ کے یہاں کے طلبہ امتحان کے لئے ہر وقت تیار رہتے، جب کبھی سال میں باقاعدہ امتحان لینا ہوتا تو سوالات پہلے سے بتا دیتے پھر امتحان لیتے۔ اعتراضات کرتے، جرح فرماتے جب اس میں کامل نکلتا تب پاس فرماتے۔ شعبان، رمضان، اور شوال میں عموماً تعلیم بند رہتی، ہفتہ میں منگل اور جمعہ کو اسباق بند رہتے۔

فلسفہ و منطق کے متعلق فرماتے کہ ان کتابوں کی حیثیت ایسی ہے جیسے پہلوان مگدر وغیرہ ہلائے کہ مقصد مگدر نہیں بلکہ پٹھے اور قویٰ مضبوط کرنا ہیں تاکہ اکھاڑہ میں کام آئیں۔ ان کتابوں سے بھی ذہنی قویٰ کو مضبوط کرنا ہے تاکہ اسلام کی تائید میں مخالفین کی سرکوبی کی جائے یہی مقصد پیش نظر تھا۔ اسی کے ماتحت ایک روز خوش ہو کر فرمایا کہ میں نے اپنا درس چند نشتروں کی تیاری کے لئے قایم کیا تھا، سو الحمدللہ دو نشتر تو مجھے مل گئے، انشاءاللہ ان سے بڑا کام نکلے گا۔

حکیم صاحب سے متعلق جو کچھ بھی لکھا جا رہا ہے اس کا بڑا حصہ شاگرد رشید مولانا مناظر احسن گیلانی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے ان مضامین سے ماخوذ ہے جو موصوف نے حکیم صاحب کے انتقال کے بعد، نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی کی ہدایت پر ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں، معارف اعظم گڈھ کے مسلسل تین نمبروں میں لکھے تھے۔

طلبہ علم کی تشنگی سے معمور ہو ملتے تقریروں حاشیوں، شرحوں اور قلمی
نسخوں کی نقل میں رغبت کا عجیب سلسلہ جاری رہتا۔ ایک مرتبہ فلسفہ کی
ایک کتاب کی نقل کے سلسلے میں دو طالب علموں میں کشمکش یہاں تک
بڑھی کہ دونوں کے ہاتھ میں چھری دیکھی گئی ایک مرتبہ حواسارِی کا حاشیہ[۱]
تھا اور مولانا فضل امام خیر آبادی کا حاشیہ ملا جلال جسمیں آپ کسی کو نہ دکھاتے
تھے اپنے شاگرد مولانا مناظر احسن گیلانی کو جلد بندھوانے کے لئے دیا کہ دو
روز میں جلد بندھوا کر داخل کر دیا مولانا مناظر احسن نے دو ساڑھے دو روز لگاتار
محنت کر کے انھیں نقل کر لیا اور چند گھنٹوں میں جلد ساز کو زیادہ اجرت دیکر
جلد بندھوا کر حاضر خدمت کر دیئے

علاوہ درسیات کے طب اور مثنوی مولانا روم کا بھی درس رہتا۔ فلسفہ
شروع کراتے تو شمس العلماء مولانا عبدالحق کی تصنیف ہدیۃ الحکمۃ (جو اردو
میں ہے) سے امداد فرماتے

۱؎ مولوی حکیم احمد علی خیرآبادی راوی ہیں کہ لکھنؤ سے مولانا عبدالحق کے نام خط آیا کہ داخل حواسارِی کا حاشیہ
دستیاب ہو گیا ہے اسکی قیمت پچاس روپیہ ہے حکیم صاحب نے وہ خط دیکھ لیا لکھنؤ پہنچکر حاشیہ خرید لا اور ٹونک
روانہ ہو گئے مولانا نے روپیہ لیکر آدمی لکھنؤ بھیجا تو معلوم ہوا کہ کوئی شاگرد موصوف ہی کے لئے حاشیہ
خرید کر لے جا چکا ہے مولانا سمجھ گئے کہ حرکات ہی کی یہ حرکت ہو سکتی ہے فوراً ٹونک خط لکھا کہ
اگر حاشیہ فوراً حاضر کیا تو معاف کر دوں گا حکیم صاحب نے قسموں سے موکد کر کے لاعلمی کا عریضہ
روانہ کیا اور بعد میں کفارہ دوستی سے کام لیا یہ وہی حاشیہ تھا ۱۲

پاس آتا تھا۔ گھر میں بجز ایک ماما بریرہ کے مشکل سے کوئی خادمہ رہتی تھی۔ لیکن یہ حکیم صاحب کی کرامت تھی یا بیگم صاحبہ کی غیر معمولی محنت کہ تازہ تازہ گرم گرم چپاتیاں، بکرے کے گوشت کا سالن صبح ۸ بجے تک طلبہ کو ملجاتا تھا۔ اسی طرح شام کو مغرب کی نماز پڑھ کر تازہ کھانا کھایا جاتا تھا۔ کچھ طلبہ حکیم صاحب کے علم دوست احباب کے مکان پر، بعض مساجدِ شہر میں رہتے تھے۔ تھوڑی جماعت مدرسہ خلیلیہ سے وظیفہ پاتی تھی۔

طلبہ پر بے انتہا شفقت فرماتے تھے۔ درس و تدریس کے وقت پورا رعب و جلال رہتا تھا۔ عام مجلسوں میں پُر لطف گفتگوئیں رہتی تھیں طلبہ کو خطابات سے بھی نوازا جاتا تھا۔ ایک سرحدی طالب علم جو فارغ التحصیل ہو کر شفا و اشارات پڑھنے کے لئے حاضر ہوا تھا اور تنو مند و قدآور تھا اس کا نام "ابوالبشر" رکھدیا گیا۔ پانی پت کے ایک معمر طالب علم "مولوی چچا صاحب" کے لقب سے ملقب ہوئے۔ ایک ذہین طالب علم مولوی عبدالواحد بدایونی مرحوم کو جو پست قد تھے "ملا مختصر" کا خطاب عطا ہوا۔ بہار کے ایک زیادہ بولنے دالے طالب علم کو "بالسٹر" کے نام سے یاد کیا جاتا۔

بغیر مطالعہ کے قطبی و شرح جامی بھی نہ پڑھاتے تھے۔ جو طلبہ شروح وحواشی کی مدد سے مطالعہ دیکھتے ان پر سخت ناراض ہوتے۔ غیر درسی مجالس میں تحصیلِ علم اور قیمتِ علم کے متعلق ایسے واقعات سناتے کہ خود بخود

سے اب تک اسی شان سے چل رہا ہے۔ اس وقت حکیم صاحب کے تلمیذ التلمیذ مولوی منتخب الحق بہاری شاگرد علامۃ الہند مولانا الحاج معین الدین اجمیری صدر مدرس ہیں۔ ابتدا میں اس مدرسہ کی وسعت صرف ایک دالان تک محدود تھی جس پر چھپر پڑا تھا جس میں دری کا بھی نہیں صرف جاجم کا فرش تھا۔ اس میں حکیم صاحب کے بیٹھنے کے لئے روئی کا چھوٹا سا گدا تھا سامنے لکڑی کی ایک تپائی پڑی رہتی تھی جس پر ایسا غوجی سے لے کر شفا تک، قدوری سے لے کر ہدایہ تک اور مشکوٰۃ سے لیکر بخاری تک درس ہوتا تھا جس کے سلسلے سے بخارا، مصر اور افغانستان وغیرہ کی علمی مجلسیں گونج اٹھی تھیں اس مدرسہ کے فارغین ہندستان کے بڑے بڑے مدرسوں کے مدرس اور صدر مدرس ہوئے علاوہ سرحد کے کوہستانوں میں، کابل کی پہاڑیوں میں، بخارا کے مرغزاروں اور قندھار، خیوہ، تاشقند کی مسجدوں میں، خدمت علم کرتے نظر آئیں گے۔

بیرونی طلبہ کے کھانے کے دو انتظام تھے پہلی صورت یہ تھی کہ طلبہ کی ایک بڑی جماعت حکیم صاحب ہی کی ذاتی مہمان تھی چار سو روپیہ ماہانہ تنخواہ ریاست سے ملتی تھی جاگیر میں ایک گاؤں بھی تھا وقتاً فوقتاً مسہل وغیرہ کے موقع پر ریاست خطیر رقم بھی پیش کرتی رہتی تھی برسوں دیکھا گیا کہ مین پچیس آدمیوں کا کھانا ایک کر الگ حوالیوں میں طالب علموں کے

کر سکتے تھے لیکن کبھی مال وجاہِ دنیا کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ معارج خاص کے عہدہ ہی پر مدۃ العمر اکتفا کی۔ دنیا سے بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ حضرت الاستاذ مولانا معین الدین اجمیری مرحوم فرماتے تھے کہ تمام عمر روپیہ کے پیسے شمار نہ کر پائے۔ زندگی کا پہلا حصہ درس وافادہ تھا، دوسرے حصہ میں تالیف وتصنیف کا ذوق غالب ہوا۔ آخر عمر میں ہر چیز سے الگ ہو کر صرف اس مشغلہ میں ڈوب گئے جس کے لئے بنائے گئے تھے۔ کل عمر ۷۶ سال کی ہوئی شروع میں مدرس تھے پھر مصنف ہوئے اور آخر میں وہ ایک صوفی صافی درویش نیک اندیش تھے۔

بھوپال میں طلبہ کی جو جماعت مستفید ہو رہی تھی انھیں میں سے کچھ طالبعلم ہمراہی میں ٹونک پہنچے۔ یہاں باضابطہ درس کا آغاز ہوا۔ ابتداءً آپ کے پاس کچھ مقامی اور بیرونی طلبہ کا اجتماع تھا، رفتہ رفتہ آپ کی درسی عظمت کا احاطہ وسیع ہونے لگا، ہندستان بلکہ عالم اسلام کے طلبہ آپ پر ٹوٹ پڑے یہاں تک نوبت تھی کہ ایک زمانے میں صبح پانچ بجے سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک مسلسل سبق پڑھاتے رہتے تھے۔ طلبہ کی کثرت کو دیکھکر ریاست نے ایک شکستہ مکان میں قلیل تنخواہ پر چند مدرسوں کو رکھ لیا۔ یہ مدرسین تحتانی طلبہ کو درس دیتے تھے۔ والیٔ ٹونک نواب محمد ابراہیم خاں خلیل کے تخلص کی مناسبت سے اس مدرسہ کا نام مدرسہ خلیلیہ رکھا گیا۔ جو خدا کے فضل

اُستاد کے ساتھ بھوپال گئے۔ بھوپالی طلبہ بھی شریک درس ہوئے، بھوپال جانے والے تینوں طلبہ فاضل بن کر نکلے، ایک مدرسہ خلیلیہ ٹونک کے صدر مدرس، اور دوسرے محکمۂ شرعیہ ٹونک کے مفتی، اور تیسرے شیخ الفقہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ہے۔ ایک سال سے زیادہ بھوپال میں رہ کر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے

زمانۂ طالب علمی ہی میں اپنے والد ماجد اور حکیم رضی الدین دہلوی کے خاندان کے کسی فرد سے طب کی تکمیل بھی کرلی تھی حکمت و طب دونوں اصطلاحوں کے لحاظ سے واقعۂ حکیم تھے اور یہ لقب اتنا غالب رہا کہ بعد وفات بھی حکیم صاحب ہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

زمانۂ طالب علمی ہی میں شادی بھی ہوگئی تھی اور رامپور کے کسی بزرگ سے بیعت بھی ہوگئے تھے

حکیم صاحب تحصیل علوم سے فارغ ہوئے تو والد ماجد حکیم دائم علی کی عمر پچاس بہاریں دیکھ چکی تھی قوی مضبوط تھے چاہتے تو فرائض ملازمت انجام دے سکتے تھے لیکن غلبۂ تصوف کی وجہ سے ذکر و شغل اور عزلت و گوشہ نشینی کی طرف طبیعت مائل تھی۔ نواب صاحب سے اصرار کرکے ملند اقبال فرزند کو اپنی جگہ مقرر کرادیا مولانا حکیم برکات احمد چاہتے تو اپنے والد کے اثرات اور اپنی اہلیت و صلاحیت کی بنا پر بڑے سے بڑا عہدہ حاصل

تداخل کو محال سمجھتے ہیں، لیکن میرے نوکر کا مشاہدہ ہے کہ بیٹر یں بگلوں میں کچھ اس طرح درآئیں کہ بگلوں کا نہ حجم بڑھا نہ اس کے حیز میں کوئی تبدیلی ہوئی باخبری کے ساتھ بے خبری کے یہ عجیب نظائر ہیں جن کی مولانا کی ذات گرامی حامل تھی۔

بہرحال سعادتمند شاگرد نے پندرہ سال استاذ کی خدمت میں اس طرح گذارے کہ جس کتاب حمد اللہ کو گھر سے پڑھ کر آئے تھے جب وہاں تک کئی سال میں پہنچے تو ایک بار نہیں کئی بار سمعاً وقراءۃً اسے پڑھا اور سُنا۔ نہ صرف نصاب درس نظامیہ بلکہ قدماء کی کتابیں بھی پڑھیں جن میں شفاء ابن سینا، شرح اشارات طوسی۔ افق المبین میر باقر داماد، حواشی دوانی، حواشی مرزا جان، خوانساری، مولفات قوشجی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خود مولنا کی تصانیف خارج از نصاب جواہر غالیہ وغیرہا بھی پڑھیں تکمیل معقولات کے بعد استاد کی اجازت حاصل کرکے اپنے حقیقی خالو اور خاندان ولی اللٰہی کے ایک غیر مشہور مگر معتبر و مستند محدث مولانا محمد ایوب پھلتی قاضی ریاست بھوپال کی خدمت میں حصول علم حدیث نبوی کے لئے حاضر ہو گئے۔

ٹونک کے طلبہ کی ایک جماعت بھی جن میں مولوی نصیر احمد، مولوی خلیل الرحمٰن۔ اور مولوی عبد الواسع بھی تھے۔ اس خیر آبادی شاگرد اور ٹونکی

ایک دن موصوف، نواب کے دسترخوان پر تھے، نواب نے خادم کو اشارہ کیا کہ ہڈیوں کو کسی رکابی میں جمع کر کے مولانا کے سامنے رکھدو، رکابی سامنے آتے ہی یہ جملہ زبان پر جاری تھا۔

'تم عالی شان کو نہیں پہچانتے اس رکابی کو نواب کے سامنے رکھو'

نواب کے نام کا پہلا جزو کلب (کتا) تھا اسی کی طرف لطیف اشارہ فرمایا گیا۔ نواب اس قسم کے لطائف کے منتظر رہتے تھے، ندامت میں ڈوبی ہوئی تحسین کرتے

امراء و رؤساء کے دربار میں جرأت کا یہ حال تھا لیکن غریبوں کے ساتھ مسامحت و چشم پوشی کی یہ حد تھی کہ ایک زمانے میں ہی لائق شاگرد مولانا کے مادرچی خانہ کا حساب لکھا کرتے تھے۔ ملازم حساب لکھانے میں گڑبڑ کرتے ایک دن استاد کی خدمت میں ماجرا کہہ سنایا کہ حساب میں ایک آنہ کے پان بھی لکھائے ہیں اور موالڈی کے نام پر بھی ایک آنہ لکھایا ہے۔ ارشاد ہوا۔ تم بڑے ناداں ہو حکمت کی بنیاد حیثیات و اعتبارات پر قائم ہے پان کی حیثیت سے اس نے ایک آنہ لیا اور بہ حیثیت موالڈی کے دوسرا آنہ،

لولا الاعتبارات لبطلت الحکمۃ۔

میٹرین کھا جانے پر اسی ملازم نے جب مولانا کو ٹکوں کا میٹرین کھا جانا یاد کرایا تو سہرا لے جانے والے سے اس واقعہ کا ذکر کر کے فرماتے کہ ملاحظہ

خوشنودی اور معافی خطا کے لئے ایک چلّہ کیا جس میں صرف ایک خشک روٹی کھاتے تھے۔ چلّہ سے فارغ ہو کر قطبِ وقت حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ موصوف نے دو روز قیام کا حکم دیا۔ تیسرے روز قریب مغرب گھر سے ناشتہ پکوا کر بھیجا اور کہلا بھیجا کہ اب جاؤ۔ چنانچہ جب درد فراق کا مارا ہوا شاگرد خیرآباد پہنچا تو چلّہ کی ریاضت اور مولانا مرادآبادی کی دعا و برکت سے کامیابی کی شکل نظر آئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ بالآخر مولانا کے خدمتگار نے شاگرد سے ایک بیش قرار رقم لینے کے بعد کچھ ایسے موقعہ سے سفارش کی کہ پورے دو سال کے بعد پھر علم کے اس دیوان خانہ میں باریابی کا موقعہ ملا۔

علم کی وہ عزت کہ ایک غلطی نے ایک ہونہار شاگرد کو دو سال کی عقوبت کا مستحق قرار دیا اور انسانوں پر وہ شفقت کہ ادنیٰ خادم کی التجا پر اتنی قدیم خفگی زائل ہو جاتی ہے۔ یہ مولانا عبدالحق کی شاہانہ اور فقیرانہ طبیعت کے امتزاجی آثار کا عجیب و غریب نتیجہ تھا۔

اس سلسلے میں دو واقعے دلچسپی سے خالی نہ ہونگے نواب کلب علی خاں، کبھی کبھی مولانا سے مذاق بھی کر لیا کرتے تھے۔ خصوصاً مولانا کی ذہانت اور اور حاضر جوابی سے لذت گیر ہونے کے لئے کوئی اس قسم کا واقعہ قصداً کرا دیتے تھے کہ مولانا کی زبان سے ایسی باتیں بے اختیار نکلنے لگیں۔

یہ امتحان نہیں ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ اسی کتاب کا سبق ہو رہا ہے شاگرد
عبارت پڑھ رہا ہے جب اس جملہ "المقتضی الیہ ذالیہ" پر پہنچا ہے تو زبان
سے دال مشدد کے بجائے ذال مشدد نکلتا ہے اور سالر ذالیہ کو الرذالیۃ
پڑھ دیتا ہے ادھر یہ لفظ منہ سے نکلا ادھر کتاب دور پڑی ہوئی تھی استاد
غصہ میں آپے سے باہر تھے جو جی میں آیا کہہ رہے تھے آخری حکم یہ تھا کہ
میرے درس سے ابھی اٹھ جاؤ۔ ایسے کم سوادوں کو میں قطعاً نہیں
پڑھا سکتا۔
تعمیل حکم ہوئی کئی دن کی روپوشی کے ساتھ حاضری کی اجازت چاہی گئی۔
نفی میں جواب ملا بڑی بڑی سفارشیں بہم پہنچائیں سب بیکار ہوئیں دو
تین ماہ انتظار کے بعد بصد حسرت و یاس ٹونک واپس جانا پڑا۔
بار بار امیدوار آتے اور نئی نئی سفارشیں پہنچاتے لیکن ساری کوششیں
لاحاصل ثابت ہوتیں استاد کی بے نیازیوں اور شاگرد کی نیاز مندیوں کا یہ
سلسلہ دو سال تک جاری رہا

برسی کہ کرا خواہی از جیل بتاں جامی
جستیم است مرا آخر غیر از تو کرا خواہم

حضرۃ الاستاذ مولانا امیری مرحوم کا بیان ہے کہ جب مولانا ناراض ہو گئے
اور رسائی کی کوئی تدبیر نظر نہ آئی تو عیدگاہ جامع میں شاگرد نے استاد کی

کو دیکھکر "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" کے مطابق اجازت شدِ رحال پر مجبور ہوئے۔ ہندستان کے طول و عرض کی طرف نگاہ اُٹھی۔ تو سب سے پہلے اسی حلقۂ درس پر نظر پڑی جو اس زمانے میں علوم عقلیہ کا اگر مرکز وحید نہیں تو سب سے زیادہ ممتاز و نمایاں مرجع تھا۔ شمس العلماء مولانا محمد عبدالحق خیر آبادیؒ کا قیام خیر آباد کے بجائے نواب کلب علی خاں کی نازبرداریوں کی بدولت رامپور تھا۔ حمداللہ اور ہدایہ کا فارغ شدہ یہ طالب علم ایسا غوجی اور میزان منطق جیسی ابتدائی کتابوں کے درجہ میں نئے سرے سے شریک کر دیا گیا۔

استاد کی خدمت میں شاگرد نے ۱۵ سال گذارے، وہ بھی کن صبر آزما حالات میں، یہ ناز و نیاز کی طویل داستان ہے اس دور میں افسانوں سے زیادہ اس کی حقیقت سمجھنا دشوار ہے۔

شرح ہدایۃ الحکمۃ شروع ہوئی، ایک شوال میں اس کا پہلا سبق ہوا اور سالِ آیندہ کے دوسرے شوال میں جاکر دوسرا سبق اس ایک سال کی مدت میں کیا لائق شاگرد کو یہ جرأت ہوئی کہ استاد سے اپنے "تضیع اوقات" کا گلہ کر سکے؟ اور بے التفاتی کا شکوہ زبان پر لا سکے؟ جانتا تھا کہ کامل استاد کی ایک نظرِ کیمیا اثر سالوں کی کسر ایک دن میں نکال دے گی اور مدتوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرا دے گی۔

تو سید صاحب ہی کو تجویز کیا گیا۔ اس طرح حضرت خواجہ بزرگ کی بشارت
کے ورثا بعد عہدۂ اتالیقیٔ ولیعہد پر فائز ہوئے اور ترقیوں کا دروازہ کھل گیا
جب ولیعہد (حافظ ابراہیم خاں خلیل) تخت نشیں ہوئے تو سید صاحب
صرف طبیب خاص سے ملک وزیر اعلیٰ کا درجہ بھی نصیب ہوا خاں کے
خطاب سے بھی سرفراز ہوئے۔ جاگیر میں گاؤں بھی عطا ہوا۔

سید صاحب کی شادی ضلع مظفر نگر کے قصبہ پھلت کے اس شریف
گھرانے میں ہوئی جس کا تعلق امام العلماء حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
رحمۃ اللہ علیہ سے تھا انہیں بی بی صاحبہ سے سب سے پہلے وہ آفتاب علم
طلوع ہوا جس نے ہند، کابل، بخارا، خیوا، کاشغر وغیرہ کے ذرات کو روشن
منور کر دیا اور جو آگے چل کر حقیقت میں برکات احمدیہ ثابت ہوا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد سید صاحب نے اپنے ایک قدیم دوست اور صوبہ
بہار کے مشہور عالم مولانا لطف علی دھمھوہوی کو صاحبزادہ کی تعلیم کے لئے
ٹونک بلالیا حمد اللہ تک درسیات موصوف ہی سے پڑھیں، مولانا محمد حسن
ٹونکی سے ہدایہ پڑھی استاد کی توجہ اور ذاتی صلاحیت کی بنا پر طلب علم کا
حقیقی جوش و ولولہ پیدا ہوا اور اس کے لئے ٹونک کا دامن صحرا تنگ نظر
آیا۔ باپ جو لائق فرزند کو پل بھر کے لئے آنکھوں سے اوجھل کرنا گوارا نہ کرتے
تھے اور اسی بنا پر ایک جید عالم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں، بیٹے کے اشتیاق

بدر الفضلا مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی

حاوی فروع واصول، جامع منقول و معقول، آیت کردگار، یگانۂ روزگار، مولانا حکیم سید برکات احمد بہاری ٹونکی، ۱۲۸۰ھ میں، ٹونک میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد مولانا حکیم دائم علی طبیب خاص دربار ٹونک، میر نگر ضلع پٹنہ (بہار) کے خاندانِ سادات کے گرامی قدر فرد تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے عزیز، اور بہار کے مشہور فاضل مولانا محمد احسن گیلانی سے حاصل کی، موصوف کے تعارف کے لئے محقق طوسی کی اقلیدس کے پہلے مقالہ کی تصحیح و تحشیہ کافی ہے۔ گیلانی سے لکھنؤ اور رامپور کے مدارس دیکھتے ہوئے تکمیل علم حدیث مولانا عالم علی مرادآبادی نگینوی سے کی، وہاں سے اجمیر ہوتے ہوئے فن طب کی تکمیل کے لئے ٹونک پہنچے۔ طبیب خاص والی ٹونک سے پڑھنا شروع کیا۔ عسرت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ ایک شب حضرت سلطان الاولیا خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بشارت ہوئی کہ

میاں سید گھبراؤ نہیں، خدا تمھاری مشکلات آسان کرے گا۔

نواب محمد علی خاں کا زمانہ تھا انھیں ولی عہد کے لئے ایک شریف، عالم متقی، اور طبیب اتالیق کی ضرورت تھی، ایسی ہمہ صفت موصوف ہستی سید میر نگری ہی کی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ معالج خاص سے جب مشورہ کیا گیا

کے لئے ان کے سپرد کیا حکیم صاحب نے اپنی توجہ فن طب کی طرف مبذول رکھی
اور اس خاندانی دوراثتی علم کو خاص اہمیت دی رامپور کے بعد کچھ دنوں تک
ٹونک جاکر رہے۔ مولانا حکیم سید برکات احمد اور مولانا معین الدین اجمیری سے
بھی کچھ پڑھا۔ اواسط کتب تک پہنچے پر ٹونک کو خیر باد کہہ کر خیر آباد آ گئے۔
حکیم صاحب نے ایک شادی خاندان میں کی ان مرحومہ سے اولادیں
ہوئی دو شادیاں غیر کفو میں کیں، دونوں سے اولاد ہے کثرت اولاد اور
ناسازگاری زمانہ کی وجہ سے پریشانی میں زندگی گذرتی ہے یہی وجہ ہے کہ
اولاد نعمت علم سے محروم ہے۔

تلک الایام نداولہا بین الناس ؎

صلبی اولاد سے علم کا خاتمہ ہوا تو کیا ہوا روحانی اولاد کے دریائے فیض
سے ایک عالم سیراب ہو رہا ہے یوں تو مذکورہ بالا تلامذہ میں ہر فرد اپنی
نظیر آپ تھا مگر سب سے زیادہ نامیں، یک سیر اور حوش صفات ہستی
مولانا سید حکیم برکات احمد کی تھی۔

مولانا اسدالحق کی وفات پر حکیم عابد علی کوثر خیرآبادی مرحوم (والد مولانا حکیم احمد علی خیرآبادی) نے قطعۂ تاریخ لکھا۔

حیف آں آفتاب فضل و کمال — دفعۃً شد نہاں بزیر زمیں

بود، در فلسفہ و منطق فرد — در اصول و فروع مہر مبیں

منتخب در حدیث و فقہ و ادب — فاتح قفل گنج دین متیں

در ریاضی و ہندسہ حکمت — فاضلے در جہاں نبود چنیں

ماہ تابانِ عز و مجد و علا — مہر رخشانِ شوکت و تمکیں

وائے در رامپور گشت خزاں — باغ شاداب و سبز شرع دیں

پس ہما نجا بخاک بسپردند — شد غروب آفتابِ علم و یقیں

اخت و ام از ملال خاک بسر — ابن و زوجہ ملول و زار و حزیں

اقربا از فراق نالہ زناں — دوستاں در غمش فگار و غمیں

مدرسہ از غمش خمیدہ پشت — طلبہ از ملال خاک نشیں

کوثرِ زار سالِ فوتش گفت

اعلم، اکمل، مقیم خلد بریں

۱۳۱۸ھ

مولانا اسدالحق کے سانحہ اس خاندانِ خیرآباد سے نسلی طور پر علم کا خاتمہ بھی ہوگیا۔ مولانا کے بعد نواب صاحب رامپور نے اپنے استاد بھائی مولانا عبدالعزیز سہارنپوری کو رامپور رکھا۔ مولوی.. ظفرالحق کو..

پندرہ سال سے لے کر بیس سال تک تعلیم میں صرف کئے ہیں۔ اور عمر کا بہترین حصہ استاد کی بار برداری اور عتاب و غصہ کی برداشت میں گذارا ہے۔

۱۔ مولانا سید عبدالعزیز سہارنپوری
۲۔ مولانا نادرالدین
۳۔ مولانا حامد علی جونپوری
۴۔ مولانا حکیم برکات احمد بہاری ٹونکی
۵۔ مولانا ظہورالحسن رامپوری
۶۔ صاحبزادہ مولوی امیر محمد علیخاں رامپوری
۷۔ علامہ سید علی بلگرامی
۸۔ مولانا محمد طیب مکی
۹۔ خلف الرشید مولانا اسدالحق خیرآبادی
۱۰۔ مولانا سید احمد بخاری (والد مولوی حکیم محمد احمد بخاری)

فرزند سعید مولانا اسدالحق کو فرمانروائے رامپور نے مولانا کی وفات کے کچھ دن بعد ہی مدرسہ عالیہ رامپور کا پرنسپل مقرر کر دیا۔ موصوف نے ایسی قابلیت سے اس جگہ کو پُر کیا اور دریائے فیض علمی جاری فرمایا۔ افسوس یہ ہے کہ صرف ایک ہی سال اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے تھے کہ ۶ ربیع الاول ۱۳۱۸ھ کو والد ماجد کی وفات کے پورے ڈھائی سال بعد اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی اور وہیں کٹرہ ملا محمد حسین لکھنوی میں سپرد خاک ہوئے۔ تالیفات میں رسالہ حمیدیہ (فن منطق) یادگار رہا۔ اولاد میں مولوی حکیم ظفرالحق خیرآبادی بقید حیات ہیں۔ عزیزالحق اور بی بی رقیہ زوجہ حسن رضا سندیلوی جوار رحمت خداوندی میں پہنچ چکے۔

you the title of Shamsul-ulama as a personal distinction.

Dufferin
Viceroy & Governor General of India

Fort William
The 16th February 1887

Seal
Supreme Government
British India

سنہ عیسوی ۱۸۲۱

امور ممالک و جزائر ہند
انگریز بہادر مختار بالاطلاق در نظم و نسق
مہر سرکار اعظم و اعلیٰ
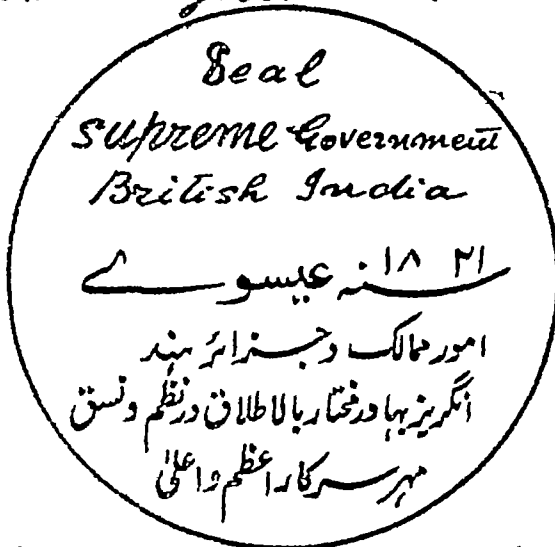
مولانا نے دو شادیاں کیں، زوجۂ اولیٰ بنت مولوی فضل الرحمٰن سے عائشہ بی بی زوجہ محمد حسین بسمل تھیں، زوجۂ ثانیہ دختر جناب بوعلی سے مولانا اسد الحق تھے جو دختر احمد حسین سے منسوب تھے۔

مولانا کے ہزاروں تلامذہ میں سے نامور شاگرد حسب ذیل ہیں۔ ان میں سے اول الذکر چار وہ عقیدتمند ہیں جنھوں نے مولانا کے دریاے علمی میں

والد ماجد کی عالیشان و سنگین محل سرا غیروں کے قبضے میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے مگر اس خطاب کو واسطہ بنا کر اس کے حصول کی سعی نہ فرمائی کشمیر و رامپور کے دونوں واقعات نے ثابت کر دیا کہ مولانا نے علم کی عزت و شان کو کیسا بلند و بالا رکھا تھا پریشان حالی کے باوجود طرز رہائش امیرانہ رکھا۔ اور تھے بھی درحقیقت امیر بن امیر بن امیر بن امیر عالم بن عالم بن عالم بن عالم

مولانا کو ملا طلب گورنمنٹ برطانیہ نے ۱۸۸۷ء میں شمس العلماء کا خطاب بھی پیش کیا تھا فرمایا کرتے تھے باپ کو کالے پانی کیا اور بیٹے کی خطاب سے اشک شوئی کی۔ جو سند دی گئی تھی اس کی نقل درج کی جاتی ہے۔

Sanad

To,

Mauln Abdul Haque
of Khairabad in Oudh

I hereby confer upon

مولانا مفتی محمد لطف اللہ علیگڈھی کے درس میں ایک بار تشریف لے گئے مفتی صاحب نے حسب عادت درس بند کرکے سروقد ہوکر پذیرائی فرمائی۔ مزاج پرسی وغیرہ رسمی مراتب گفتگو کے بعد فاضل خیرآبادی نے فرمایا کہ طلبہ کا وقت بہت عزیز ہے حرج نہ فرمایئے۔ قاضی مبارک کا درس ہونے لگا مولانا سنتے رہے ختم ہونے پر طلبہ سے کہا کہ تمھارے استاد کی نظر ایسی ہے کہ اعتراض خودبخود دفع ہوجاتے ہیں[۵]۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ جو کتاب بھی تصنیف فرماتے اس کی ایک نقل مفتی صاحب کے پاس بھی بھیجتے۔ موصوف کے کتب خانہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ اور دوسری تصانیف علامہ کی دستخطی اب بھی موجود ہیں۔

مولانا کی سیرچشمی اور استغنا کے ثبوت کے لئے یہ واقعہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ علامہ فضل حق کی ضبط شدہ جائدادیں سے پندرہ سال کے بعد سند خطاب شمس العلماء کے ساتھ جب کچھ گاؤں واپس ہوئے۔ تو خیرآباد کا باشندہ مسمی یار علی علامہ کا لڑکا بنکر ان پر قابض ہوگیا۔ اور کچھ دن بعد انھیں بیچ ڈالا۔ مولانا رامپور میں مقیم تھے اعزہ و احباب کے اصرار کے باوجود اس جھگڑے میں پڑکر عذرداری تک کرنا گوارا نہ کیا۔ شمس العلماء ہونے کے باوجود کبھی اسے باعث فخر نہ سمجھا نہ اس کے ذریعہ کوئی عزت ووقار حاصل کرنیکی کوشش کی۔

---

[۵] استاذ العلماء صفحہ ۴۸ مولفہ نواب صدر یار جنگ بہادر۔

در فن مذ تعمق نظر سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا، مفردات کی تحقیق اور
مرکبات کی تدقیق (جو خصوصیات کے لحاظ سے مفردات میں داخل
ہیں) کس شان سے بیان کی گئی ہے کہ اردو زبان بھی اس تصنیف کو
دیکھتے ایک علمی زبان معلوم ہوتی ہے اس کتاب کی عظمت اس شخص
پر خوب ظاہر ہو سکتی ہے جس نے کبھی اس قسم کی دماغ سوزی کی ہو۔
ہر چند امیر اللغات کے مصنف (مولوی منشی امیر احمد مینائی مرحوم) کی
استادی فن شاعری اور قابلیت علمی مسلم الثبوت ہے لیکن یہ کتاب
میری رائے میں اس عام اور خیالی تسلیم کے لئے زبان قوی ہے اور
ہندستان کو سرمایۂ فخر ہے دعا کرنا چاہیے کہ اہل کمال اس کتاب
کی پوری قدر کریں، اور مصنف اس کو جیسا کہ چاہئے اور جیسا چاہا تھا
ہے اس سے بھی عمدہ حالت پر پورا کر سکے کہ اردو زبان سے محتاجی
اور عدم استقلال کا الزام دفع ہو اور یہ عمدہ یادگار زمانے میں رہ جائے۔

محمد عبد الحق العمری الخیرآبادی عاملہ اللہ بلطفہ الہادی

فی العواقب والمبادی ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء

مولانا کی یہی تبحر علمی اور تمام اصناف علم پر قدرت تامہ، علماء عصر
سے فضل و کمال کا لوہا منوائے ہوئی تھی وقت کا بڑے سے بڑا عالم
مولانا کے کلمۂ خیر اور تعریف کو اپنے لئے سند سمجھتا تھا استاد العلماء

لحاظ سے مثل مفردات کے ہیں۔ اسی لئے مطلق زبان کی خصوصیت جو اس کے اجزائے مادّی یا ترکیبی سے پیدا ہو، ملحوظ رکھنا لغت کا مقصدِ اعلیٰ اور غایت قصویٰ ہے۔

راقم کو اس وقت لغت کے پورے مقاصد کا بتانا' اس کے موضوع یا تعریفات سے بحث کرنا منظور نہیں ہے' بلکہ اس وقت صرف یہ بتانا اور ظاہر کر دینا ہے کہ امیر اللغات نے کہاں تک اپنے مقاصد اور اغراض کے پورا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اور اس کے مصنف نے کہاں تک اس تالیف میں اصلی غرض کا خیال رکھا ہے۔ امیر اللغات کا اگرچہ ابھی ایک ہی حصہ نکلا جس میں الفِ ممدودہ ہے لیکن ان اغراض پر نظر کرنے کے بعد جو لغت کے اہم مسائل ہیں اور امیر اللغات میں تحقیق کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ لغت اپنی جامعیت کے لحاظ سے ایک نمونہ ہے، جس نے مصنف کی تدقیقِ نظر اور کتاب کی جامعیت مسائل کو اس طور پر ظاہر کر دیا ہے جس کو ملک اور قوم فخر اور مباہات کی نظر سے اگر دیکھے تو زیبا ہے اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ملک نے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اردو لغات کی اشتراک اور منقولات جو اعلیٰ سے اعلیٰ لغت نویس کی نگاہ سے کوسوں دور اور خفی رہ سکتے تھے۔ ایک لغت کے معنوں کا انتہا سے انتہا باریک

لیکن اس کے موضوع کو (جو مختلف لفظوں سے مخلوط ہو کر ہر خاص و عام کی زبان پر آتا ہے) اس طور پر ملحوظ رکھا کہ خاص زبان اور اس کے الفاظ اور مستعملات اسالیب ناگہانی سے الگ ہو کر ممتاز رہیں سیاحت کے مقامات ان عوارض سے الگ ہوں جو عوارض ذاتی یا نوع عوارض ذاتی سے جدا اور اغراض عربیہ میں داخل یا اس کے میں ہیں، کوئی آسان امر نہیں، کبھی کبھی اس عموم موضوعیت کے علاوہ خاص خاص وہ پہلو بھی محوث عنہ ہو جاتے ہیں۔ جو خاص ایک زبان سے متعلق اور دوسری زبان کے موضوع یا عنوان موضوع کے خلاف ہوتے ہیں مثلاً بعض جملے جو ہیئت ترکیبی کی وجہ سے مفردات کے کل ہیں اور مفردات اس کے جزو ہیں بظاہر موضوع کی نوعیت اور شخصیت سے الگ اور جدا ہوتے ہیں جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ کیوں یہ محل بحث اور موضوعیت میں داخل ہیں، لیکن اس مقام پر یہ سمجھنا ضرور ہے کہ مفردات جنکو عام طور پر لوگ مفردات جانتے ہیں ان سے یہ مفردات عام ہیں مثلاً "زید" مفرد ہے اور "زید آیا" مفرد نہیں۔ لیکن ان مفردات پر غور کرنے والوں کی موضوعیت کی نگاہ رکھنے والوں کو اس "زید آیا" کو اس وقت میں صیغہ رساحت مفردات میں داخل کرنا ہوگا جس وقت بصورت مقولہ یا مثل ظاہر ہو جس کا خاص منشا یہ ہے کہ مقولے اور امثال بھی اپنے خاص معنی کے

شعر اس عبارت کے لئے کہنے والے نے کہدیا تھا۔

مولانا نے اُردو میں زبدۃ الحکمۃ بھی تحریر فرمائی جسے مولوی امداد حسین کے ذریعہ شائع کیا گیا تھا اب نایاب ہے۔

اس سے مولانا کی اردو دانی اور اُردو ادبیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے یہ کتاب تو میرے سامنے نہیں ہے جس کا حوالہ دیکر کچھ بتا سکتا۔ البتہ امیراللغات پر مولانا نے جو تقریظ تحریر فرمائی تھی اسے تاریخ نثر اُردو مرتبہ مولانا احسن مارہروی مرحوم سے نقل کرتا ہوں جس سے ۷۰ سال پہلے کی زبان اور مولانا کا حسن بیان دونوں کا پتہ چل جائے گا۔ ساتھ ہی یہ محسوس بھی ہو سکے گا کہ یہ علوم قدیمہ کے ماہر و متبحر علماء علوم و فنون میں کتنا درک رکھتے تھے اور شے کی حقیقت و کُنہ تک کیسے پہنچے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی اردو لغت پر تقریظ نہیں ہو رہی ہے بلکہ کسی مسئلہ فلسفہ و حکمت کو حل کیا جا رہا ہے۔

"ہر زبان جو ما فی الضمیر کی ترجمان ہے اپنے خصوصیات میں ضرور امتیاز رکھتی ہے۔ اگرچہ وہی مفردات، وہی مرکبات، وہی کنائے، وہی تمثیلیں، وہی مقام استعمال، وہی مثلیں، وہی مقولے، ہیں۔ جو لغات میں مستعمل ہیں لیکن خصوصیات لسانی کا بتانا نہایت مشکل اور نکتۂ لاینحل ہے۔ یہ مسلم ہے کہ لغت کا موضوع لفظ مفرد ہے۔ مفردات کے اصلی مادّے کی جستجو، اشتراکِ لفظی یا معنوی، حقیقت یا مجاز کا بتانا، اس کے عوارض ذاتی اور محل بحث ہیں۔

رامپور وارنٹ لیکر حاضر ہوگیا واقعہ معلوم ہونے پر کوتوال کے ساتھ نواب
کی بھی خوب خبر لی کہ اسے بھی لے کر آتا تب مزا معلوم ہوتا کہ طالب علم
پر یہ جرأت کیسے کی جاتی ہے۔ کوتوال طیش میں بھرا ہوا نواب کے پاس
پہنچا اور سارے الفاظ دہرا دیئے۔ نواب مولانا کے بار بردار اور قدرداں
تھے اُلٹے کوتوال پر ناراض ہوئے۔ مولانا نے میری توہین نہیں کی بلکہ
تونے کی۔ تو ایسے شخص کے پاس کیوں بھیجا جو نواب کو بھی بُرا بھلا کہہ سکتا
ہے اس توہین کا صرف تو ذمہ دار ہے۔

مولانا کی تصانیف داخل درس بھی ہیں اکثر چھپ گئی ہیں۔
حاشیۂ قاضی مبارک، حاشیۂ غلام یحییٰ، حاشیۂ حمد اللہ، حاشیہ میر زاہد امور عامہ،
شرح ہدایۃ الحکمۃ، شرح مسلم الثبوت، شرح کافیہ (تسہیل الکافیہ) شرح
سلاسل الکلام، جواہر عالیہ، رسالہ تحقیق تلازم، مشہور تصنیفات ہیں

تسہیل الکافیہ اور شرح ہدایۃ الحکمۃ داخل نصاب ہیں مولانا کی تحریر کا کمال
یہ ہے کہ شرح کو متن سے اس طرح ملاتے ہیں کہ ذرا تسلسل بیان میں فرق
نہیں آتا اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود شارح ہی ماتن ہے اور یہ کہ متن و شرح
نہیں ہے بلکہ مسلسل کتاب ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مولانا ابوالکلام آزاد
عربی، فارسی اور اُردو کے اشعار جا بجا اپنے مضامین و خطوط میں چسپاں کرتے
ملے جاتے ہیں یہ محسوس ہونا مشکل ہے کہ عبارت شعر کے لئے لکھی گئی تھی یا

دل رکھتا ہے۔

نفاست پسندی کا یہ عالم تھا کہ ایک روز ٹوکرے والا آم لے کر حاضر ہوا آم بہت عمدہ تھے۔ مگر آپ نے دور سے دیکھکر ہی واپس کر دیا۔ کسی طالبعلم نے آم والے سے کہا ان آموں کو دھو کر کپڑے سے پونچھنے کے بعد چھوٹی ٹوکری میں رکھ کر کسی دوسرے وقت حاضر خدمت ہو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا منھ مانگی قیمت دیکر سب آم لے لئے گئے اور ہر آنے جانے والے سے اس کے سلیقہ کی تعریف کی۔

ایک بار کسی نے مجلس میں چمچہ کو چمچ کہدیا۔ مولانا کی طبع نازک پر یہ لفظ اتنا گراں گذرا کہ فوراً محفل برخاست کی اور کئی وقت تک اس کا اثر رہا۔

حضرۃ الاستاذ مولانا معین الدین اجمیری مرحوم کا بیان ہے کہ مولانا ٹونک میں اپنی قیام گاہ کے بالاخانہ پر تشریف فرما تھے۔ سڑک پر ایک بیل گذرا جس کے سینگ بہت بڑے اور بے تکے تھے۔ اسے دیکھ کر طبیعت میں تکدر پیدا ہوا اور فوراً ملازم سے سامان درست کرنے کو کہا۔ ہر چند تمام عقیدتمندوں نے روکنا چاہا لیکن نہ رکے۔ فرمایا جس جگہ ایسے بیل رہتے ہوں وہاں عبدالحق کیسے رہ سکتا ہے۔

جرأت کا عالم یہ تھا کہ ایک قتل کے سلسلے میں آپکے شاگرد رشید مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی پر الزام لگا دیا گیا وہ مولانا کے پاس تھے کہ کوتوال

کی تھی۔ دکاندار سے کہا کہ تم جاؤ ہم روپیہ بھجکر الوان منگالیں گے۔ طلبہ یہ
حال دیکھ رہے تھے ساتھیں میں سے حافظ محمد محسن خاں تھے جو کراری
(از مضافات آگرہ) کے زمیدار کے لڑکے تھے۔ یہ ذہین ہونے کے ساتھ
مولانا کے منھ لگے بھی تھے۔ تاجر جب چلنے لگا تو یہ اس کے ہمراہ ہوئے اور
باہر جاکر اس الوان کو چالیس روپیے میں خرید لائے۔ بعد عصر جب مولانا
رونق افروز مجلس ہوئے تو الوان لاکر نذر کی ساتھ ہی یہ بھی عرض کردیا۔
کہ حضور! چالیس میں خریدی ہے آپ نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور
اُٹھاکر پھینکدیا فرمایا یہ وہ تھوڑی ہی ہے بے وقوف ہم کو احمق سمجھتا ہے
اور جو دیکھا عقلمند کا بچہ سا ہے ہم گرہ کٹوا لیتے اور یہ اس کی گرہ کاٹ لائے
یہ کہہ کر دربار سے نکالدیا پریشان ہو کر مولانا کے پرانے عدمتگار بسراتی
کے پاس پہنچے۔ کچھ رقم دینے کا وعدہ کرکے اسے سفارش پر آمادہ کیا وہ اُٹھا
اور الوان کو درست کرکے وصلی پر لپیٹ کر اور ململ کے ٹکڑے میں باندھ کر
حاضر خدمت ہوا عرض کیا حضور! حافظ جی سے وہ الوان واپس کراکے
اور چالیس روپیہ مزید دے کر بیسد کردہ الوان لے آیا۔ مولانا نے الوان
دیکھ کر فرمایا۔ حافظ جی! دیکھو کتنا فرق ہے یہ دکاندار ہمارا نام سنکر آتے
ہیں منھ مانگے دام پائیں تو کوئی کاہیکو آئے لوگوں میں یہ چرچا تو ہے۔
کہ نوابوں کی مانند ایک نوریہ بستس ملاّئے مکتبی ایسا ہے کہ امراء کی طرح

اس انداز میں فرماتے کہ حقیقت ظاہر ہونے پر بھی ناگوار نہ گذرے۔

مولانا کو ایسا عارضہ لاحق ہوگیا کہ بگلوں کا شوربہ استعمال کرایا گیا۔ اس لئے بطوں کے ساتھ بگلے بھی پالے گئے تھے۔ بٹیریں بھی غذا میں رہتی تھیں۔ کئی دن تک دسترخوان پر بٹیر نہ دیکھی تو دریافت کیا، شبراتی ملازم نے جواب دیا۔ کہ بگلوں کے ساتھ رات کو بند کردی جاتی تھیں، وہ کھا گئے۔ خاموشی اختیار فرمالی مگر جو آیا اس سے ذکر کیا کہ ہماری بٹیریں بگلے کھا گئے فرزند سعید مولانا اسد الحق سے بھی یہ ذکر آیا۔ وہ کہنے لگے ابا جان! یہ کارستانی شبراتی کی ہے خود کھا گیا، بگلوں کے سر تھوپ دیا۔ مولانا نے منہ پھیر لیا اور کئی روز بات نہ کی کئی دن کے بعد عفوِ تقصیر کے لئے دست بستہ آکھڑے ہوئے تو فرمایا۔ میاں! تم نے ہمیں نادان سمجھا ہے شبراتی ابا صاحب کا پروردہ ہے۔ ہم کیسے اس کو چور بناتے۔ یہ تو تمھارا ہی جگر تھا کہ بزرگوں کے دیکھنے والے کے لئے ایسے الفاظ استعمال کر بیٹھے۔ میاں! اگر اس نے کھایا بھی تو ہم نے اتنا فضیحتہ کرلیا کہ وہ خود نادم نظر آتا ہے۔ زبان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بڑوں کے لئے بے ادبی کے الفاظ آئندہ استعمال نہ کئے جائیں۔

لکھنؤ کے ایک دکاندار مولانا کے لئے الوانیں لے کر آئے۔ مولانا نے ایک الوان اتنے روپیہ قیمت کی پسند فرمائی۔ قلمدان طلب کیا کچھ رقم کی

لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم، نواب بشیر احمد فاروقی خیرآبادی مرحوم، سید اعلاق الحسن مرحوم رئیس خیرآباد مفتی مدر محمد خان اختر مرحوم، مولوی محمد فاروق یز مرحوم، مولوی ظہیر احمد فاروقی ہمتہ سید محمد الحسن، مولانا حکیم احمد علی، حکیم سید انوار الحسین اور مولوی حکیم ظفر الحق وغیرہم راوی ہیں کہ مولانا کے مدلعاست یسدا دربار کے امراج کتے بڑے دبدبے والے اور با وقار تھے جو کوئی ملنے جاتا تواضع سے پیش آتے اوقات مقررہ کے علاوہ ملنے کی اجازت نہ تھی علمی دربار میں پورے لباس سے رونق افروز ہوتے اہل مجلس پر چھائے رہتے، کوئی سر و مل نہ کر سکتا تھا جع کر بات کرنا ممنوع تھا نشست گاہ پر مسند اور تکیہ لگا رہتا اور گرد قالین بچھے رہتے۔ باہر سے آنے والے مولانا کے دربار کو امیر کی مجلس سمجھتے دن میں دو تین بار لباس تبدیل فرماتے جس کمرہ میں نشست ہوتی ہر دروازہ پر جوتا رکھا رہتا جس طرف سے کمرہ سے باہر ہوتے ادھر پہننے کے لئے پاپوش رکھی ملتی۔

لباس عمدہ اور اعلیٰ قسم کا زیب تن فرماتے عامی استعمال کرتے لکھنؤ کے دکانداروں کو تشریف آوری خیرآباد کا حال معلوم ہوجاتا تو پچاس میل کا سفر طے کر کے اچھی چیزیں لاتے اور منھ مانگے دام پاتے،

مولانا ملازمین کی چالاکیوں سے کما حقہ واقف ہوتے ہوئے بھی تجاہل سے کام لیتے اور اکثر چشم پوشی فرماتے دوسروں پر اس کا اظہار

دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ مہاراجہ کشمیر نے افسر اعلیٰ کے ذریعہ سے گیارہ پارچہ کا خلعت اور نقد دو ہزار روپے معذرت کے ساتھ شمس العلماء کی خدمت میں بھیجے۔ شمس العلماء نے بجواب کہا مجھے افسوس ہے کہ مہاراجہ نے براہِ قدردانی خلعت و نقد سے عزت افزائی کی مگر میں اس کے قبول کرنے سے معذور ہوں کیونکہ میں رئیسِ رامپور کا ملازم ہوں۔

یہ پرچہ نواب مشتاق علی خاں بہادر ولیعہد رامپور کو ان کے کیمپ میں گذرا۔ خلد آشیاں فرمانروائے رامپور بیماری کی وجہ سے دہلی آنے اور دربارِ قیصری میں شرکت سے معذور رہے تھے۔ پرچہ گذرنے پر ولیعہد بہادر نے خلد آشیاں کو اس واقعہ کی اطلاع تار پر دی۔ تار ہی پر جواب آیا۔ ہماری طرف سے گیارہ پارچہ کا خلعت اور نقد دو ہزار پیش کرو۔

شمس العلماء جو کسی بات پر مدار المہام رامپور سے برہم ہو کر دہلی اس غرض سے آئے تھے کہ واپس نہ جائیں اور کسی ریاست میں ملازمت کر لیں۔ اس قدر افزائی پر دربارِ قیصری کے بعد رامپور چلے آئے اور پھر کبھی خلد آشیاں سے جدا نہ ہوئے۔"

مولانا کو دیکھنے اور برتنے والوں کی زبانی راقم الحروف نے سینکڑوں واقعے سنے جو مولانا کے فضل و کمال، حسنِ اخلاق، استغنا، جرأت اور حق گوئی و صداقت شعاری پر دلالت کرتے ہیں۔

مولانا عبدالحق صاحب علامہ خیرآبادی کسی قدر مسن آرہے ہیں۔ کشمیر کے ایک اعلیٰ افسر بھی لحاحت کمال ساتھ ہیں۔ مولانا اسی مسن کے ساتھ بیس پر سوار ہوگئے۔ ہم لوگ ایڈی کانگ کے ہمراہ خیمے میں آئے ہر طرف خاموشی تھی۔

سیٹھ صاحب نے دریافت کیا کہ کیا واقعہ ہے جواب ملا اسوقت واقعہ یہ پیش آگیا ہے کہ شمس العلماء کے تشریف لانے کے لئے یہ وقت مقرر کیا گیا تھا شمس العلماء تشریف لائے مہاراجہ نے سراہ تعظیم گوشۂ مسند پر جگہ دی مزاج پرسی فرمائی۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ ولیعہد کے اتالیق کو تکلیف دو، وہ بھی تشریف لائے مہاراجہ نے انہیں بھی شمس العلماء کے مقابل گوشۂ مسند پر جگہ دی ــــ ممکن ہے شمس العلماء کی نازک مزاجی نے اسے پسند نہ کیا ہو ــــ پھر مہاراجہ نے فرمایا مجھے مدت سے آرزو تھی کہ ایک بلند پایہ علماء کا کسی مسئلہ پر مناظرہ دیکھوں، یہ سنتے ہی شمس العلماء نے برافروختگی کے ساتھ کہا!

مہاراجہ آپ نے مرغ اور بٹیر کی پالیاں دیکھی ہوں گی علماء کی یہ شان نہیں ہے

ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے مہاراجہ کو عرق آگیا، اس مراس ما گولہ واقعہ کا زیادہ اثر تھا ہم لوگ بھی بغیر ملاقات واپس آگئے۔

میں تھا۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے خان بہادر سید ناصر علی صاحب غالباً موجود نہ تھے بعد کو آگئے۔ آپ کے چھوٹے بھائی سید نصرت علی صاحب مالک نصرت الاخبار دہلی کا زیادہ ساتھ رہتا۔ دن تو والیان ملک کے عالیشان پر فضا فردوسی کیمپوں میں گذرتا جو دہلی کے باہر کوسوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہر طرف لہلہاتے ہوئے چمن زار، سجے ہوئے بازار، ان کی وضع وقطع، ان کی آراستگی، یہ بھولا ہوا خواب کہاں تک بیان کر سکتا ہوں۔ اسی گلگشت میں ظہیر وانور سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ میری باریابی نواب مردان علی خاں صاحب بہادر خیرپور سندھ کے حضور میں بہ امتیاز خاص ہوئی تھی۔ حضور نواب صاحب اور تمام دربار فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ مجھے مہاراجہ کشمیر کے کیمپ میں بھی جانے کا اتفاق ہوا تھا اس بنا پر کہ مہاراجہ اس سے پیشتر رونق افروز لکھنؤ تھے تو سیٹھ سیتارام صاحب تعلقہ دار بسواں جن کے روابط مہاراجہ سے تھے مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے مگر اس وقت مہاراجہ بعزم واپسی سوار ہو رہے تھے۔ سرسری شرف تعارف حاصل ہو سکا۔ دربار دہلی کی تقریب میں سیٹھ صاحب موصوف بھی تشریف لائے تھے مجھے بھی مہاراجہ کے کیمپ میں ہمراہ لے گئے۔

دربار کیمپ کے قریب پہنچکر ہم نے دیکھا کہ درباری کیمپ سے شمس العلماء

جی چاہتا ہے کہ ریاض ہی کے قلم سے مولانا کے استغنا، جرأت، اور وقارِ علمی کا ایک منظر پیش کرتا چلوں۔ "دربارِ قیصری" کے زیرِ عنوان ریاض آپ اپنے آئینے میں" کے سلسلۂ مضامین نگارین لکھتے ہیں۔

دربارِ قیصری

جس زمانہ میں ریاض الاخبار ہفتہ وار اور گلکدہ ریاض ماہوار خیرآباد سے شائع ہوتا تھا (جس کے مطلع کا تاریخی نام "لمعۂ رختاں" تھا)
اعلیٰ حضرت نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نے مجھے میرے استاد حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے ذریعہ سے یاد فرمایا میں اس وقت دربارِ قیصری میں شرکت کے لیے دہلی جانے کو شدت سے بیتاب تھا اس سے پہلے دربارِ قیصری میں تمام اخبار نویس ہر صوبے سے مدعو تھے ان کا کیمپ خاص تھا جیسے بکمال تزئین و تکلف نصب تھے۔ دو ایڈیٹرں کے لئے ایک خیمہ مردری فرنیچر و اساب آرام کے ساتھ مخصوص تھا۔ کھانے اور ناشتے کے لئے خاص سرکاری اہتمام تھا۔ نیز تکلف چائے ہر وقت تیار رہتی تھی میں سدیاں اعلیٰ پیمانہ پر تاحدِ نظر ہر طرف تھیں۔ میں مع نظام احمد مرحوم لک ریاض الاخبار دہلی گیا۔ کیمپ کے سوا مولانا ابو المنصور مرحوم امام فن مناظرہ کے دولت خانہ پر مہمان مناظرہ اسے گذاری کا اتفاق دیں ہوتا۔ کیمپ میں سخانی اخبار کا خیمہ ہماری شرکت

شمس العلماء مولوی عبدالحق کے ساتھ تمام زندہ نام علماء آج تہ خاک ہوگئے ایک ذاتِ واحد میں ایسے کمالات غریبہ اور اوصاف عجیبہ کا جمع ہوجانا مرحوم مولانا کی ذات بابرکات کے ساتھ گیا۔

زمانہ تو صرف صورت ظاہری کا معاوضہ بھی نہیں کرسکتا۔ وہ نورانی چہرہ وہ خندہ روئی، وہ زندہ دلی، وہ سراپا علم، وہ رعب کمال، وہ شانِ ادب، وہ فضل وجلال۔

دیکھنے والے کے لئے صورت ہی پکار اٹھتی تھی کہ دنیائے اسلام کو فخر و ناز آج اسی قدسی صفات بزرگ پر ہے۔

شمس العلماء کا بہت بڑا احسان دنیا پر یہ ہے کہ وہ دولت علم وکمال کو خاندانی اختصاص کے ساتھ بہت ہی محفوظ طور پر منتقل فرماکر ایک ایسے سینہ کو گنجینۂ علوم بناگئے جو سلسلۂ فیض و برکت کے عدم انقطاع کا بہت ہی با اعتبار ضامن ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ ہز ہائنس فرمانروائے رامپور اور اعلیٰ گورنمنٹ نظام شمس العلماء مرحوم کے وظائف ان کے صاحبزادہ مولانا اسد الحق صاحب کے نام منتقل فرمادیں گے کہ مقامات مختلف وممالک دور دراز کے طلباء بے آس نہ ہوں اور دارالعلوم خیرآباد دارالعلوم بنا رہے۔"[1]

---

[1] نثر ریاض صفحہ ۲۱۱ مرتبہ عقیل احمد جعفری خیرآبادی۔

جنائے شمس متی امیر احمد امیر مینائی نے تاریخ کہی۔

شمس العلماء رطلت دہر چوں تیر را تیرہ برست
بر لوح مزار امیر بنویس آسا مگہ امام وقت است
۱۳۱۲

مولانا کے اس حادثہ رحلت پر نہ صرف مدارس ہندوستان میں ماتم کیا گیا بلکہ بیرون سند بھی علماء وامیان نے سوگ منایا خلیفۃ المسلمین سلطان ٹرکی نے بھی ایک ہفتہ تک مدرسہ اظہریہ میں تعطیل رکھی۔ ملکی اور غیر ملکی جرائد نے مقالات لکھے

امیر مینائی کے شاگرد رشید لسان الملک ریاض خیرآبادی نے اپنے اخبار ریاض الاخبار میں آج سے ۸۴ سال قبل جو کچھ لکھا تھا اسے درج کیا جاتا ہے۔

علم وفضل کا گھر بے چراغ ہوا

"جناب شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب قبلہ کے انتقال کا صدمہ ایسا نہیں ہے کہ ملک وقوم اس کو بھلا سکے اس حادثہ سے صرف خیرآبادہی دارالعلم نہ رہا بلکہ ہندوستان ہی سے یہ گھر معدوم ہوگیا اور ہندوستان کے ساتھ عرب وعجم سے بھی کچھ شک نہیں ایسے آفتاب علم وفضل کے زوال ہونے سے دیدۂ اسلام تاریک ہوگئی

مولانا علماء کا برا اسلام کے محب قابل قدر یادگار تھے سچ پوچھیے تو

یہ بھی ناکافی ہوتے، نواب خلد آشیاں کی رحلت کے بعد خیرآباد چلے آئے۔ کچھ دن بعد آصف جاہ نظام حیدرآباد نے بلا بھیجا۔ حیدرآباد پہنچنے پر امراء و ارکین دولت نے استقبال کیا۔ وثیقہ جاری کیا گیا۔ تھوڑے دن قیام فرماکر وطن واپس ہوئے تین سال کے بعد نواب حامد علی خاں نے رامپور میں قیام پذیر ہونے کی درخواست کی۔ ایک سال نواب کی خاطر سے گذار کر خیرآباد آ گئے۔ یہاں ورم جگر، استسقاء اور ضیق نفس میں مبتلا ہو گئے۔ زبان و قلب سے ذکر الٰہی میں مشغول رہتے۔ حضرت شاہ اللہ بخش تونسوی سے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے۔ آخر عمر میں والد ماجد کی طرح تصوف کی طرف پوری توجہ مرکوز ہو گئی تھی۔

خلف الرشید صاحبزادہ مولانا اسد الحق نے حالت متغیر ہونے پر ہدایات طلب کیں۔ ارشاد ہوا۔

> دنیا سے احتراز، دراہم و دنانیر سے اجتناب، حبِ مال تمام برائیوں کی جڑ ہے مسلمان کے لئے مال و دولت کی خواہش نازیبا و اسکی ہوس بدترین گناہ ہے۔

اسی شب (۲۳، شوال المکرم ۱۳۱۶ھ) میں عالم جاودانی کو رونق بخشی، احاطۂ درگاہ مخدوم شیخ سعد میں اپنے دادا مولانا فضل امام اور ان کے استاذ الاساتذہ ملا اعلم سندیلوی کے پاس مدفون ہوئے۔

انھیں باکمال اساتذہ کا ڈنکا بج رہا تھا چاروں طرف علم و ادب کے چرچے تھے۔

والد گرامی نے تربیت کے ساتھ ساتھ تدریس و تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کیا ہاتھی اور پالکی پر دربار آتے جاتے وقت درس دیتے، پڑھاتے جاتے لکھ لکھاتے ۱۶ سال کی عمر میں تمام درسیات منقول و معقول سے فارغ کر دیا۔

مولانا کا آبائی وطن خیرآباد کبھی علم و ادب کا گہوارہ تھا شاہی زمانے میں کشتری رہ چکا تھا بڑے بڑے علماء و مشائخ صاحب کمال اور اہل فن افراد، ہر دور میں ہوتے رہے ہیں۔ ہندستان کے مردم خیز قصبوں کے صف اول میں اس کا شمار رہا ہے۔[1]

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی میں کھیرا پاسی نامی ایک شخص نے اس کی بنیاد ڈالی تھی بعد میں ایک کاستھ خاندان اس پر قابض ہوا اسلامی دور سلطنت میں کھیرہ کا خیر نکھر خیرآباد ہو گیا۔

عہد اکبری میں سرکاری کشتری بنایا گیا جہاں نائب صوبہ دار یا ناظم رہا کرتا تھا حدود علاقہ زیر حکومت کو سرکار کہتے تھے۔ ناظم کے ماتحت کئی نائب ناظم (کلکٹر) ہوا کرتے تھے۔ ان کے زیر حکومت علاقہ کو چکلہ کہا جاتا۔ اس نظام حکومت میں بائیس محال یا پرگنے شامل تھے۔ جن میں سے متعدد محال اسی کھیری دربوں میں واقع تھے خیرآباد دو محال شامل پرگنہ حویلی خیرآباد مشمول تھا جس کا رقبہ ۵۰۲۷۲ ۵۹ بیگہ تھی اور مالگذاری ۲۱۶۱۲۲۴ دام زمیندار برگس تھے فوجی قوت ۵ سوار ۲ پیدل حکومت کے لیے تیار رکھتے تھے۔ ابتداء علمداری انگریزی سے اس کی آبادی میں کمی ہوئی ہے ۱۸۶۹ء میں جب پہلی مردم شماری ہوئی تو ۱۵۶۰۰ آبادی تھی بحسب حالیہ مردم شماری میں ۱۳۶۴۴ افراد ہیں۔

مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی دلی میں ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد علامہ فضل حق خیرآبادی دلی میں سررشتہ دار ریذیڈنٹ، عوام و رعایا میں ہر دلعزیز اور حکام و دربارِ شاہی میں معزز و با اقتدار تھے۔ فرزند دلبند کے تولد پر ہدایا و تحائف کے ڈھیر لگ گئے۔ لاکھوں روپیہ نذرانے میں پیش ہوا۔ خوش بخت و بلند طالع مشہور ہوئے۔ زمانۂ قیام خیرآباد میں رویتِ ہلال کے بعد فالِ نیک کے طور پر، لوگ، چہرہ آ کر دیکھا کرتے تھے[1]

ہوش سنبھالا تو باپ کی علمی مجلسوں کا رنگ دیکھا، مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور کا دربار علمی نظر سے گذرا۔

علماء میں، "مولانا رشید الدین خاں، مولوی مخصوص اللہ بن مولانا شاہ رفیع الدین، مولانا قطب الدین خاں، مولوی کریم اللہ، مولوی سید محبوب علی، مولوی نصیر الدین شافعی، مولانا محمد نورالحسن، مولانا مملوک علی، سراج العلماء مفتی سید رفعت علی، آخون شیر محمد افغانی، مولوی سید امان علی، مولانا شاہ محمد اسحاق محدث،

مشائخ میں، مولانا شاہ غلام علی، مولانا شاہ ابو سعید، حضرت شاہ محمد آفاق مجددی، حضرت شاہ غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب، خواجہ محمد نصیر

شعراء میں، مرزا اسداللہ خاں غالب، امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، وغیرہم

---

[1] حسرۃ العلماء بوفاۃ شمس العلماء، ۱۲۔

سلسلۂ تلامذہ

جیسا کہ گذر چکا ہے کہ علامہ کا سلسلۂ تلامذہ نہ صرف ہندستان بلکہ بیرون ہند، حجاز، بخارا، افغانستان، اور دوسرے دور دراز ممالک تک پھیلا ہوا ہے ہندستان کے اکابر مشاہیر امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد علامہ سید سلیمان ندوی، وغیرہما[۱] اسی دریائے فیضان سے سیراب ہوئے ہیں تلامذہ اور تلامذۃ التلامذہ کی فہرست میں ایسے ایسے نامور اہل فضل و کمال افراد گذرے ہیں کہ مستقل کتاب ان کے حالات میں مرتب ہو سکتی ہے اس جگہ ان کے تفصیلی ذکر کا نہ موقعہ ہے اور نہ گنجائش صرف علامہ سے لیکر محمد ایجاں تک اکابر سلسلہ کا مختصر تذکرہ درج کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شمس العلماء مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی

محقق جلیل، مدقق بے مثیل، سرخیل فضلاء عصر، سرآمد کملاء دہر، شمس العلماء

---

[۱] مشہور لیڈر مولانا عبیداللہ سندھی بھی مولانا عبدالحق حقانی کے تلمیذ مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد ہیں مولانا عبدالحق جب وطن سے والد ماجد کے ساتھ چلے گئے تو مولوی عبدالعزیز کو بچپن ہی میں دیکھا تھا بعد میں ۔۔۔ کے منصب مولانا کی مدرسی تعلیم کے لئے حاضر ہوئے تو پہلی نظر ہی میں پہچان لیا اور شریک درس کر لیا ۱۲
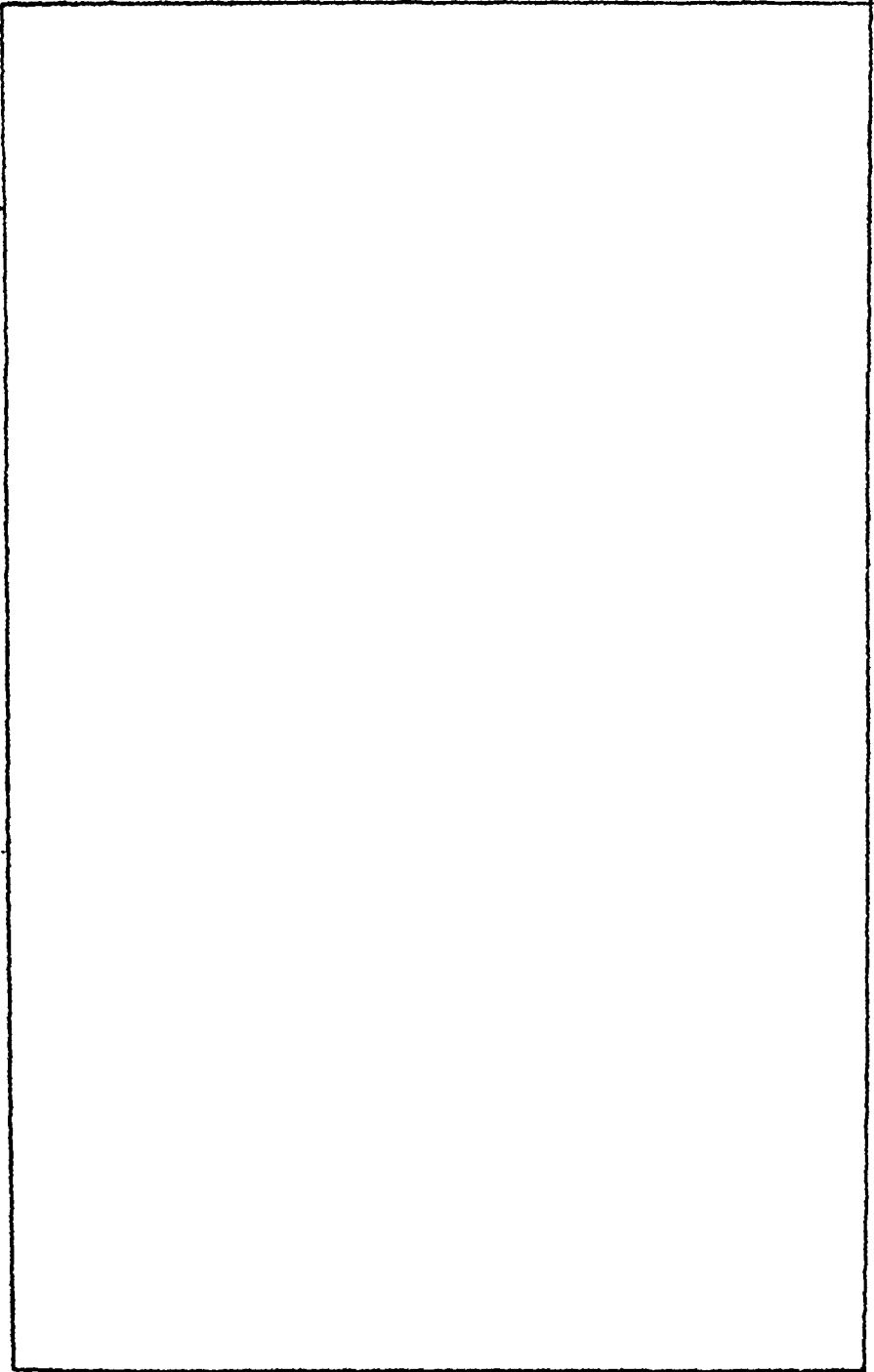
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اور پھر تماشا یہ ہے کہ جو جاتا ہے پھر مڑ کے نہیں دیکھتا ابوطالب کلیم ہمدانی ملک الشعراء دربار شاہجہاں نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دمع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست
رُو پس نکرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت

۵۔ مولانا سلطان احمد بریلوی
۶۔ مولانا عبداللہ بلگرامی۔
۷۔ مولانا عبدالقادر بدایونی۔
۸۔ مولانا شاہ عبدالحق کانپوری
۹۔ مولانا ہدایت علی بریلوی (استاذ مولانا فضل حق رامپوری مرحوم)
۱۰۔ مولانا غلام قادر گوپاموی (سبط مولانا فضل امام) ناظر سرشتہ دار عدالت دیوانی و تحصیلدار گوڑگانواں
۱۱۔ مولانا خیرالدین دہلوی (والد امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد)

مولانا عبدالحق کے نامور تلامذہ میں سے مولانا حکیم سید برکات احمد بہاری ٹونکی المتوفی ۱۳۴۷ھ تھے، موصوف سے علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری المتوفی ۱۳۵۹ھ نے کسب فیض کیا۔ اور مولانا اجمیری کے نعلینِ مبارکین اٹھانے کا راقم السطور کو بھی فخر حاصل ہے۔

پہنچا کہاں سے ہے کہاں سلسلۂ درازِ علم

تیرھویں اور چودھویں صدی کے اکثر فضلاء ہند خیرآبادی شجر علم کے خوشہ چیں ہوئے ہیں، موجودہ دور کے صفِ اول کے مشاہیر امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر علامہ سید سلیمان ندوی، وغیرہما کو بھی نسبتِ تلمذ علامہ کے تلامذہ سے حاصل ہے۔ دنیا میں اہلِ کمال بھی زوال سے نہیں بچے، عالم کی ہر چیز کو فنا ہے۔

صدقۂ جاریہ میں علم نافع بھی ہے تلامذہ و تصانیف یہی دو ذریعے نشر و اجراء علم کے ہیں تلامذہ کا شمار اتنے عرصہ کے بعد ممکن نہیں۔ حکومتی دریاستی عہدے کبھی متعلقہ درس میں حارج نہ ہوئے ۱۸۰۹ء سے ۱۸۵۹ء تک مسلسل پچاس برس درس دیا عرب، ایران، بخارا، افغانستان، اور دوسرے دور دراز ملکوں سے شائقین علم آکر شریک حلقۂ تدریس ہوتے تھے دہلی دار السلطنت تھا، معقولات میں ولی اللہی مدرسہ اور معقولات میں خیر آبادی مکتب کا سکہ چل رہا تھا۔ اس لئے مشتاقان علم دونوں پروانہ وار دونوں شمعوں پر گر رہے تھے۔

کاش کوئی قریب تر زمانے میں علامہ کے تلامذہ کی فہرست مرتب کر لیتا ہزاروں شاگردوں میں سے چند مشہور تلامذہ جو اپنے وقت کے امام الفن سمجھے جاتے تھے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شمس العلماء مولانا محمد عبدالحق خیر آبادی۔

۲ مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری (استاد مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم سابق صدر دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و مولانا امجد علی اعظمی صاحب بہار شریعت)

۳ ادیب جلیل مولانا فیض الحسن سہارنپوری (استاد علامہ شبلی نعمانی)

۴ مولانا عمیل احمد۔

اسد الحق، ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ کو راہیٔ ملک بقا ہوئے۔ اب صرف مولوی حکیم ظفر الحق خیرآبادی بن مولانا اسد الحق اس دودمانِ عالی کے تنہا چشم و چراغ ہیں جو عمر کی تقریباً ساٹھ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ اطبار خیرآباد کی صفِ اول میں آپ کا شمار ہے۔

علامہ کی دوسری اہلیہ دہلی کی تھیں۔ یہ شادی غیر کفو میں کی تھی۔ ان سے دو صاحبزادے مولوی شمس الحق اور مولوی علاء الحق ہوئے۔

اول الذکر کی دختری اولاد دہلی میں موجود ہے۔ مولوی علاء الحق سے مولوی ضمیر الحق اُن سے مولوی فیض الحق موجودہ ممبر مال ریاست بھوپال ہیں۔

تلامذہ

سچ پوچھئے تو اصلی اولاد، روحانی اولاد ہے، اسی لئے علمائے کرام نے ہر نیک اعمال اور متبع سنت مسلمان کو سرورِ کائنات علیہ السلام والتحیات کی آل میں شامل مانا ہے یہی وجہ ہے کہ درود میں آل کے ساتھ اصحاب کا لفظ نہ بھی آئے جب بھی صحابۂ کرام داخل ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابو عبد اللہ مشرف بن مصلح سعدی شیرازی نے خوب کہا ہے۔

پسرِ نوح با بداں بنشست — خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحابِ کہف روزے چند — پئے نیکاں گرفت مردم شد

ہم نے علماء کے وقار کو ختم کر دیا ہے"
وہ یہ سمجھا کہ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا جائے گا
اس نے "یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھم واللہ متم نورہ"
شاید یہ آیت نہیں سنی تھی۔

اے کاش مسلمان قوم سوچتی کہ وہ انگریز کی صد سالہ اسکیم کو اس پردے میں عملی جامہ پہنا رہی ہے وہ اپنے مجاہدین و سرفروش علماء کی توہین و تذلیل ان سرکاری ایجنٹوں کے اشاروں پر سادگی سے نہیں کر رہی ہو بلکہ اپنے پاؤں میں اپنے ہی ہاتھوں سے کلہاڑی مار رہی ہے۔

وہ وقت دور نہیں جب افق ہندستان پر آفتاب آزادی طلوع ہوگا اس وقت اس ناسمجھ قوم کو پچھتانا اور کف افسوس ملنا پڑے گا۔ ہمیں فخر ہے کہ آج بھی ہندستان کی سیاست کے آسمان پر سب سے بلند مقام اسی طبقۂ علماء کے ایک فرد امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے جو سال صدارت مجلس وطنی کے نازک دور میں یہ ثابت کر دیا کہ کشتیٔ آزادی کو ساحل مقصود تک پہنچا دینا ایسے باکمال ناخدا کا کام ہو سکتا تھا۔

ہمیں یہ شکوہ بیت المقدس پر قبضۂ نصاریٰ سے ملتا ہے ۱۰۹۹ء سے ۱۱۸۷ء تک ۸۸ سال تسلط رہا جس میں ظلم و تعدی کی انتہا ہو چکی تھی

مولانا مفتی لطف اللہ علیگڈھی سررشتہ دار صدر امین بریلی، علامہ فضل حق خیرآبادی سررشتہ دار ریذیڈنسی دہلی وصدر الصدور لکھنؤ و مہتمم حضور تحصیل اودھ۔ مولوی غلام قادر گوپاموی ناظر سررشتہ دار عدالت دیوانی و تحصیلدار گوڑگاؤں مولوی قاضی فیض اللہ کشمیری سررشتہ دار صدر الصدور دہلی وغیرہم یہ سب اپنے وقت کے بے نظیر وعدیم المثال اکابر علماء تھے۔ حکومت کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی' ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ موقعہ کا انتظار تھا ۱۸۵۷ء کا وقت آیا تو سب میں پیش پیش یہی حضرات تھے۔ والیانِ ریاست اور اراکین دولت میں ناقوسِ حریت پھونکنے والے یہی تھے۔ عوام کو ابھارنا اور فتوئ جہاد جاری کرنا انھیں کا کام تھا۔ اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے زیادہ مصائب اُٹھانے اور آتشِ حریت میں جلنے والے یہی شمع شبستانِ آزادی کے پروانے تھے۔ انگریز نے ان کو جانا اور پہچانا۔ ایک ایک کرکے تمام عہدوں سے اس طبقہ کو سبکدوش اور اس گروہ کے خلاف پورا محاذ قایم کیا۔ اپنی ایک مخصوص جماعت چھوڑی جس کا سب سے بڑا مقصد علماء کی تذلیل و توہین' ان کو سیاست سے نابلد بتا کر اور دقیانوسیت کا الزام لگا کر قوم کی زمامِ قیادت پر قبضہ کرنا تھا۔ یہی روح کارفرما تھی جبکہ اسی قسم کے ایک "ممبر اعظم" نے ۱۹۴۷ء میں کلکتہ سے فخریہ انداز میں اعلان کیا کہ

دشوار کنٹرول کی دکانوں سے لیے ہیں عزت و آبرو اور دہشت عزیز کی بربادی، شہر میں دراسی گرد نزیر دکانوں اور گوداموں کی قفل سدی، ان سب مصیبتوں کا مستقل ہر کہ دمہ کو سامارہا ہے۔

ارجولائی ۱۹۷۲ء سے پوسٹمینوں اور کم تنخواہ والے ملازمین پوسٹ آفس کی عائد احتجاجی ہڑتال برداشت کی سہولتیں چھین لیسے کی، مرکزی حکومت کی طرف سے دھمکی نے علامہ کے بیان کو بالکل سچ کر دکھایا۔

کیا سچا ارشاد ہے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا۔

اتقوا فراستہ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ

مومن کی فراست سے ڈرتے رہو، یہ اللہ کے نور سے کچھ دیکھ لیتا ہے

کہاں ہیں اس قول کے قائل کہ مولوی کو سیاست نہیں آتی ، آئیں اور رسالہ الثورۃ الہندیہ پڑھیں مولوی کی سیاست علام دماغ نہیں سمجھ سکتا۔ انگریز سمجھتا ہے سوچو اور غور کرو۔ ۹ سال قبل سارے دفاتر پر اسی طبقہ کا قبضہ تھا علما ومشاہیر وقت سرکاری وشاہی محکموں پر قابض تھے۔

مولانا فضل امام خیرآبادی صدر الصدور دہلی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مفتی عنایت احمد کاکوروی مصنف وصدر امین کول وبریلی، مولوی فضل رسول بدایونی سررشتہ دار کلکٹری صدر دفتر سہسوان، مفتی انعام اللہ گوپاموی قاضی دہلی وسرکاری وکیل الہ آباد

کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قایم کئے۔ پچھلے زمانہ کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔"

"دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقات پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمینِ ہند کے غلّہ کی پیداوار کاشتکاروں سے لیکر نقد دام ادا کئے جائیں۔ اوران غریبوں کو خرید و فروخت کا کوئی اختیار نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح نرخ کے گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی مخلوق مجبور و معذور ہو کر ان کے قدموں میں آپڑے اور خوراک وغیرہ نہ ملنے پر ان کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔"

پہلی اسکیم کے متعلق لارڈ میکالے کے یہ جملے کافی سند ہیں۔

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، زبان اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔"

دوسری اسکیم پر جب عمل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن اس چار سالہ زمانہ جنگ کے کنٹرولی عملدرآمد نے باشندگانِ ہند کی آنکھیں کھولدی ہیں۔ غلّہ کا ملنا

غداران ازلی اور مذہب وملت کے منافقانِ سرمدی ہیں۔

من جرّب المجرّب حلّت بہ الندامۃ

آزمائے ہوئے کو آزمانے سے آخر میں شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے

علامہ کی سیاسی بصیرت اور فطری فہم و فراست کا اندازہ رسالہ الثورۃ الہندیۃ کی تمہید عبارت کے بعد آنے والی عبارت سے لگائیے جس کی ابتدا من قصتہا کے جملے سے ہوتی ہے۔ علامہ نے اس میں بتایا ہے کہ ہندوستان پر تسلط کے بعد انگریز بقائے سلطنت کے لئے دو اسکیموں پر عمل کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

اوّل یہ کہ پچھلے زمانہ کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب مٹانے کے بعد اسکولوں کی یکساں تعلیم کا رواج جس سے ہر مذہب و ملت کے افراد ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں۔ دوّم یہ کہ علماء پر کنٹرول کر کے خدا کی مخلوق کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا جائے۔ علامہ لکھتے ہیں۔

انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی یا دیگر فرقوں کا اختلاف، تسلط و تصرف کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا، اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا اس لئے پوری مذہبی اور جانفشانی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر و حیلے سے کام لینا شروع کیا انھوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان و مذہب کی

وجاہ پسند طبقۂ امراء خواب راحت میں سوتا رہا۔ سوتا ہی رہتا تو بھی زیادہ شکوہ نہ تھا۔ جاگا اور مسلمانان ہندو مقاماتِ مقدسہ کے سینوں کو چھلنی کرانے کے لئے رنگروٹوں کی بھرتی کرائی۔ حیثیت سے زیادہ چندے دیئے۔ وفاداری کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ بڑے بڑے عہدے اور خطابات حاصل کئے۔ انعامی جاگیریں پائیں۔ مختصر یہ کہ وہ سب کچھ کیا جو نہ کرنا چاہیئے تھا اور وہ کچھ نہ کیا جو کرنا چاہیئے تھا۔

علماء و مجاہدینِ ہند نے اپنی طرف پکارا تو غیروں سے پہلے یہ اپنے ہی درپئے آزار ہو گئے۔ تقریروں میں کنستر پٹوائے۔ مقبوضہ دیہات میں تالیاں پٹوائیں۔ پتھر مروائے۔ جلسوں میں شور و ہنگامہ کرایا۔ اور آخری حربہ یہ کہ جھوٹی شہادتیں مہیا کر کے حکومت وقت کی خوشنودی کے لئے گرفتار کرا کر لمبی لمبی سزائیں کرائیں۔

آج جبکہ حکومت برطانیہ کا رختِ سفر بندھ چکا ہے۔ پر پرواز تل چکے۔ بین الاقوامی حالات اور ملکی تحریکات نے اسے سب کچھ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو اس درندہ صفت، انسان نما گروہ نے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی یعنی خطابات کی واپسی کو جہاد سے تعبیر کرنا شروع کیا۔ اور بغلیں بجا بجا کر اپنی بہادری کا ڈنکا پیٹنے لگے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ انسانی لباس میں درندے اور بھیڑ کی کھال میں بھیڑیے ہیں۔ ملک و قوم کے

کے مکاں میں ایک ہے آگرہ دیرہ سے پتھر منگوائے گئے تھے۔ تقریباً بیس سال ہوئے جب یہ مکان کھدوایا گیا تھا دروازے پر ہاتھی بھی جھوم رہے تھے وہ بھی لیلائے حریت پر بیچا اور ہو گئے۔ مولانا حکیم احمد علی صاحب خیرآبادی فرماتے ہیں کہ علامہ کا کتب خانہ بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔

جب خلف الرشید مولانا عبدالحق خیرآبادی کو دلداری کے میٹ لطمہ ۱۶ فروری ۱۸۶۰ء میں لارڈ ڈون گورنر جنرل ہند کے دستخط سے سند خطاب شمس العلماء بلا کسی طلب و کوشش کے ملی تو علامہ کے ضبط شدہ دیہات میں سے کچھ دیہات بھی واپس دیئے جانے کا حکم دیا گیا۔ مولانا فرمایا کرتے تھے باپ کو کالا پانی کیا اور بیٹے کی خطاب سے اشک شوئی کی!

مولانا عبدالحق رامپور میں تھے خیرآباد کے ایک باشندے یار علی نے علامہ فضل حق کا بیٹا اس کردہ دیہات قبضے میں لے لئے۔ ادھر نگری چوپٹ راج کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا مل سکے گی مولانا عبدالحق نے عبد دار حق غیرہ کسر شان سمجھ کر خاموشی اختیار فرمائی بعد میں یار علی نے مصلحتاً یہ دیہات بیچ ڈالے۔

ان میں سے ایک موضع ذین پور ہے جو حضرت مولانا شاہ سید محمد اسلم خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشیں آستانہ حافظیہ المتوفی ۱۳۲۰ھ نے ایکھرار میں خرید کر اپنے پیرو مرشد حافظ سید محمد علی شاہ علیہ حضرت شاہ محمد سلیمان

رئیس کمال پور ضلع سیتاپور راجہ جواہر سنگھ کے ہاتھ پانچ سات ہزار میں
کوڑیوں کے مول فروخت کر ڈالے۔ عرصہ دراز تک راجہ جواہر سنگھ اور انکے
بعد ان کے بیٹے راجہ سورج بخش سنگھ نے اپنی جگہ پر قایم رکھے۔ مولوی
حکیم ظفر الحق بن مولانا اسد الحق بن مولانا عبدالحق فرماتے ہیں کہ خود راجہ
مذکور نے مجھ سے کہا کہ صرف علامہ کی یادگار میں میں نے اسے محفوظ رکھا ہے۔
جب بارش کی کثرت اور غیر آباد حالت میں پڑے رہنے سے آثار شکست و
ریخت نمودار ہونے لگے تو ایک انجینیر کو درستی کے لئے بھیجا تخمینہ درستی
تیس پینتیس ہزار روپیہ بتایا گیا تو راجہ نے مجبوراً پتھر کھدوا کر کمال پور
منگوا لئے۔ اور کچھ سامان حکیم سید انوار حسین خیر آبادی مشہور طبیب و معالج
خاص تعلقداران اودھ کو دیدیا۔ دروازہ[1] بطور یادگار باقی رہنے دیا۔
جو آج بھی صاحب مکان کی عظمت و جلالت کا مرثیہ زبان حال سے پڑھ رہا
ہے۔ اور دیکھنے والوں کے لئے عبرت و موعظت کا سامان مہیا کر رہا ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

یہ مکان موسومہ "نیا محل" منشی نیاز احمد فاروقی بانی مدرسہ نیازیہ رئیس خیرآباد
کے مکان کی نقل تھی۔ فرق اتنا تھا کہ اس میں دو تہ خانے تھے اور منشی صاحب

---

[1] دروازہ کا اندرونی اور بیرونی منظر کا فوٹو لے لیا گیا ہے جو شامل کتاب ہے۔

یشائیوں کا سامنا رہا سب سے بڑی مصیبت ضبطی جائداد واملاک کی
ی۔ علامہ بڑے امیر کبیر تھے دولتِ دنیا ودین دونوں سے بہرہ ور
در صاحب عز ووقار تھے حکام وقت، شاہزادگان عالی تبار، امراء
رساء اور علماء وصلحا سبھی عزت کرتے تھے شاہانہ زندگی گذاری، ہاتھی
دارے، پالکی، فینس اور دوسری شان وشوکت کی سواریاں ہر وقت
روازے پر موجود رہتیں جب مولانا عبدالحق پیدا ہوئے تو دہلی کے
اص وعوام، اور برادران وطن نے بھی بطور اظہار خوشی ندرانے اور
فے لاکھوں روپیہ کے پیش کئے لہ

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر خود علامہ نے قصیدۂ ہمزیہ میں اپنی ثروت د
راعت کا ذکر فرمایا ہے۔

کانت لفضل الحق فضل متانۃ　　مہما علی الامثال لی استعلاء
ووجاہۃ بین الوجوہ وجاہۃ　　تحولہا الاعیان والرؤساء
وبراعۃ وبراعۃ وبراھۃ　　وبراھۃ وسماحۃ وعلاء

حرم نعادت تابت ہونے پر خیر آباد کا سنگیں دعالیشان دیوانحانہ
ورمحل سرا ضبط کرکے بصلۂ خیر خواہی سردار محمد ہاشم شیعی سیتاپوری
مورث اعلیٰ آغا فتح شاہ مشہور پلیڈر سیتاپور) کو دیدیئے گئے انھوں نے

لہ حسرۃ العلماء بوفاۃ شمس العلماء مولوی مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی

ملکوتیۃ کان یری الطالبین نظریاتہا' ببیان الصافی کالمحسوسات المرئیۃ' واما ارتجالہ بالخطب والاشعار العربیۃ' مع التجنیس والاشتقاق وحسن البراعۃ والطباق وغیرھا من الصنائع الادبیۃ' فلم یخلق مثلہ فی البلاد' ولم یات عدیلہ فیما افاد واجاد"[۱]

ترجمہ :۔ "علوم عقلیہ و نقلیہ کے متبحر اور ماہرین کاملین پر نفس قدسیہ کے باعث فائق تھے' آپ کے کمال کی شہرت سارے زمانے میں پہنچی ہوئی تھی۔ اور آپ کے فضل و جلال سے سارا آفاق گونج رہا تھا علوم میں فن معقول کا غلبہ تھا اور منقولات میں ادب' کلام' اور اصول پر توجہ خاص تھی معقولات میں نفس قدسیہ اور ملکہ ملکوتیہ کو درج فرمایا۔ طلبہ ان کے بیان صافی کی وجہ سے نظریات معقولات کو بالکل محسوس و مرئی پاتے تھے۔ خطبات واشعار فی البدیہہ فرماتے تھے۔ تمام صنائع ادبیہ تجنیس' اشتقاق' حسن براعت اور صنعت طباق کا ارتجال کے باوجود پورا پورا مظاہرہ ہوتا تھا۔ انھیں کمالات کے پیش نظر اپنے علم و فضل میں بے نظیر اور افادہ و تلقین میں بے عدیل تھے"

مصائب کا خاتمہ علامہ کی ذات ہی پر نہیں ہو جاتا۔ اولاد و احفاد کو بھی

---

[۱] خطبۂ ہدیہ سعیدیہ

واپس لوٹے۔

قسمت کی بد نصیبی کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

افسوس امیٹھہ کے لئے یہ آفتاب علم وعمل دیار غربت میں غروب ہو گیا
اب تک مزار مرجع انام اور زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ اور آج
بھی قبر بزبان حال کہہ رہی ہے

تلک آثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الی الآثار

مولانا عبداللہ بلگرامی لکھتے ہیں۔

"فاذرج الفضل فی اثناء اکفانہ، ودفن العلم تاند فانہ[1]"
فضل ان کے کفن میں لپٹا، اور علم ان کے ساتھ مدفون ہو گیا

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

تبحر فی العلوم العقلیۃ والنقلیۃ واناف علی المہرۃ الکملۃ،
بالمس القدسیۃ، حتی امتلأت الآفاق بصیت کمالہ،
وسمت الانظار بعصلہ وجلالہ وکان الغالب علیہ من
العلوم المعقول، ومن المنقولات العلوم الادبیۃ والکلام
والاصول اما المعقولات فرق فیہا انھما اقدسیۃ وملکۃ

---

[1] حلیۂ سعیدیہ۔

کرکے حاشیہ پر بہت سی کتب کے حوالے لکھ دیئے۔ جب یہ کتاب وہ مولوی صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے وہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا کہنے لگا مولوی صاحب! "تم بڑا لائق آدمی ہے مگر جن کتابوں کے حوالے ہیں اور ان کی جو عبارتیں نقل ہیں یہاں کہاں ہیں"۔

مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ علامہ کا کہہ سنایا۔ وہ اسی وقت مولوی صاحب کو لے کر بارک میں آیا۔ علامہ موجود نہ تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آرہے ہیں۔ وہ یہ ہیئت دیکھکر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ معذرت کے بعد کلرکی میں لے لیا۔ گورنمنٹ میں سفارش بھی کی۔ ادھر علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بے خبر میر منشی لفٹیننٹ مغربی و شمالی صوبہ اود ھ سرگرم سعی تھے۔ پروانۂ رہائی حاصل کرکے مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہوگئے۔ وہاں جہاز سے اتر کے شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑا اژدہام تھا۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق خیر آبادی کا انتقال ہوگیا ہے۔ اب سپرد خاک کرنے جارہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت و یاس شریک دفن ہوئے۔ اور بے نیل مرام

مختلف پرچے تھے جن کو کئی ماہ کی محنت کے بعد درست و مرتب کر پائی تھی۔

الحمد للہ عظیم الرجاء للدعاء من دون الاحجاء،
من السلویٰ والسلیٰ والبلاء والمدحس البلاء و ایتاء الآلاء،
لمن دعاہ ما سمی الاسماء لاسیما لمن ظلم واصطفیٰ
علی الامتلاء بالاسواء والادواء،
مالح اضاقتی اوہاں امتحان الاوشیع امتحانی و امتحانی

عودی تعودی مریضا دائمًا عائدی   اشتی علی الحیس حتی عادۃ العادی
دانی عُضالُ ولا یجدی لعائدۃ   عود للداء لعود الداء عوّاد

علامہ اور ان کے ساتھیوں کو کیا کیا تکالیف اٹھانا پڑیں اور انڈمان میں کیسے دلت آمیز برتاؤ سے سابقہ رہا۔ رسالہ و قصائد میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے سپرنٹنڈنٹ ایک شریف انگریز تھا مشرقی علوم سے واقف اور فن ہیئت کا بڑا ماہر تھا اس کی پیشی میں ایک سراپا فتنہ مولوی بھی تھا اس نے ایک فارسی کی کتاب ہیئت ان کو دی کہ اسکی عبارت صحیح و درست کر دیں۔ مولوی صاحب سے تو کام چلا نہیں علامہ نئے نئے گئے تھے، ایک سال ہی گذرا تھا ان کی خدمت میں وہ کتاب پیش کر کے تصحیح کی گذارش کی علامہ نے نہ صرف عبارت درست کی بلکہ مباحث میں بہت کچھ اضافہ

واپسئی ہندستان پر شاگرد رشید مفتی لطف اللہ علیگڈھی نے تاریخ لکھکر پیش کی

چو بفضلِ خالقِ ارض وسما اوستادم شد ز قیدِ غم رہا

بہر تاریخِ خلاصِ آنجناب بر نوشتم "اِنَّ اِستاذی نجا"[۱]

مفتی مظہر کریم نے میجر جان ہاٹن بہادر کمشنر جزائر دریائے شور کی فرمائش پر مراصد الاطلاع کا ترجمہ کیا۔ سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی نے ۵ اشعار میں تاریخ لکھی۔ آخری شعر یہ ہے۔

منیر اسکی کہی تاریخ یوں سالِ مسیحی میں
یہی سیر جدید بوستانِ ہفت کشور ہے[۲]

علامہ نے بھی کئی مفید تصانیف لکھیں۔ انھیں میں سے رسالہ الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند ہیں۔ یہ رسالہ اور قصائد جہاں تاریخی ہیں۔ عربی ادبیت کے بھی شاہکار ہیں۔ علامہ کا کمال یہ ہے کہ اشعار اور جملوں میں ایک مادّہ کے مختلف صیغے متعدد معنوں میں بے تکلف استعمال کرتے چلے جاتے ہیں نظم و نثر دونوں اصناف میں اس کا ظہور برابر نظر آتا ہے۔ مثال کے لئے حسب ذیل عبارت واشعار کافی ہیں۔ یہ رسالہ مع قصائد علامہ نے مفتی عنایت احمد کاکوروی کے ذریعہ ۱۲۷۵ھ میں خلف الصدق مولانا عبدالحق کے پاس بھیجا تھا کہ اتن میاں کو جاکر یہ تحفہ دیدینا۔ پنسل اور کوئلہ سے لکھے ہوئے

---

[۱] استاذ العلما مولفہ نواب صدر یار جنگ بہادر [۲] کلیات منیر شکوہ آبادی۔

ہاں حال صاحب! آپ جو کلکتہ پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھکو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی، وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے گذارہ کس طرح ہوتا ہے؟[1]

علامہ جزیرۂ انڈماں پہنچے مفتی عنایت احمد کاکوروی صدر امین بریلی و کول، مفتی مظہر کریم دریابادی، اور دوسرے مجاہد علماء وہاں پہلے پہنچ چکے تھے۔ ان علماء کی برکت سے یہ بدنام جزیرہ، دارالعلوم بن گیا۔ ان حضرات نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی قایم رکھا۔ جزائی آب و ہوا انکا لیف شاقہ اور رودعائی اعزا و اقرا کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے۔ مفتی صاحب نے علم الصیغہ جیسی صرف کی معتد کتاب جو آج تک داخل نصاب ہے وہیں لکھی۔ سرکاری ڈاکٹر حکیم امیر خاں کی فرمائش سے تواریخ حبیب الٰہ کی تالیف ۱۲۷۵ھ کی (یہی تاریخی نام بھی ہے)

ان دونوں کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے سینے علم کے سفینے بن گئے تھے۔ تاریخی یادداشت، ترتیب واقعات، قواعد و اصول، ضوابط علوم سبھی حیرت انگیز کرشمے دکھا رہے ہیں۔ ایک انگریز کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کیا جو دو برس میں ختم ہوا اور وہی رہائی کا سبب بنا۔

---

[1] اردوئے معلیٰ۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

بلند ہمتی کی سعادت ہر شخص کے حصے میں نہیں آیا کرتی۔
نہ ہر درخت تحمل کند جفائے خزاں
غلامِ ہمتِ سروم کہ ایں قدم دارد

آخر ش جزیرۂ انڈمان روانہ کر دیئے گئے۔ ادھر مولانا عبدالحق اور مولوی شمس الحق نے علامہ کے قریبی عزیز خان بہادر مفتی انعام اللہ خاں شہابی گوپاموی کے دادا خواجہ غلام غوث خاں بہادر ذوالقدر میر منشی لفٹیننٹ مغربی وشمالی کی معاونت سے اپیل دائر کر دی۔

مرزا غالب، یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔

"مولانا (فضل حق) کا حال کچھ تم سے مجھکو معلوم ہوا، کچھ مجھ سے تم معلوم کرو، مرافعہ حکم دوام حبس بحال رہا بلکہ تاکید کی گئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہونا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔
انا للہ وانا الیہ راجعون!"

میاں داد خاں سیاح، سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے تو مرزا غالب نے انھیں لکھا۔

شیر کی یک روزہ زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔

علامہ کے اقرار و توثیق کے بعد گنجایش ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔ ہیجدہ سی کے ساتھ "عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا۔ آپ نے کمالِ مسرت اور خندہ پیشانی سے سنا۔ خط مذکور میں اس کا ذکر اس طرح ہے۔

مرادِ من تا دہ عشرہ بسبب عدم ہمسری حال ایں بعاد افتادہ ماند عالیہ آدمی خاص مقرر کردہ فرستادہ می شد کہ جواب سائل یابد و حال پُر ملال جناب مولوی (فضل حق) صاحب از لکھنؤ دریں عرصہ نوشتہ آمد لائق گریستن و داویلا کردن است یعنی حبس دوام از پیشگاہ حکم صادر یافت واویلا واحسرتا۔ او تعالیٰ رحم فرماید[1]

محررہ ستم فروری مطابق ۱۷ رجب ۱۲۷۹ھ

علامہ کے استاد بھائی اور رفیق خاص مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور دہلی نے بھی علامہ کی خاطر سے فتوے پر "شہدت بالجبر" لکھ کر دستخط کر دیئے تھے۔ گرفتاری کے بعد مفتی صاحب نے بتایا کہ میں نے تو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ جبراً دستخط کرائے جا رہے ہیں۔ بالجبر پر نقطے نہ لگائے تھے علماء وقت نے اسے "بالخیر" پڑھا اور مفتی صاحب نے "بالجبر" بتا کر جان چھڑائی۔ البتہ جائداد و املاک کا کافی حصہ ضبط کر لیا گیا۔

---

[1] سیر العلماء

بیان کی تصدیق و توثیق کی۔ فرمایا۔

"پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔

اب عدالت میں میری صورت دیکھکر مرعوب ہوگیا اور جھوٹ بولا۔

وہ فتویٰ صحیح ہے میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے

ہے"

جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مجہر نے عدالت کا رُخ اور علامہ کی بارعب و پُر وقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسن صورت اور پاکیزگی سیرت سے بے انتہا متاثر ہو چکا تھا مگر علامہ کی شانِ استقلال کے قربان جائیے۔

خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے۔

"وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے۔ اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

شیر میسور سلطان ٹیپو کے رزمگاہ شہادت کا یہ آخری فقرہ کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے سرکاری وکیل لاجواب تھے چنانچہ پیروکار مقدمہ منشی کرم احمد حیدرآبادی نے لکھنؤ سے سید اعظم علی کے نام حیدرآباد یہ خط لکھا۔

"مدت یک دو روز است کہ جناب مخدوم والا احوال حسب تقدیر مبتلائے حس شدہ ارسیاپور یہ لکھنؤ برائے روبکاری صفائی روانہ کردہ شدہ اند رہائی آیندہ ہرگاہی ہم از تحریرات آنجا ہر بودہ منکشف میشود کہ امروز فردا بفضلہ تعالیٰ رہائی خواہد شد روز ماہر ادائے شہادت صفائی، مولوی صاحب مکرم مولوی نبی بخش صاحب مسعق مولوی قادر بخش صاحب و برخوردار مولوی سید صاحب حسین، بموجب درخواست مولوی عبدالحق (خلف علامہ) بمعیت ایشاں روانہ لکھنؤ شدہ اند۔ و سنگیاں را امید از جلائے کریم است دیگر روز بالضرور مخلصی یافتہ، وارد دولتخانہ خواہد شد، او تعالیٰ ہم چنیں کند ہمہ بار خورد و کلاں د ذکور و انات چشم براہ انتظار کشادہ مساعد، درع دخلقے عظیم دارند ایزد حق دعائے جمع کساں رقم خود فرماید۔"

دوسرا دن آخری دن تھا مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لئے تھے ایک ایک کر کے سب رد کر دیئے جس محضر پر فتوے کی جرح کی تھی اسکے

اکابر کو بڑی دشواریوں کے بعد نجات مل سکی پنشنوں اور جاگیروں پر زد پھر بھی باقی رہی۔

سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی، مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریابادی وغیرہم کو بجرمِ بغاوت کالے پانی کی سزا ہوئی۔

علامہ فضل حق کو بھی "باغی" قرار دیا گیا۔ اسیر فرنگ ہو کر بند ہوئے۔ ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۹ء میں لکھنؤ میں مقدمہ چلا۔ علامہ کے ثبات استقلال صداقت، حقانیت اور بلند ہمتی و شیر دلی کے لئے سیر العلماء کی یہ عبارت کافی ہے۔

"۱۸۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری، یا فتوے جہاد کی پاداش، یا جرمِ بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا مولانا موصوف کے فیصلے کے لئے جیوری بیٹھی، ایک اسیسر نے واقفاتِ اُنکو بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا، سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے۔ بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قایم کئے اور پھر خود ہی مثل تارِ عنکبوت عقلی و قانونی ادلہ سے توڑ دیئے۔ جج یہ رنگ دیکھکر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا۔ وہ مولانا کی عظمت و تجربے سے بھی واقف تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔ کرے تو کیا کرے

۱۱۔ مرزا معین الدین خاں
تھانیدار پہاڑ گنج
۱۲۔ محمد حسین خاں تھانیدار بدپور
۱۳۔ لالہ رامجی داس گڑوالے
۱۴۔ ضیاء الدولہ خلف حکیم رکن الدولہ
۱۵۔ موسیٰ خاں بن حافظ عبدالرحمٰن
خاں مختار مرزا ایلی۔
۱۶ عبدالصمد خاں خسر نواب جھجر
۱۷ حکیم امام الدین خاں بن حکیم
غلام رضا خاں

۱۸۔ نواب حسن علی خاں برادر نواب جھجر
۱۹۔ سعادت علی خاں خلف حسن علی خاں
۲۰۔ میر نواب نائب کپتان
۲۱ نواب عبدالرحمٰن خاں
۲۲ نواب علی محمد خاں عم
والی جھجر
۲۳ راجہ اجیت سنگھ عم راجہ نریندر سنگھ
رئیس پٹیالہ
۲۴ غلام محی الدین خاں
تحصیلدار کوٹ قاسم

ان کے علاوہ حیدر خاں اور اشرف خاں ہمراہ نے ایک سو سات نوابوں کو الور سے گرفتار کرا کے دہلی بھیجا آدھے گوڑگانوں میں قتل کر دیئے گئے باقی کو دہلی میں پھانسی دی گئی۔ اسی طرح کے بیسیوں حادثات ہیں کہاں تک بیان کئے جائیں

مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اور نواب مصطفیٰ حسن خاں شیفتہ وغیرہم بھی دھر لئے گئے ان

۸ - حکیم عبدالحق بن حکیم بخش	۱۴ - نظام الدین خاں بن حکیم شرف الدین خاں
۹ - قاضی فیض اللہ کشمیری سررشتہ دار صدر الصدور -	۱۵ - خلیفہ اسمٰعیل خلف استاد ذوق -
۱۰ - میر پنجہ کش مشہور خوشنویس	۱۶ - محمد علیخاں خلف نواب شیر جنگ خاں
۱۱ - مشہور شاعر مولوی امام بخش صہبائی	۱۷ - عبدالصمد خاں بن علی محمد خاں رسالدار شاہی فوج -
۱۲ - نواب احمد قلی خاں (جیل میں موت واقع ہوگئی)	۱۸ - دلدار علی خاں کپتان -
۱۳ - نواب محمد حسین خاں -	۱۹ - میاں حسن عسکری صوفی -
	۲۰ - غلام محمد خاں عم نواب احمد علی خاں رئیس فرخ نگر -

دہلی چھوڑ کر غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنیوالے

۱ - میاں غلام نظام الدین -	۶ - مرزا فاضل بیگ
۲ - نواب غلام محی الدین خاں پنشن دار	۷ - عبدالحلیم خاں نائب کوتوال - (مع ضبطی جائداد)
۳ - حکیم محمود خاں والد مسیح الملک حکیم اجمل خاں -	۸ - منشی آغا جان محرر ایجنٹی
۴ - حکیم مرتضیٰ خاں	۹ - صفدر سلطان بخشی -
۵ - نواب یعقوب علی خاں (گوجروں نے لوٹ کر قتل کر ڈالا)	۱۰ - نواب سید حامد علی خاں رئیس برست

سلطان نے اپنی طرف سے آزاد کر دیا امرار اور شہسواروں کی بہو بیٹیوں نے دریا دلی کہ ہمارے شوہر اور سرپرست یا تو مارے گئے یا قید و بند میں ہیں ہماری دستگیری کی جائے، سلطان نے ان کی آہ وزاری سے متاثر ہو کر قیدیوں کو رہا کیا، اور جو مارے گئے تھے ان کے پسماندگان کو حوالے سے اس قدر روپیہ دلایا کہ سب مفلس اور جو شق والس گئیں [1]

یہ تھا مسلمانوں کا انتقام! اور یہ تھی بدترین دشمنوں کے ساتھ رواداری "غیر متمدن" دنیا کے ان تاریخی حقائق کے بعد دور تہذیب و تمدن کے علمبردار، یورپ کے ان کرتوتوں پر کون انصاف پسند انسان شرم سے گردن نہ جھکا لے گا۔

علمار و امرار، خواص و عوام کی تباہی و بربادی کی داستان بڑی طویل ہے قابل ذکر کچھ نام درج کئے جاتے ہیں۔

"غدر ۱۸۵۷ء کے بعد پھانسی پانے والے یا گولیوں سے اڑائے جانے والے

۱ - نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجر (مع صلبی خاندان)
۲ - راجہ ناہر سنگھ رئیس بلب گڑھ
۳ - نواب مظفر الدولہ
۴ - نواب میر خاں جس دار جہانگیر آباد ریول
۵ - نواب اکبر خاں بن نجیب خاں [illegible]
۶ - احمد مرزا
۷ - میر محمد حسین

---

[1] اردو ترجمہ سلطان صلاح الدین ایوبی صفحہ ۲۲ تا ۲۵

تھے تو وہاں مردے پڑے اور جاں بہ لب زخمی لوٹتے تھے۔ جب کہ بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو ان صلیبیوں نے سخت اذیتیں دیکر مارا تھا اور زندہ آدمیوں کو جلایا تھا۔ جہاں قدس کی چھتوں اور برجوں پر جو مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے وہیں ان صلیبیوں نے اپنے تیروں سے چھید کر گرایا تھا"۔[1]

۹۰ برس کے بعد ۲۶ ستمبر ۱۱۸۷ء مطابق ۲۷ رجب ۵۸۳ھ کو سلطان نے فوج کشی کر کے اور شاہ رچرڈ وغیرہ سے لڑائیاں لڑ کر فلسطین پر علم اسلام لہرا دیا۔ مدتوں کی جنگ کے بعد اس عظیم الشان فتح پر اعلان عام کر دیا کہ دس اشرفی زرِ فدیہ دیکر ہر عیسائی اپنا ساز و سامان لے کر امن و امان کے ساتھ شہر چھوڑ سکتا ہے۔ چالیس دن کی مہلت بھی دی گئی۔

جو لوگ غریب تھے ان میں سے سات ہزار کو شاہِ انگلستان کی رقم سے فدیہ ادا کر کے رہا کرایا گیا۔ کوکبری نے شہر الرہا کے ایک ہزار آرمینیوں کو فدیہ دیکر آزاد کرایا۔ برادرِ سلطان ملک العادل نے شاہ رچرڈ کی دوستی کی بنا پر سلطان سے ایک ہزار غلام مانگ کر اپنی طرف سے آزاد کر دیئے۔ بطریق اعظم اور بلیان سفیر نے بھی جرأت کر کے سلطان سے ملک العادل کے برابر غلام مانگے جو اجازت ملنے پر آزاد کر دیئے گئے۔ باقیماندہ عیسائیوں کو

---

[1] اردو ترجمہ سلطان صلاح الدین ایوبی صفحہ ۳۰۲۔ مصنفہ انگریز مورخ سٹینلے لین پول)

تھا گردن میں چادر کا پھندا ڈال کر کھینچا تھا، قتل کے منصوبے باندھے تھے،
اور سب سے آخر یہ کہ وطن سے نکال کر کے گھر اور در سے دربدر کیا تھا اس
شاہ دوجہاں نے فتح کے بعد اعلان کیا جو ہتھیار رکھ دے اسے امان، جو
معابد میں مشغول عبادت ہو وہ محفوظ، جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے
وہ مامون، سب دشمنوں کا سامنا ہوتا ہے دریافت فرماتے ہیں مجھ سے
کیا توقع رکھتے ہو!

یک زبان ہو کر کہتے ہیں شریف بھائی اور شریف بھتیجے سے جو توقع
ہو سکتی ہے وہی ہم بھی رکھتے ہیں۔

جواب ملتا ہے جاؤ تم سب آزاد ہو۔

کئی سو سال کے بعد اسی قسم کا واقعہ اس شاہ دوسرا کے ادنیٰ غلام
سلطان صلاح الدین ایوبی کو بیت المقدس میں پیش آتا ہے۔ اس خطۂ پاک
فلسطین پر خلیفۂ دوم حضرت امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ
نے خود بنفس نفیس صلح و آشتی کے ساتھ قبضہ فرمایا تھا۔ اس وقت سے
تقریباً ساڑھے چار سو سال تک پرچم اسلام لہراتا رہا۔ ۱۰۹۹ء عیسوی میں
عیسائیوں نے اس پر تسلط قائم کر لیا مگر کس شان سے ایک انگریز
مورخ ہی کے قلم کے رشحات دیکھئے۔

”جب گوڈفرے اور ٹنکرڈ، یروشلم کے کوچہ و بازار میں گھسے

سکھ رجمنٹ سے علی رؤس الاشہاد اعلام کرانا، فتحپوری مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کا لٹکانا، مساجد کی بے حرمتی خصوصاً شاہجہانی جامع مسجد دہلی کے حجروں میں گھوڑوں کا باندھنا عبادت کی جگہ دفاتر قایم کرنا اور حوض میں وضو کے پانی کی جگہ گھوڑوں کی لید ڈالنا، ناقابل معافی اور غیر ممکن التلافی جرم ہے۔
منصف مزاج انگریز بھی اس کی مذمت کئے بغیر نہ رہ سکے تفصیل کے لئے دیکھئے "انقلاب ۵۷ء کا دوسرا رخ" مرتبہ شیخ حسام الدین بی۔اے امرتسری سابق صدر مجلس احرار اسلام ہند۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ مسلمان قوم کو بھی فتح وظفر کے ایسے مواقع پیش آئے ہیں لیکن ان کا دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک رہا۔ اپنوں کا نہیں غیروں کا بیان سنئے، دوستوں کی نہیں دشمنوں کی تحریریں دیکھئے۔

کون نہیں جانتا کہ چودہ سو سال قبل ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا تو خدا کے آخری برگزیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دشمنوں کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار فرمایا جنھوں نے ذلت ورسوائی اور مصائب و آلام پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ تالیاں بجائی تھیں، پتھر مارے تھے، ڈھول اڑائی تھی، آوازے کسے تھے، سڑی، سودائی، مجنوں اور دیوانہ خطابات دیئے تھے۔ راستے میں کانٹے بچھائے تھے، پشت پر اونٹ کا اوجھ لادا

مذہبی جوش اور ملکی جذبے میں محض سکرانیں جہالت وحماقت سے کچھ لوگ بھیں، بچوں اور عورتوں کو قتل کر ڈالا تھا تو یہ کوئی نئی خبر نہ تھی۔ عوام جوش میں آکر ہمیشہ اسی قسم کی حرکتیں کرتے رہے ہیں۔

ابھی ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی جانب سے ڈائرکٹ ایکشن (براہ راست اقدام) کا دن منانے پر کلکتہ میں کیا کچھ ہوا، مسلم لیگی وزارت کے ہوتے ہوئے ہزارہا ہندو مسلمان باہمی جنگ وجدال کی نذر ہوگئے۔ سیکڑوں عورتیں اور بچے سڑکوں پر اعضا بریدہ پڑے ملے، وحشت و بربریت، درندگی وشیطنت کا وہ کونسا مظاہرہ تھا جو نہ کیا گیا۔ ایک ہفتہ تک غدر مچا رہا، مقتولین ومجروحین کی تعداد چوتھائی لاکھ سے متجاوز ہوگئی یہی "مہذب" ملکوں میں بھی ایسے ہنگامی مواقع پر ہوتا رہتا ہے[1] ۱۸۵۷ء میں انگریز جیسی دعویدار تمدن وتہذیب قوم نے یہ خطرناک اور انسانیت سوز حرکات جوش میں نہیں، ہوش میں کیں، غلامی کی لعنت سے متاثر ہوکر نہیں، فاتح وقابض ہونے کے بعد کیں، جہالت وحماقت سے نہیں، بزعم خود دانشمندی وفرزانگی کے ماتحت کیں، غفلت ونادانستگی سے نہیں بلکہ قصداً اور دانستہ کیں، خصوصیت سے مسلمانوں کے ساتھ جو ذلت آمیز اور جگر خراش برتاؤ کیا وہ بیان سے باہر ہے۔

سیدہ مسلمانوں کو سؤر کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤ میں ڈلوانا،

[1] کلکتہ کے بعد نواکھالی (بنگال)، گڑھ مکتیسر (یوپی) اور پٹنہ صوبہ (بہار) میں جو کچھ ہوا اس بربریت ودرندگی کی مثال نہیں مل سکتی، اور ۱۸۵۷ء کا یہ خونی ڈرامہ تاریخ ہندوستان میں اپنی نظیر پیش نہیں کرسکتا۔

گدڑی تھی[1] مگر ایسے مطالع!
لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر، نہ آنکھوں نے دیکھے، نہ کانوں نے سنے، نہ انسان کے دل میں کبھی ان کا خطرہ بھی گذرا۔ الامان والحفیظ!

---

[1] دہلی اصل میں دہلو ہے حضرت امیر خسرو نے ایک شعر میں جلال الدین فیروز شاہ کو شکارگاہ میں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

پاکہ اسپ بخت پا ما خود بعزما دستگیر — یا عزمان وہ کہ گردوں سیم و زر دہلو دوم

سب سے پہلے اس شہر کو راجہ یدھشٹر نے ۱۴۰۵ ق م آباد کیا اور اندرپت کے نام سے شہرت دی اب اس کے آثار بھی مفقود ہو چکے ہیں جہاں شہر تھا اب کاشت ہوتی ہے ۳۲۵ ق م راجہ تومر دلہو نامی نے ازسرنو شہر آباد کر کے اپنے نام سے مشہور کیا ۱۰۵۲ء میں راجہ اننگپال تومر نے قلعہ تعمیر کرایا جو دہلی سے پاس ہے پرانا قلعہ کے نام سے مشہور ہے (ہمایوں بادشاہ نے ۹۴۳ھ میں اس کی مرمت کر کے شہر دین پناہ نام رکھا اور شیر شاہ نے اپنے زمانے میں اس کی ترمیم کر کے شیرگڑھ نام رکھ دیا) راجہ رائے پتھورا نے ۱۱۴۳ء میں بارہ دروازہ کا قلعہ بنایا ایک دروازہ کا نام دروازہ غزنی تھا قطب الدین ایبک نے ۶۰۲ھ میں اس قلعہ میں قصر سپید اور غیاث الدین بلبن نے ۶۶۶ھ میں لال محل بنوایا اسی بادشاہ نے ایک قلعہ بنایا جس کا نام غیاث پور رکھا جہاں آج کل سلطان المشائخ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی آسودہ خواب ہیں سلطان معز الدین کیقباد نے ۶۸۶ھ میں کیلو کھری (جسے قصر معزی بھی کہتے تھے اور اس جگہ مقبرہ ہمایوں ہے) کی بنیاد ڈالی جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے ۶۸۹ھ میں لال محل اور اس میں سر مکان بنوایا جسے نیا شہر کہا جانے لگا علاء الدین خلجی نے ۷۰۳ھ میں دہلی علائی، قلعہ علائی کوشک سیری اور قصر ہزار ستون بنوایا۔ غیاث الدین تغلق شاہ نے ۷۲۵ھ میں تغلق آباد آباد کیا اور محمد عادل تغلق نے (باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۰)

دیکھنا پڑا اور یہ سب لوگ نیپال چلے گئے۔ دلاور جنگ کو راجہ پوائیں بلد یو سنگھ نے دعوت کے بہانے سے بلا کر دھوکہ سے ۱۵ ر جون ۱۸۵۸ء مطابق ۲ ر ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ کو شہید کر دیا۔ دریا پار محلہ جہان آباد متصل احمد پورہ مسجد کے پہلو میں سپرد فن ہوا۔ علامہ دہلی سے ۲۴ ر ستمبر کو روانہ ہو گئے تھے[1] جس طرح ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور ۱۷۹۹ء کی جنگ میسور کی طرح ۱۸۵۷ء کی یہ جنگِ آزادی بھی ہندستانیوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح پر ختم ہوئی۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

۱۹ ر ستمبر کے بعد ہندستانیوں پر جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹے اسکی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملیگی۔ یوں تو دہلی نے بہت سے ہنگامے دیکھے تھے، نادر شاہ درانی کا ایام عید الاضحیٰ میں قربانی کے جانوروں کی جگہ انسانوں کا ذبح عام اور شہر کی نالیوں میں پانی کے بجائے خون کی روانی دیکھی تھی۔ "ہر کہ آمد عمارت نو ساخت" کے مطابق شہر کا اجڑنا اور دوسری جگہ آباد ہونا، دار السلطنت پر حملہ آوری، اور "اِنَّ المُلُوکَ اِذَا دَخَلُوا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَا اَذِلَّۃً" کے بموجب شرفا کی ذلت و خواری بھی نظر

[1] علامہ نے رسالہ ثورۃ الہندیہ میں لکھا ہے کہ انگریزوں کے قبضے کے بعد پانچ یوم تک بھوکے پیاسے مکان کے اندر بند رہے، پانچویں روز اہل و عیال اور ضروری سامان لیکر شب میں چھپکر نکلے، دریا عبور کئے، میدان قطع کئے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ علامہ مع متعلقین بھیکن پور ضلع علیگڈھ آکر ۱۸ روز رہے، صاحبزادہ مولانا عبد الحق بھی ساتھ تھے۔ ۱۸ یوم کے بعد موصوف کے عم محترم نواب عبد الشکور خاں رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے ۸ میل ہے اور موصوف اور انکے عزیزوں کی علمداری میں واقع تھا اور اب بھی ہے اپنے انتظام سے بدایوں اور بریلی کی طرف اتروایا تھا، نواب صدر یار جنگ بہادر نے مجھے وہ کمرہ بھی بتایا جس میں علامہ فروکش ہوئے تھے، بھیکن پور کی گڑھی میں برج پر جانب شرق واقع ہے اب مسٹر عبد الصبور خاں شروانی بی اے علیگ کے تصرف میں ہے۔ نواب صدر یار جنگ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے، علامہ کے ورود اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے ۹ سال بعد بچپن میں والد ماجد اور عم محترم سے یہ واقعات سنے۔ اور حضرت خداداد کی بنا پر ۴۵ انھیں یاد رکھا موصوف نے یہ بھی بیان کیا کہ والد ماجد (محمد تقی خاں) اور مولانا عبد الحق میں کافی تعلقات بھی ہو گئے جو بعد میں خط و کتابت کی شکل میں جاری رہے۔ موصوف ہی کی یہ بھی روایت ہے کہ علامہ صاحبزادہ کو سبق بھی پڑھاتے رہے۔

مرزا مغل کی وجہ سے فوج میں پھوٹ پڑگئی۔ جنرل بخت خاں سے لوگ
بگڑ گئے کمپنی کی فوج نے ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی پر حملہ کر دیا اور ۱۹ ستمبر
کو مکمل طور پر انگریز قابض ہوگئے۔

بادشاہ خواص دریاں میں قلعہ سے نکلکر مقبرۂ ہمایوں میں پناہ گزین ہو چکے
تھے مع متعلقین گرفتار کرکے قلعہ میں نظر بند کر دیے گئے تین شاہزادوں
کو قلعہ میں داخل ہوتے ہی گولی کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے سروں کو
خوان پوش سے ڈھک کر خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے بطور تحفہ
پیش کیا گیا انہیں میں مرزا مغل بھی تھے جنرل بخت خاں اپنی فوج اور
توپ خانہ کو نکال لے گئے بادشاہ سے کہا آپ بھی میرے ساتھ چلیں
مگر وہ رجب علی اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے تھے،
آمادہ نہ ہوئے۔ جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد
وغیرہم سب لکھنؤ چلے گئے۔

یہ سب لوگ لکھنؤ پہنچکر احمد اللہ شاہ دلاور جنگ کے جھنڈے کے نیچے
جمع ہوگئے خوب خوب معرکے رہے بالآخر شکست کھا کر شاہجہانپور وارد
ہوگئے محمدی پور میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی نانا صاحب پیشوا،
مولوی عظیم اللہ کاچودی، شہزادہ فیروز شاہ وغیرہم سب یہیں جمع ہوگئے
آخری جنگ انگریزوں سے شاہجہانپور میں ہوئی۔ یہاں بھی شکست کا مـ

اس روزنامچہ سے علامہ کی باخبری اور انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ موجودہ صورت حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔ بادشاہ سراسیمہ تھے شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ اور تخت شاہی کی تمناؤں نے باہمی رقابت کا میدان گرم کر رکھا تھا۔ عمائد شہر میں دو گروہ تھے، ایک بادشاہ کا ہمنوا اور دوسرا حکومت کمپنی کا بہی خواہ، فوجوں میں طمع اور لالچ نے گھر کر لیا تھا۔ دو ایک جماعتیں مقصد اعلیٰ کو سامنے رکھے ہوئے تھیں۔ ایک جماعت مجاہدین کی تھی۔ دوسری روہیلوں کی۔ یہ جنرل بخت خاں کی سرداری میں داد شجاعت دے رہی تھی۔ علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہونچے۔ مشورہ کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رامپوری نے دستخط کر دیئے۔ اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوّے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی[1]۔

جنرل بخت خاں کی آنکھوں میں مرزا مغل آڑے آتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ سے سرکار میں معافی کا خط بھی بھجوا دیا تھا۔ کوئی سنوائی نہ ہوئی

[1] تاریخ ذکاء اللہ۔

دہلی پہنچے۔ میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں کارتوسوں کا قصہ دور پکڑ چکا تھا۔ گائے اور سور کی چربی کی آمیزش کی خبر سے ہندو اور مسلمان فوجی بگڑ بیٹھے تھے۔ روٹی کی ٹکیا کی تقسیم کسی خاص اسکیم کے ماتحت گاؤں گاؤں پہلے سے ہو ہی چکی تھی۔

میرٹھ سے دہلی پر باغی فوج نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کر دیا قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا۔ بادشاہ دہلی سرگرمیوں کا مرکز رہے علامہ بھی شریک مشورہ رہے منشی جیون لال اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں۔

"۲۶ اگست ۱۸۵۷ء مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے۔ انھوں نے انگریزی مدبیں کی بابت صورت حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی

۲ ستمبر ۱۸۵۷ء بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوئے مرزا الٰہی بخش، مولوی فضل حق میر سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق آداب بجا لائے

۶ ستمبر ۱۸۵۷ء مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے

۷ ستمبر ۱۸۵۷ء بادشاہ دربار خاص میں رہے۔ حکیم عبدالحق میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق معین الدین خاں، اور دیگر تمام امراء و درباری شریک دربار رہے[1]

---

[1] غدر کی صبح و شام روزنامچہ منشی جیون لال صفحہ ۲۱، ۲۴، ۲۴۶، ۲۴۷

ہوئے۔ راہ میں زمینداروں کو تلقین کرتے ہوئے چلے۔ اس سے قبل مولوی احمد اللہ شاہ دلاور جنگ مدراسی سے سرگوشیاں ہو چکی تھیں، دلاور جنگ فیض آباد چلے گئے تھے۔ اور ہنگامہ ہوتے ہی لکھنؤ پر آکر قابض ہو گئے۔

شاہِ اودھ کی معزولی، بادشاہِ دہلی کی نام نہاد خطابات سے منصوبہ محرومی اور مذہب عیسوی کی بہ جبر نشر و اشاعت نے فرنگیوں کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا۔

کارتوسوں کی چربی سے دل کا غبار، آتش فشاں بنکر پھوٹ پڑا۔ اس نے بارود پر فلیتہ کا کام دیا۔ لکھنؤ میں ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵ جولائی ۱۸۵۷ء بروز یکشنبہ مرزا رمضان علی عرف برجیس قدر بن واجد علی شاہ کو حضرت محل کی منظوری سے ممو خاں کی سرکردگی میں فوجی سالاروں نے باقاعدہ تخت نشین کر دیا[1]۔ احمد اللہ شاہ (مدراسی دلاور جنگ) پہلے قابض ہو کر شہر کا بندوبست کر چکے تھے۔ اب تلنگے جا بجا متعین ہوئے۔ شاہ جی سخت سست کہکر چپ ہو گئے۔ بیلی گارد پر انگریزوں سے چھ روز تک لڑائی ہوتی رہی۔ ۱۰ جولائی کی شام کو جمعہ کے دن پسپا ہو کر ہٹ آئے[2]۔

علامہ انور سے نشر و اشاعت کرتے ہوئے اگست ۱۸۵۷ء میں

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۲۵ مصنفہ میر محمد زائر، [2] ایضاً صفحہ ۲۳۰

سر سید احمد خاں 'اسباب سرکشی ہندستان' میں لکھتے ہیں۔

"۱۸۵۵ء میں کلکتہ سے پادری صاحبان ای ایڈمنڈ نے تمام سرکاری
ہندستانی عہدیداروں کے نام گشتی چٹھی بھیجی تھی کہ

مسٹر [illegible] میں تمام ہندستان میں ایک عملداری ہو گئی ہے،
تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی ریلوے سڑک سے سب
جگہ کی آمد و رفت ایک ہو گئی۔ مذہب بھی ایک چاہیے اس لئے
مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔"

علامہ کا بچپن، جوانی، اور کہولت دہلی میں گذرے آخر میں لکھنؤ پہنچے
یہاں کی حالت دہلی سے بھی بدتر پائی، بادشاہ دہلی اور والی اودھ برائے
نام حکمراں تھے آخر الذکر کی تو لٹیا ہی ڈوبی تھی مسجد ہنومان گڑھی شہید
ہوئی مسلمان مجاہدین کفار کے ہاتھوں خاک و خون میں لتھڑے، امیر علی شاہ
توپ دم ہوئے مجاہدین سرکاری فوج کے ہاتھوں کٹتے ہوئے ناموس اسلام کی بے عزتی
اور اسلامی شعائر کی بربادی پر بھی واجد علی شاہ کو عیش و عشرت کی پڑی
تھی علامہ صدر الصدور تھے ان واقعات سے متاثر ہو کر لکھنؤ چھوڑ کر
۱۸۵۶ء میں الور چلے گئے مگر دل نہ لگا میں رہا کہ اس میں کچھ صورت اچھی
نظر آئی دربار دہلی سے راجاؤں کے نام خطوط بھی روانہ ہوئے علامہ
نے راجہ الور سے بھی گفتگوئیں کیں وہ رام نہ ہوا۔ وہاں سے چل کھڑے

علامہ نے حادثۂ بالاکوٹ، اور واقعۂ ہنومان گڑھی، دیدۂ عبرت سے دیکھا۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی بے بسی اور واجد علی شاہ اختر والیٔ اودھ کی معزولی و بے کسی کی علت پر نظر جائی۔ دہلی اور لکھنؤ کے ان حالات سے ایک حق آگاہ وحساس انسان کو اثر پذیر ہونا ہی چاہئے تھا۔

دوسری طرف عمال حکومت ہندستانی تہذیب و کلچر اور ہندستانیوں کے مذہب کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ تبلیغ عیسویت کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ عیسائی مشنریاں، مدارس، ہسپتال، اور دوسرے پبلک اداروں سے مذہبی اشاعت اپنا فرض منصبی سمجھ رہی تھیں۔ ان کی دریدہ دہنی کا شکار مقامی مذاہب بن رہے تھے۔ مذہب اسلام پر خصوصیت سے نظر توجہ تھی۔ پادری فنڈر اور مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی وغیرہم کے مناظروں سے ہل چل مچی ہوئی تھی۔ عوام کو خیال ہونے لگا تھا کہ حکومت تو گئی ہے اب مذہب پر بھی ہاتھ صاف کیا جارہا ہے۔ ہندستانیوں کی اصل متاع مذہب ہی ہے یہ تمام نقصان اور مصیبتیں برداشت کرسکتا ہے لیکن مذہب پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ صحیح مذہبی حمایت تو علیحدہ رہی غلط جوش مذہبی پر بھی جان دیدیتا ہے۔ چنانچہ آج بھی اس کی ہزاروں مثالیں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔

میں تو یہ ہیں۔

علت کی ہستی سے آہ مر جا اچھا　　اعمال مصر سے یکھ نہ کرنا اچھا

اگر سنتا ہے اہل میر سے یہی　　"میا" ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہر صدی میں محدِّدِ غداری پیدا ہوئے ہیں۔
اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں میر جعفر و میر صادق نمودار ہوئے۔
انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں میر علی نقی اور اس بیسویں صدی
میں میر معروف "محدد اعظم" ملوہ گر ہیں دیکھئے مسلمانوں کا وجود بھی ہندستان
میں باقی رہتا ہے یا نہیں مسلمانوں کی رہی سہی عزت تو درارتی مس کے
۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کے اس اعلان کے بعد ختم ہی ہوگئی کر دس کروڑ تعداد کی یہ
بد نصیب قوم ۳ کروڑ کی اکثریت سے اس قدر خائف ہے کہ اگر برٹش
حکومت اس کی حالت کی ذمہ داری نہ لے تو اس کا وجود فنا ہو جائیگا۔
حالانکہ اسی ملک میں صرف ۴ لاکھ سکھ اور چند لاکھ عیسائی اور پارسی
اپنے آپ کو محفوظ بھی سمجھتے ہوں اور کسی قسم کی کوئی حالت نہ چاہتے
ہوں تو یہ رسوائی و ذلت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ خصوصاً جبکہ اس قوم کا ماضی
اس قدر شاندار ہو کہ اسی ملک پر ایک ہزار سال تک حکومت بھی کی
ہو اور ساری دنیا پر اپنے دبدبہ اور ہیبت کی دھاک بھی بٹھا چکی ہو
حالانکہ اس وقت ہزاروں اور لاکھوں سے تعداد متجاوز نہ تھی۔

دائمی پٹہ انگریزوں کو لکھدیا۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن

خدا جانے میر علی نقی کو حکیم مشرق اقبال مرحوم اس موقعہ پر کیوں بھول گئے مسلمان مدت ہوئی سلطنت و حکومت سے محروم ہو چکے تھے ان کا وجود "نامسعود" ہندستان میں ضرور باقی رہ گیا تھا۔ اس کا بھی خدا حافظ ہے کیونکہ پھر اسی قوم کے ایک "میر" کے ہاتھ میں مسلمانوں کے گلے کی رسی پڑ گئی ہے تین "میروں" کا تجربہ ہو چکا۔ اب چوتھے کی باری ہے۔ بد قسمتی سے تینوں "میروں" نے مسلمانوں سے غداری کرکے انگریزوں سے وفاداری برتی۔ یہی مرحلہ اب بھی درپیش ہے۔ اس وقت انگریزوں کو مسلط کیا گیا تھا اور اب مختلف ترکیبوں سے مسلط رکھا جا رہا ہے۔

قومی وزارتوں کے ۱۹۳۹ء میں جنگی مسائل کی بنا پر ہٹنے اور دفعہ ۹۲ کے ماتحت صوبوں پر خالص گورنری (انگریزی) راج ہونے پر خوشی کا "یوم نجات" اور ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی قومی گورنمنٹ بننے پر غم کا "یوم ماتم" منایا جانا اس کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

کاش خدا مسلمانوں کو سابق تجربات کی بنا پر فہم و فراست عطا کرے کہ مشرقی تین "میروں" سے اگر نہ بچ سکے تھے تو اس مغربی "میر" کے جال

لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون ۵۔
سلطنت اودھ کی بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ نواب امیر علی نقی وزیر اعظم سلطنت اودھ خسر بادشاہ کا تھا میر جعفر اور میر صادق کی طرح انگریزوں سے ساز باز کر کے مسلمانوں کی حکومت کو تباہ کرنے کی مسلسل سازش جاری رکھی۔ یہ امین الدولہ کی معزولی کے بعد ۱۹ رجب ۱۲۶۳ھ مطابق ۹ جولائی ۱۸۴۷ء کو وزیر اعظم بنایا گیا تھا۔ اس کی اندرونی سازش ہی کی بنا پر واجد علی شاہ کو یہ روز بد دیکھنا پڑا ریزیڈنٹ نے بلا کر اس سے کہا کہ بادشاہ سے عہد نامہ پر دستخط کرا دئیے تو قصبہ محمد نگر نسلاً بعد نسل تمہارے حوالہ کر دیا جائے گا اس کے علاوہ انعام واکرام کے علیحدہ مستحق ہو گے ورنہ سرکاری مجرم قرار دیئے جاؤ گے[1] وزیر نا تدبیر نے لاکھوں جتن کئے لیکن بادشاہ اپنی ضد پر اڑے رہے اس طرح دونوں طرف سے منہ کالا ہوا یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان کی اسلامی سلطنتوں کی تباہی انہیں میروں کی بدولت ہوئی ہے جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء کے بعد میر جعفر نے شاہ عالم کے ساتھ یہی ڈرامہ کھیلا تھا اور اس طرح صوبہ بنگال ہاتھ سے نکلا دکن میں میر صادق نے ۱۷۹۹ء میں شیر میسور سلطان ٹیپو کو دغا دیکر شہید کرایا اور ہندوستان کی غلامی کا

[1] تاریخ اودھ حصہ پنجم صفحہ ۲۰۴

حادثۂ شہادت سے تین ماہ کے اندر ہی "ان بطش ربک لشدید" کا منظر سامنے آگیا۔ دیوانِ حافظ سے فال نکالی گئی تو یہ شعر نکلا۔

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

یہ بھی روایت ہے کہ جس دن واقعۂ شہادت ہوا ہے اسی دن پارلیمنٹ لندن میں شاہِ اودھ کی معزولی کے فرمان پر دستخط ہوئے تھے سچ ہی خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اس طرح والیانِ اودھ کی مدت وزارت ۱۴۳ سال ۳ ماہ ۲۴ دن اور مدتِ بادشاہت ۴۱ سال رہی۔ اور اپنے پیچھے ہزاروں عیش پرستیوں کی داستانیں چھوڑ گئی۔

سید کمال الدین حیدر حسینی عرف میرزا ئر نے قیصر التواریخ جلد دوم میں چشم دید راویوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کئی دن تک شہدا کے لاشے یونہیں پڑے رہے لیکن نہ پرندوں نے ان کو چھوا نہ درندوں نے۔ بخلاف اس کے دوسرے مقتولین کے جسموں کو جانوروں نے کھا لیا تھا۔ گنے کے کھیت کو وہاں کے زمیندار نے دو ماہ کے بعد کٹوایا تو ایک مجاہد تمام ہتھیار لگائے بندوق ہاتھ میں لئے بیٹھا نظر آیا قریب جا کر دیکھا تو گولی سے جاں بحق ہو چکا تھا۔ اس کے دیکھنے کے لئے میلہ لگ گیا۔ بعد میں انہیں دفن کر دیا گیا۔ اس دو ماہ میں جسم ذرا بھی خراب نہ ہوا تھا۔ ولا تقولوا

آسماں رحق لود گرحوں سار د بر زمیں

آسماں بھرا اٹھا زمیں کو زلزلہ آگیا خدا کا قہر لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل مہد کی شکل میں نمودار ہوا۔

دوشنبہ ۴ فروری ۱۸۵۶ء کو جنرل اوٹرم ریزیڈنٹ، کپتان ہیز اور جنرل ویلا کماں افسر فوج، گورنر جنرل کا عہد نامہ لے کر بادشاہ اودھ واجد علی شاہ اختر کے پاس آئے اور معزولی کا حکم سنا کر عہد نامہ پر دستخط کرنے کا حکم دیا۔ اس عہد نامہ میں سلطنت اودھ سونپی سرکار کمپنی کے حوالہ کر دینے کا ذکر تھا بادشاہ نے دستخط کرنے سے انکار کرتے ہوئے ہراول مت سماحت کی ایک نہ سنی گئی۔ لندن تک کوششیں کیں سلسلے سود تاحت ہوئیں۔ کلکتہ لیجا کر مٹیا برج میں نظر بند کر دیا گیا" لکھیو بدر اوبیلا" تاریخ نکالی گئی۔ رائے پورن چند عاجز نے ۲۹ اشعار قطعۂ تاریخ کے لکھے۔ آخری دو شعر یہ ہیں۔

دل عاجز از شورش ناگہاں	رفرط الم بود عوغا کناں
چواز دست شد رفت تاج و کلاہ	نگفتم شدہ منتزع ملک شاہ

پانچ اشعار میں تاریخ عیسوی لکھی۔

رقم نمود عاجز عیسوی سال	سعادت رفتہ از عمر سعادت[1]

۱۸ ۵۲ ۶

[1] تاریخ اودھ حصہ پنجم صفحہ ۲۲۴

بذکرِ حق سراپا گوش دارم — مئے حبِّ علی در جوش دارم
شدہ تاریخ او قبلِ شہادت — سر میداں کفن بردوش دارم[1]

رسولی کے ایک مجذوب نے "واند علیٰ ذالِک لشھیدا" سے تاریخ نکالی۔ ۱۲۷۲ھ

مولوی امام بخش صہبائی شہید نے ۱۸ اشعار میں تاریخ لکھی، آخری شعر یہ ہیں۔

چوں ز قتل سید مسکیں کہ خلدش باد جائے — شد لکد کوب مطاعن اعتبارِ لکھنؤ
از پئے نفرین و ہاتف از روئے درد دل — گفتہ با دافتنہ منقرض بادیارِ لکھنؤ[2]
آنچہ در ادنی اشرار کلک صہبائی فگند — تا ابد مثلش نیابی در دیارِ لکھنؤ

کپتان بارلو اور مرزا شیخ حسین علی کیمدان بٹالین گلابی کی فوجوں نے مقابلہ کیا۔ فوج سلطانی کے ۱۲۵ آدمی مقتول و مجروح ہوئے۔ یہ مرزا حسین علی شاہ صاحب کے سالے تھے۔ ایک صاحب نے تاریخ کہی۔

گفت از روئے ہمت ازلی — "قتل شد مولوی امیر علی" ۱۲۷۲

دوسری تاریخ یوں نکالی۔

"سر بجا و تنش بجائے دگر"[3] ۱۲۷۲ھ

"اسلامی" حکومت میں خالص اسلامی مسئلہ پر مسلمانوں کی اس بیدردی سے خوں ریزی!

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۸۔ [2] تاریخ اودھ حصہ پنجم صفحہ ۲۳۴ [3] ایضاً صفحہ

صدر مہتمم علامہ فضل حق بنائے گئے تھے حکام کے مظالم اور رعایا کی ابتری
کی ویسے ہی شکایت تھی۔ اس عزم جہاد اور شاہ صاحب کے اعلان نے مسلمانو
کے جوش و خروش نے ہوش و حواس گم کر دیئے شاہ صاحب کے سمجھانے
کے لئے علماء و امراء کو بھیجا علامہ نے بھی عہدے کی ذمہ داری اور سہولت
مطلب براری کی خاطر گفتگو میں حصہ لیا تحقیقات و انصاف کا وعدہ بھی کیا
لیکن شاہ صاحب نے ایفاء وعدہ بادشاہ پر بھروسہ کرتے ہوئے صاف
انکار کر دیا اور کئی ہزار کی جمعیت لے کر مہنتوں کی سرکوبی کے لئے نکل کھڑے
ہوئے ردولی جاتے ہوئے راہ میں ۲۶ صفر ۱۲۷۲ھ مطابق ۷ نومبر ۱۸۵۵ء
بروز چہار شنبہ نوابی فوج اور گوروں کی پلٹن نے گھیر کر بحالت نماز ظہر باجماعت ادا
کرنے میں توپ کے گولوں سے ۱۸-۱ افراد کو شہید کر دیا جو بچ رہے تھے
ان کا تعاقب راجہ شیر بہادر سنگھ کے آدمیوں نے دس بارہ کوس تک کر کے
مارلو صاحب کے حکم سے ۶ آدمیوں کا سر اڑا دیا صرف ایک میر عباس
کوتوال لشکر بہ ہزار خرابی اپنے گھر بحکمت بھیجے۔ لڑائی سے چار گھنٹے پیشتر شاہ صاحب
یہ مصرعہ بار بار پڑھتے تھے۔

سر میداں کفن بر دوش دارم

شہادت کے بعد حساب لگایا گیا تو یہی[12] مادہ تاریخ تھا کسی نے تین
مصرعے لگا کر قطعہ کر دیا

مسجد میں جانکلتا اور وقت ہونے پر اذان دیدیتا تو مار پیٹ کر نکال دیا جاتا۔
ہنومان گڑھی لکھنؤ سے تھوڑے فاصلہ پر واقع تھی۔ نوابی میں اطلاعیں
پہنچائی گئیں مگر صدائے برنہ خاست۔
۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ مطابق جولائی ۱۸۵۵ء شاہ غلام حسین اور مولوی
محمد صالح، اعلار کلمۃ اللہ کی خاطر جہاد پر آمادہ ہو کر ایک جمعیت کے ساتھ
ہنومان گڑھی پہنچے۔ بیراگیوں سے مقابلہ ہوا۔ مسجد ہی میں سب کے سب
ذبح کر دیئے گئے۔ قرآن شریف پرزہ پرزہ کر کے پاؤں سے مسلا گیا
جوتے پہنکر داخل مسجد ہو کر سنکھ بجائے گئے ۲۶۹ مسلمان شہید ہوئے۔[1]
کسی نے تاریخ لکھی۔

پئے سالش کمر چوں ہمت بست
ملہم غیب گفت "یافت شکست"
۱۲۷۱ھ

اس خونیں حادثہ اور ہتک ناموس اسلام کے بعد مولانا شاہ امیر علی
ساکن امیٹھی سے نہ رہا گیا۔ تقریریں کر کے مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا جب
قوم میں ہیجان پیدا ہوا اور پانی سر سے اونچا نکل چکا تب واجد علی شاہ وا...
لکھنؤ کو ہوش آیا۔ ۱۸۴۷ء میں عنان حکومت سنبھالی تھی ۱۸۴۸ء میں لا...
ہارڈنگ گورنر جنرل ہند کی تنبیہ پر حضور کونسل قائم کی گئی تھی۔ جس...

[1] تیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۱۲۔

بزرگوں نے جام شہادت نوش کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۵

ساکر دید جوش رسمے بخاک وخوں غلطیدن

مدارحمت کند این عاشقان پاک طینت را

کسی نے کیا خوب کہا ہے

اک جو بچکار کمیں میں ہزاروں بناؤ ہیں

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

یہ تو گذر ہی چکا ہے کہ علامہ دہلی سے مدول ہو کر ٹمپر، الور، ٹونک، سہارنپور اور رامپور میں باعزت عہدے سنبھالتے ہوئے ۱۸۴۹ء میں لکھنؤ میں حضور تحصیل کے مہتمم وصدر الصدور ہو گئے تھے سیالکوٹ کے حادثہ نے قلب ودماغ پر بڑا اثر ڈالا تھا اور مسلمانوں کے انحطاط وبے کسی پر آنسو بہا یا کرتے تھے ساری ریاستوں میں والیان ریاست کو اصرار پر پہنچے سے بھی غرض یہی تھی کہ ان مسلمان اور ہندو والیوں کی مصول کی حرارت کو ٹٹولیں اور انہیں تاریک مستقبل اور بھیانک ظلمت کا صحیح اندازہ کرائیں۔

لکھنؤ پہنچے ہی کچھ دن کے بعد ہی ہنومان گڑھی (متصل اجودھیا فیض آباد) کا حادثہ فاجعہ پیش آگیا۔ وہاں کے مہنتوں نے مسجد میں اول دیوار رکھ دیا مسجد کے ایک حصے کو نقصان بھی پہنچایا۔ کوئی بھولا بھٹکا مسافر

واقعۂ شہادتِ شہیدین (مولانا شاہ سید احمد بریلوی و شاہ اسمٰعیل دہلوی)

یوں ہے کہ پنجاب و سرحد میں رنجیت سنگھ نے زماں شاہ ابدالی کے احسان (گورنری پنجاب) کا یہ بدلا دیا کہ مسلمان علماء کی داڑھیاں منڈوائیں، مساجد منہدم کیں، آواز سے اذان دینا قلمروئے سلطنت میں ممنوع قرار دیا، ذلت کے پیشوں کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص کیا۔

مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل دہلوی پنجاب و سرحد کی ان متواتر اطلاعات سے تڑپ اُٹھے۔ اعلانِ جہاد کے ساتھ، خدا کا نام لیکر بے سرو سامانی کی حالت میں نکل کھڑے ہوئے۔ جمِ غفیر ساتھ ہولیا۔ انگریز نے اپنی بلا دوسرے کے سر پڑتی دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ کوئی روک ٹوک غیر ملکی حکومت کی طرف سے نہ ہوئی۔ ادھر ان بزرگوں کا مقصد بھی یہی تھا کہ پہلے چھوٹی طاقت سے نبٹ کر اپنی قوت کا اندازہ اور میدانِ کارزار کا تجربہ حاصل کرلیں پھر بڑی طاقت سے نبرد آزما ہوں۔ حکومت نے اپنے مفاد کے پیشِ نظر ان مجاہدین کے لئے کچھ سہولتیں بھی پہنچائیں۔ موقعہ جہاد پر پہنچتے پہنچتے تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کی فوج ظفر موج تیار ہوگئی۔ مقابلہ ہوا اور خوب ہوا۔ کچھ مسلمان سرحدی سرداروں نے وقت پر دھوکا دیا۔ بالآخر ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء بروز جمعہ، بالاکوٹ کے مقام پر ہزاروں جاں نثاروں کے ساتھ دونوں

شان کو چار چاند لگائے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

ہندستان کی سیاست میں علماء اسلام کا ہمیشہ سے ہاتھ رہا ہے
آخر دور میں مجدد الف ثانی سے لے کر امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد اور
شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی تک آگے آگے یہی مجاہدین ملت اور
سر فروشان امت رہے ہیں۔ اس بیسویں صدی میں شاہ شہید کی سنت
شیخ الہند مولانا محمود الحسن شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مفتی اعظم مولانا
کفایت اللہ سحبان الہند مولانا احمد سعید، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ
بخاری اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہم ادا کر رہے ہیں
علامہ خیر آبادی کے نقش قدم پر چلنے والوں میں امیر شریعت راجپوتانہ
علامۃ الہند مولانا محمد معین الدین الاجمیری مرحوم سابق صدر جمعیۃ العلمائے
ہند کا نام نامی تاریخ جہاد ہند میں ہمیشہ سنہری حرفوں سے لکھا جاتا رہے گا۔
علامہ اجمیری ہی کی لسنت سے ہم جوسہ چیاں گلشن خیر آباد اور کوچہ
نوردان راہ خیر جارِ جہاد تحریر امداد میں یہ شعر پڑھ سکتے ہیں۔

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرۂ آفتابِ تابانیم

حاکم باشند، آرے اگر بعض احکام اسلام را مثل جمعہ وعیدین واذان
وذبح بقر تعرض نہ کنند، نکردہ باشند لیکن اصل الاصول ایں چیزہا
نزد ایشاں ہبا و ہدر است، زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم مینمائند
وہیچ مسلمان یا ذمّی بغیر استیمانِ ایشاں دریں شہر و در نواح آں نمی تواند
آمد۔ برائے منفعت خود از واردین ومسافرین و تجار مخالفت نمی نمائند
اعیان دیگر مثل شجاع الملک وولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل
نمی توانند شد، و ازیں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ جاری است[1]"

اس فتوے کے بعد دو ہی چارہ کار رکھتے۔ یا تو جہاد کیا جائے، یا بصورت
عدمِ قدرت ہجرت اختیار کی جائے۔

مولانا سید احمد بریلوی، مولانا اسمٰعیل، مولانا عبدالحئی جیسے شاگردان رشید
نے پہلے فرض پر عمل کیا۔ ان کی شہادت کے بعد مولانا شاہ محمد اسحاق محدث
مولانا محمد یعقوب وغیرہما دوسرے فرض پر عمل پیرا ہوئے یعنی ۱۲۶۴ھ میں
ہجرت کر گئے۔ جہاد کی ایک دوسری صورت "افضل الجہاد کلمۃ حق عند
سلطان جائر" رہ گئی تھی اس کی تکمیل تلمیذ سعید علامہ فضل حق خیرآبادی
نے کردی۔ غرض یہ ہے کہ حلقہ بگوشانِ دائرہ ولی اللہی پر سیاست کی چکی
گھومتی رہی۔ اور ان بہادر سپوتوں نے اپنی ہستیاں مٹا کر علمارِ ہندستان کی

---

[1] فتاوی عزیزیہ جلد اصفحہ ۱۷۔ مجتبائی۔

کی شہادت نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کر دیا تھا۔ ۱۸۰۳ء میں فتح دہلی
کے موقعہ پر لارڈ لیک کے معاہدہ سے اس کے خاتمہ کی نوبت آ ہی چکی تھی۔
رہی سہی شان و عزت ۱۸۰۸ء میں اکبر شاہ ثانی کی برائے نام سلطنت بھی پیر جاتی
رہی علماء و اولیاء اسلام اپنی روحانیت اور علم و عمل کے ذریعہ استحکام سلطنت
اور قمع ضلالت و غوایت میں ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔ اس وقت
سرآمد سلطنت علم خاندان ولی اللہی تھا۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند
بھی اس کا سکہ چل رہا تھا جس فتوے پر اس خاندان کی مہر تصدیق
ثبت نہ ہوتی تھی وہ زیادہ باوقعت نہ سمجھا جاتا تھا ادھر لشکر حکومت
میں چور، انگریزوں کی قوم مغرور، مسلمانوں کی تباہی و بے عزتی پر تلی
ہوئی تھی سلب اختیارات بادشاہ، انہدام مساجد اور تذلیل و تحقیر
مسلمانان اس کا محبوب مشغلہ تھا حضرت شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ
محدث دہلوی جو علامہ اور شہیدین کے استاد بھی تھے۔ انہیں حالات کی
بنا پر ہندوستان کو دارالحرب قرار دے چکے تھے۔ پورا فتوی درج ذیل ہے۔

"دریں شہر حکم امام المسلمین اصلا جاری نیست و حکم رؤسا نصاری
بے دغدغہ جاری است و مراد از اجراء احکام کفر ایں است کہ در مقدمہ
ملک داری و بندوبست رعایا و اخذ خراج و عشور اموال تجارت و سیاست
قطاع الطریق و سراق و فصل خصومات و سزائے جنایات کفار بطور خود

مقرر فرمایا تھا ابتداءً نواب فردوس مکان (نواب یوسف علی خاں) وقتی عطیات سے میرزا صاحب کی امداد فرماتے رہتے تھے لیکن غدر کے بعد ان کی پنشن بند ہوگئی تو نواب صاحب نے جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہوار تنخواہ جاری فرما دی تھی جو ان کے انتقال کے بعد نواب خلد آشیاں کے خزانہ سے ملتی رہی۔ اور میرزا صاحب کی وفات پر ان کے متبنیٰ حسین علی خاں شاداں کے وظیفہ کی شکل میں تبدیل ہوگئی[1]

سیاست

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و جگر کی آزمایش ہے

یہ تو مختصراً گذر ہی چکا ہے کہ علامہ کا دور مسلمانوں کے لیے پُر فتن دور تھا۔ سات سو سال سے ہندستان جنت نشان پر مسلمان ایک فاتح قوم کی حیثیت سے مستقلاً حکمرانی کرتے آرہے تھے۔ تین سو سال سے سلاطین مغلیہ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ مسلمانوں کی آنکھوں دیکھتے یہ تقریباً ہزار سالہ پُرشان و شکوہ سلطنت، کلی طور پر نذرِ اغیار ہو رہی تھی۔ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد سے اُسے گھن لگ چکا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں جنگ میسور اور سلطان ٹیپو

---

[1] دیباچۂ مکاتیب غالب صفحہ ۸۔

آگے چلکر علامہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

توقیع فضل حق آں میں معنی — کہ آباد ہر وے فراواں فرستم
گذشت اندر اندیشہ کر نامہ رنج — مداں قلزم فیض واحساں فرستم

دو ہفتہ تک ڈاک سے جواب نہ ملنے پر ۱۱ فروری کو ایک عریضہ اور
ارسال کیا اسی روز شام کو نواب صاحب کا گرامی نامہ مع دو سو پچاس
روپیہ برائے تیسری مطابق دستور شاگردی ملا ۱۲ فروری کو دوسرا خط
لکھتے ہیں۔

" سہ شنبہ ۲۷ جنوری نامہ مولانا دبالفضل اولنا علامہ فضل حق
مں رسید چہار شنبہ ۲۸ جنوری عرضداشت رواں داشتم "[۱]

علامہ کی تعریف وتوصیف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا صاحب سے ریاست کے
مستقل تعلقات قائم ہوگئے۔ بشیر حسین زیدی چیف منسٹر ریاست رامپور،
دیباچہ مکاتیب غالب میں لکھتے ہیں

" نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خاں بہادر غالب دہلوی
کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آغاز ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق خیرآبادی
کی وساطت سے نواب فردوس مکاں نے انہیں فن سخن میں اپنا میر خاص

[۱] مکاتیب غالب صفحہ ۷

بمتکرہ، دسرد الفاظ فصیحہ وتراکیب بلیغہ، بحسب اوزان عروض نسبت بعلو طبع اقدس وبلندی افکار صائبہ، از ادنیٰ مراتب است۔

مرزا صاحب ازیں حال لاعلم اند طبع عالی وفکر صائب در دقائق حکمیہ ومعضلات فلسفیہ بجائے میرسد کہ رسیدن افہام علام اعلام تا آں مقام معلوم الانتفا است، دریں سخن ہیچ مبالغہ واغراق نیست حضور لامع النور بنفس نفیس امتحانات فرمودہ اند، وتکریر امتحان ہم سہل است۔ ونظر بہمت والا درجود وسخا بذل آلاف الوف را اقل قلیل تواں پنداشت مرزا صاحب حق سپاس گذاری ادا کردہ اند نظم قصیدۂ مدحیہ در غایت بلاغت وانسجام است غالباً شرف اندوز ملاحظہ والا شدہ باشد۔"

مولانا کی اس تحریر نے مرزا صاحب کے سابقہ تعلقات از سرِ نو استوار کر دیئے۔ اور ایک مخلص دوست کی کوشش سے میرزا صاحب کی یہ تجویز کہ "آیندہ ریاستوں میں پیر یا استاد بنکر رسوخ حاصل کرنا چاہیئے" ریاست رامپور میں کامیاب ہوگئی۔[1]

جس قصیدہ میمیہ کا علامہ نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے اس کا مطلع یہ ہے اس قصیدہ میں ۴۱۔ اشعار ہیں۔

ہمانا اگر گوہرِ جاں فرستم   بہ نواب یوسف علیخاں فرستم

---

[1] دیباچہ مکاتیب غالب صفحہ ۶۴ و ۶۵۔

ہم اتفاق شدہ بود لیکن محض بجہت سماعت کلام سامی ربانی
مولوی صاحب صدر الوصف دلم خواست کہ طریقۂ رسل و رسائل
جاری شود

اس فرمان نے میرزا صاحب میں یا دلولہ پیدا کیا اور انھوں نے اردوی
کو سرکار کی مدح میں قصیدۂ مدحیہ نظم کرکے بذریعہ ڈاک ارسال کیا اس کی
ایک نقل میرزا صاحب نے مولانا کی خدمت میں بھیجی تھی جو ایس الور
میں موصول ہوئی وہاں سے ۱ ماہ اپریل کو مولانا نے سرکار کو تحریر کیا۔

"بعد عرض میرساند کہ خیر سگالی با تصال اید دبہال تصحت و
اعتدال، بالور رسیدہ ملاطفۂ مرزا صاحب مشفق، نجم الدولہ مرزا اسداللہ
خاں صاحب متخلص بغالب مع قصیدۂ میمیہ کہ در مدح حضور فیض
معمور منظوم کردہ اند از ڈاکخانہ یافت، مرزا صاحب موصوف در ہما
وستائش مورد بی طبع اقدس و توصیف عرلہائے کہ بر دستان سرف
ارسال یافتہ بودند، وشکر و سپاس عطائے صلع یا نصد روپیہ کہ بدو نقد
مرزا صاحب موصوف عنایت شدہ اسہاب در تحریر فرمودہ اند،
حالانکہ طبع اقدس در علوم عقلیہ و فنون حکمیہ آسمان دقیقہ رس کہ عدیل
آں در مملکت ہندستان کہ حال علمائے آں تفصیلاً معلوم است،
کمتر بلکہ معدوم است نظم شعر وفہم آں و ابداع معانی نادرہ و مضامین

غالب نوازی کا حال لکھتے ہیں۔

"حسنِ اتفاق سے مولانا فضل حق خیر آبادی، رامپور میں فروکش تھے انھوں نے حق دوستی ادا کیا اور وقتاً فوقتاً سرکار (نواب سید یوسف علی خاں والئی رامپور) کے روبرو میرزا صاحب کی اس قدر تعریف و توصیف کی، کہ سرکار ان کے کلام کے مشتاق ہو گئے۔ جب حالات سازگار نظر آئے تو مولانا نے میرزا صاحب کو لکھا کہ سرکار کی خدمت مبارک میں "نامۂ بندگی" اور قصیدۂ مدحیہ ارسال کریں۔ مولانا کا نامۂ گرامی میرزا صاحب کو ۲۷ر جنوری ۱۸۵۷ء کو موصول ہوا۔ ۲۸ر جنوری کو انھوں نے بہ تعمیل ارشاد، نواب فردوس مکان کی خدمت میں پہلا عریضہ ارسال کیا۔ اس کے جواب میں سرکار نے ۵ر فروری کو اپنے کچھ اشعار بغرضِ اصلاح بھیجے اور ان کے ساتھ تحریر فرمایا۔

"نمیقہ انیقہ، بلاغت آگیں مشعر رسید، خط مولوی صاحب مخدوم محمد فضل حق صاحب با دیگر مراتب محبت و اشفاق، بعبارت رنگین و دقیق، در عین انتظار سرمہ کش عیون، وصول نشاط شمول گردیدہ۔ باطلاع خیریتہا سرمایۂ سرور نامحصور افزودہ، ازمزید شفقت وائتلاف قلبی متصور شد۔

مشفقا! ہر چند کہ کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرعہ

اخلاق وعادات

علامہ بڑے فیاض اور درد مدل واقع ہوئے تھے دوسروں کی تکلیف دیکھ نہ سکتے تھے داد و دہش کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا۔ دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ حسن سلوک آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ ایک بار حکیم مومن خاں مومن شطرنج کھیلنے سے کسی بات پر ناخوش ہو کر اٹھ کر چلے گئے تو دوسرے وقت ان کے یہاں جا کر انہیں منالائے۔

شاہ غوث علی صاحب شاگرد مولانا فضل امام خیر آبادی ایک مرتبہ دوران قیام رامپور میں اتفاقاً پڑ گئے سرائے میں قیام تھا علامہ نے انتہا اصرار سے اپنے پاس ٹھیرانے کی کوشش کی لیکن شاہ صاحب جو اکثر متعلق میں رہتے تھے اور تخلیہ کے خوگر تھے آمادہ نہ ہوئے تو مالک سرائے کو کہلا بھیجا کہ شاہ صاحب کے تمام مصارف کا بل ہمارے پاس آئے اور جس قدر بھی حرج ہو ان سے کچھ طلب نہ کیا جائے[۱]۔

علامہ دوستوں کے فائدے کی نئی نئی صورتیں پیدا کیا کرتے مخلص احباب میں مرزا اسداللہ خاں غالب سب سے زیادہ صرور تمند تھے مولوی امتیاز علی خاں عرشی رامپوری ناظم کتب خانہ ریاست، مکاتیب غالب میں

---

[۱] تذکرہ غوثیہ

فی المکتوبات، وکان رحمہ اللہ رؤفا بالطلاب حریصا علی تدریس اولی الافہام والالباب، فکان دیدنہ الافہام بالفاظ سہلۃ الانفہام ولا یستفہم مہما یستفہم عن التفہیم، ویسوی بین ولدہ وفلذۃ کبدہ وبین احد من الطلبۃ فی الارشاد والتعلیم" [۱]

"اللہ کے دیئے ہوئے ہاتھی، اونٹ اور عمدہ قسم کے گھوڑے سے اوامر و نواہی میں اطاعتِ خداوندی سے نہ روکتے تھے۔ آپ ان میں سے تھے کہ تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر میں حارج نہ ہو سکتی تھی۔ ہر ہفتہ ختم قرآن پاک فرماتے تہجد کی نماز کی پابندی فرماتے، جو نوافل پر اس درجہ مواظبت کرتا ہو اس کے فرائض کا حال خود سمجھ میں آتا ہے طلبہ پر شفیق، اور ذہین تلامذہ کے پڑھانے پر حریص تھے۔ آسان اور سہل الفاظ میں سمجھاتے، کسی کے سمجھانے سے بات نہ سمجھنے بلکہ خود تہ تک پہنچتے تعلیم و تدریس میں اپنے جگر گوشہ اور عام طالب علم میں ذرہ برابر فرق نہ کرتے۔"

---

[۱] خطبۂ ہدیہ سعیدیہ۔

رضوی حیدرآبادی میں موجود ہے۔ اس میں تفاعت و امتناع نظیر پر بحث ہے یہ پہلی تحریر ہے اور رسالہ امتناع النظیر جواب الحجاب ہے سلسلۂ عالیہ چشتیہ میں حضرت مولانا شاہ دھومن دہلوی سے بیعت ہوئے۔ مرید شاہ دھومن دہلوی بود[1]۔

مولوی فیض الحسن کہتے تھے کہ میرے استاد مولوی فضل حق رامپوری کا بیان ہے کہ علامہ فرماتے تھے کہ میں حضرت مجدد صاحب کے سلسلے کا زیادہ معتقد نہ تھا لیکن جب سے میں نے شاہ عبدالقادر صاحب کو دیکھا اس سلسلہ کا بہت معتقد ہوگیا کیونکہ اگر وہ سلسلہ فی الواقع ناقص ہوتا تو ایسے لوگ اس سلسلے میں داخل نہ ہوتے[2]

علامہ باایں ہمہ علم و فضل و ریاست و امارت، شریعت و طریقت پر کس درجہ عمل پیرا تھے مولانا عبداللہ بلگرامی کے الفاظ میں سنئے۔

"ولا تشغلہ ما رزقہ اللہ من الاموال والعقار، والصافنات من الجیاد عن طاعۃ اللہ فیما امرہ ونہاہ فکان من رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ وکان مواظبا علی ختم القرآن من کل اسبوع من الایام والصلوۃ النافلۃ فی جوف اللیل والناس نیام ممن کان مواظبا علی المتطوعات، مما طبك نہ

[1] تذکرہ علمائے ہند [2] امیر الروایات صفحہ ۳۸۔

علامہ جب لکھنؤ میں صدر الصدوری کے فرائض انجام دے رہے تھے تو منشی نولکشور نے بکمال ادب عرض کیا کہ اوقات فرصت میں عربی کتب کی کاپی ملاحظہ فرماکر مطبع کی عزت دوبالا فرمائیں۔ تو عین بندہ نوازی ہوگی۔ از راہِ اخلاق منظور کرنا پڑا۔ مجتہد العصر کی ایک کتاب مناظرہ مطبع میں طبع ہونے آئی۔ اس کی کاپیاں ملاحظہ کے لئے آپ کی خدمت میں بھیجی گئیں۔ آپ تصحیح عبارت کے ساتھ ہی ساتھ حاشیہ پر اعتراضات کے جوابات بھی لکھتے جاتے تھے۔ جب کتاب چھپکر ان مجتہد صاحب کے پاس پہنچی تو اسے دیکھ کر سر پیٹ لیا کہ تمام عمر کی محنت برباد گئی۔ دریافت پر منشی نولکشور نے اصل حقیقت ظاہر کردی۔ آخرش کتابوں کے انبار میں آگ لگوا دی گئی[1]

بیعت

علامہ عقیدۃً سنی حنفی ماتریدی تھے یہی وجہ تھی کہ مولانا اسمٰعیل شہید سے "رفع یدین" اور "آمین بالجہر" "امکان نظیر و امتناعِ نظیر" پر مناظرہ چھڑ گیا تھا جو عرصہ تک جاری رہا۔ دونوں طرف سے تحریروں کا سلسلہ چلتا رہا۔ تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ۔ کتب خانہ مولوی سید نجم الحسن

---

[1] تذکرہ فضلائے ہند۔

یہ تھے ان دونوں بزرگوں کے کارنامے اختلاف کس میں ہیں؟ ائمہ صحابہ کرام، مجتہدین عظام علماء، وادلیاء ردوی الاحترام، کس اس سے محفوظ رہے۔ یہ اختلاف تو باعث رحمت ہے اختلاف امتی رحمۃ ایسے ہی اختلاف کو کہا گیا ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

۱ روحانی وحدی معراج، قرأۃ خلف الامام، وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود، اور اسی قسم کے صدہا مسائل پر بحث رہے ہیں۔ دونوں طرف اکابر و اعاظم حضرات نظر آتے ہیں۔ ہمارے لئے سبھی قابل احترام ہیں یہ اور بات ہے کہ ہماری رائے کسی ایک طرف ہو اسی طرح امکان نظیر و امتناع نظیر میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے علمی مسئلہ ہے فلسفیانہ نکات و حقائق کا حامل ہے۔ خواص کے سوا عوام سے اس کا تعلق کیا پھر بھی ہر کس و ناکس اس پر طبع آزمائی کرتے بیٹھ جاتا ہے جو لوگ امکان کے معنی اور اس کی اصطلاحی تقسیم و تعریف سے بھی بے بہرہ ہیں وہ بھی اس پر قلم اٹھا رہے ہیں۔ اللھم احفظنا من شرور الفتن۔

علامہ کے ردّ و مناظرہ کی مہارت کا اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ

بوا سعتہ رحمتہ الضیق والضنک، ووفقنا لصالح الاعمال وجمیل الفعال توفیقاً، وجعلنا مع الذین انعم علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین، و حسن اولٰئک رفیقاً۔"

اس کا لفظ لفظ اعترافِ قصور اور خشیتِ ربِ غفور پر دلالت کرتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"بہترین وصیت یہی ہو سکتی ہے کہ خدا سے ظاہر و باطن دونوں حالتوں میں ڈرتا ہے اگرچہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے آپ کو بھول کر دوسروں کو نیکی کی ہدایت کرتا ہے۔

کس قدر افسوس ہے کہ میں اپنی عمر خواہشات میں برباد اور اپنی زندگی بداعمالی میں تباہ کرتا رہا۔ اپنی عزت و توقیر واہیات باتوں کی وجہ سے گراتا اور اپنی پونجی کی بڑی مقدار مٹاتا رہا۔ حیات کے خوشگوار دن اترانے میں اور بہترین ایام لہو ولعب میں گذارتا رہا۔ خدا مجھے اور تمھیں معاف کرے اور اپنی رحمت کاملہ سے ان لغزشوں سے درگذر کرے۔ ہم سب کو اعمال نیک کی توفیق دے۔ اور اپنے مقبول بندوں، انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کا رفیق بنائے۔"

حلقہ بگوشان اسلام کی مذہبی خدمت انجام دے رہا ہے تو دوسرا ردّ من الحمد
فی تحقیق وحدۃ الوجود تصنیف کرکے اہل عرفان کے ایمان وایقان کو
مستحکم بنا رہا ہے۔ اور صد ہا قصائد نعتیہ زادِ راہِ آخرت اور توشۂ عاقبت
عاقبت بن رہے ہیں۔
امام الہند مولانا ابوالکلام مدظلہ نے ۴ اپریل ۱۹۳۶ء کی صبح کو بوقتِ
ملاقات اپنے استاد مکرم مولانا نظیر الحسن انبیٹھوی (تلمیذ مولانا محمد عبدالحق
خیرآبادی) کی نسبت سے یہ روایت بیان کی کہ علامہ نے وحدۃ الوجود پر
جب رسالہ لکھا تو اہل علم وصاحب عرفان حضرات سنّد رحال کرکے علامہ
کی زبان سے اس کو سننے کے لئے حاضر خدمت ہوئے تھے۔ اور اس
معرکۃ الآراء مسئلہ کے حقائق ودقائق سُن کر ان پر وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔
اس رسالہ کے آخر میں جو توصیت فرمائی ہے اس سے حیثیت نامی اور قلبی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے

"ان خیر ما یتواصی بہ ان یتقی اللہ فی العلانیۃ والسرّ
وان کنت فی ہذہ التوصیۃ ممن نسی نفسہ وامر غیرہ
بالتزکیۃ لھی علی امر اتلفتہ ومن فی الھوی اسلفتہ
وسوء عمل احلفتہ وقدرٍ بالخلاعۃ وضعتہ وقدرٍ
من الصناعۃ اضعتہ وریعان فی الزھو قصعتہ وعیش
لباب فی اللھو امضیتہ عما اللہ عنی وعنک واذھب عنا

علامہ و مولانا شہید کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ آپڑا ہے۔ جو لوگ دونوں کے فضل و کمال اور مہارتِ علوم و فنون سے ناواقف محض ہیں، انھوں نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھا کر تفضیل و تنقیص کے ساتھ موازنہ شروع کر دیا۔ کاش وہ دونوں کے مرتبے کو پہچانتے اور دونوں کی صدق دلی اور حق گوئی کے انجام کو دیکھتے۔ انما العبرۃ بالخواتیم اور انما الاعمال بالنیات کو ملحوظ رکھتے۔

ایک (مولانا شہید) نے جہاد بالسیف کر کے بالاکوٹ کے مقام پر ۱۲۴۶ھ میں شہادت جہری حاصل کی تو دوسرے (علامہ فضل حق) نے "افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر" پر عمل پیرا ہو کر فتویٰ دیکر جہادِ لسانی و قلمی کرتے ہوئے ۱۲۷۸ھ میں جزیرہ انڈمان میں بہ حیثیت اسیرِ فرنگ، مرتبہ شہادتِ سرّی پایا۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

دوسری طرف دیکھئے تو ایک مجاہدِ اعظم وقت سید احمد شہید بریلوی کا دامنِ عقیدت تھامے ہوئے نظر آرہا ہے تو دوسرا سرآمدِ اولیاءِ عہد حضرت دھومن شاہ دہلوی کا خرقۂ ارادت زیبِ تن کئے ہوئے جلوہ آرا ہے۔ ایک اگر تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم لکھ کر اپنے خیال کے مطابق

لکھی ہے علامہ شبلی مرحوم کے ساتھ امام اعظم کو بھی نہیں بخشا گیا ہے پھر خیرآبادی بزرگان کرام پر طبع آزمائی کا شکوہ کیوں ہو؟

مردہ قوموں اور بدطینت گروہوں کا خاصہ یہ بھی رہا ہے کہ اسلاف پر نکتہ چینی اور بہتان تراشی شعار بنایا گیا ہے خلفاء راشدین میں کیسا خلوص و اتحاد تھا تاریخی واقعات اس کے شاہد اور سیر کی روایات اس پر گواہ ہیں صحابہ کرام میں باہمی اخلاص و محبت ضرب المثل تھا۔ حضرت امیر معاویہ کا جنگ صفین کے موقعہ پر بادشاہ روم کو جواب رہتی دنیا تک سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جنگ جمل میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہ کے اونٹ اور ہودج کی حفاظت و نگہداشت کسی سے بھولنے والا واقعہ ہے ان حضرات کا اختلاف بھی ذاتی مخالفت سے بالاتر ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کا ادب و احترام پورا ملحوظ رکھتا تھا۔

اس کے باوجود بھی تیرہ سو سال سے روافض و خوارج باہم دست و گریباں ہیں وہ کونسا الزام ہے جو ایک گروہ دوسرے کے بزرگوں پر نہیں لگاتا اور وہ کونسا بہتان و افتراء ہے جو ان اصحاب رسول پر نہیں تراشا جاتا العیاذ باللہ

توصیہ دانی سرحق اے جاہلی تو گرفتار ابوبکر و علی

فاخر رامپوری وغیرہم کو تالیف و ترجمہ کتب پر مامور فرمایا لیکن یہ پودا پروان نہ چڑھنے پایا تھا کہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں نواب جنت آرامگاہ نے وفات پائی[1]۔

ان مشتے نمونہ از خروارے، اکابر معاصرین کی شہادتوں کے بعد مرزا حیرت کی جرأت و جسارت پر حیرت ہوتی ہے۔ اور غور کیجئے تو حیرت کی کوئی بات بھی نہیں۔ جو واقعۂ کربلا اور حادثۂ شہادتِ امام حسین رضی اللہ عنہ سے انکاری ہو وہ فضل و کمال فضل حق کا منکر بن جائے تو حیرت کیوں ہو۔ کیا شہرت خانۂ خدا میں پہنچکر داد و دہش خیرات و مبرات سے ہی حاصل ہوتی ہے؟ چاہِ زمزم میں نجاست ڈالنے سے مشہور نہیں ہو سکتا؟

مرزا حیرت کی علمی قابلیت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ علامہ شبلی مرحوم نے سیرۃ النعمان صفحہ ۴۹ و ۵۰ پر امام اعظم ابو حنیفہ کی فوقیت دوسرے ائمہ مجتہدین پر ثابت کرتے ہوئے کچھ اختلافی مسائل نقل کئے ہیں جن سے امام اعظم کی ذہنی رسائی اور ارتقاءِ دماغی کا اچھی طرح حال معلوم ہوتا ہے۔ انھیں میں سے مسائل نصاب سرقہ اور عدم قطع ید نباش بھی ہیں۔ مرزا جی نے حیوٰۃ طیبہ (سیرت مولانا شہید) میں اس بحث کو چھیڑ کر ان دونوں مسئلوں پر بلا ضرورت خامہ فرسائی بھی ضروری

[1] دیباچۂ مکاتیب غالب صفحہ ۷ از بشیر حسین زیدی۔

کو بھی آپ سے تلمذ رہا ہے اور بندگان حضور (نواب خلد آشیاں) نے بھی کچھ پڑھا ہے۔ آٹھ برس بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے پھر یہاں سے تشریف لے گئے۔[۱]

مفتی انعام اللہ خاں بہادر شہابی گوپاموی سر رشتہ دار سرایڈورڈ کولبرک ریذیڈنٹ دہلی متوفی ۱۲۷۵ھ لکھتے ہیں۔

"برادرم مولوی فضل حق خیر آبادی از فحول علمائے رمال و یگانہ دوران است خصوصاً در علوم عقلیہ گوئے سبقت ربودہ و لو و علم و دانش در اطراف عالم لعابت دریں وقت مشہور است۔"[۲]

مولوی اکرام اللہ شہابی گوپاموی نے شمس العلماء مولانا عبد الحق خیر آبادی سے پوچھا بھائی صاحب! دنیا میں حکیم کا اطلاق کس کس پر ہے مولانا کہنے لگے میاں ! ساڑھے تین حکیم دنیا میں ہیں۔

ایک معلم اول ارسطو، دوسرے معلم ثانی فارابی، تیسرے والد ماجد مولانا فضل حق اور نصف بندہ۔[۳]

۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں نواب سید محمد سعید خاں بہادر مسند نشین ریاست بکر انتظامی امور سے فارغ ہوئے اور سرپرستی علم و ادب کی طرف قدم اٹھایا تو مولانا فضل حق خیر آبادی ملک الشعراء رکی مرادآبادی حکیم احمد خاں

---

[۱] انتخاب یادگار صفحہ ۲۹۱ [۲] حدیقۃ الاولیاء [۳] ذکر علماء مولوی اکرام اللہ شہابی (قلمی)

رشک گوہر خوش آب، اور معانی رنگیں ان کے غیرت لعل ناب، سطران
کی سطور عبارت کے آگے پا بہ گل، اور گل ان کی عبارت رنگین کے
سامنے خجل، ....

مولوی رحمٰن علی لکھتے ہیں۔

"در علوم منطق و حکمت و فلسفہ و ادب و کلام و اصول و شعر
فائق الاقران و استحضارے فوق البیان داشت[۱۱]"

منشی امیر احمد مینائی انتخاب یادگار میں تحریر فرماتے ہیں۔

افضل الفضلاء، اکمل الکملاء، فضائل دستگاہ، فواضل پناہ جناب
مولانا مولوی فضل حق صاحب فاروقی برّد اللہ مضجعہ، فنون حکمیہ میں مرتبۂ
اجتہاد، بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین، نہایت ذکی، طلیق و
ذلیق، انتہا کے صاحب تدقیق و تحقیق ..... جس شہر میں آپ رونق افروز
ہوئے صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے شاہجہاں آباد میں اگرچہ عدالتین کے سررشتہ دار تھے
مگر بڑے ذی اقتدار اور صاحب اختیار تھے۔ ججھر میں مشاہرۂ جلیلہ پر
نوکر رہے۔ الور اور سہارنپور اور ٹونک سب جگہ مؤقر و معزز رہے،
لکھنؤ میں صدر الصدور تھے اور اس دار الریاست رامپور میں پہلے محکمہ نظامت
اور پھر مرافعۂ عدالتین پر مامور تھے۔ جناب مستطاب نواب فردوس مکان

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند۔

صافی ضمیری ثالث اثنین بدیعی و حریری، المعیٔ وقت، دلورعی اوان فرزدق عہد دلبید دوراں، مبطل باطل ومحق حق، مولانا محمد فضل حق یہ حضرت خلف الرشید ہیں جناب مستطاب مولانا فضل امام عمہ اللہ لہ السلام کے اور تحصیل علوم عقلیہ اور نقلیہ کی اپنے والد ماجد کی خدمت بابرکت میں کی ہے۔ زبان قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے بحر عاملاں لکھا، اور فکر دقیق نے حسب مترکار کو دریافت کیا بحر جہاں پایا۔

جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انہیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے، علمائے عصر کی فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں، بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے ان کی زبان سے یک حرف سا دعوائے کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو امام فخر سمجھے، باایں ہمہ کمالات علم ادب میں ایسا علم سراواری بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت ستہ مصر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دستِ آویز بلندی مدارج ہے۔

سحبان کو ان کی فصاحت سے سرمایہ حوش بیانی اور امرء القیس کو ان کے افکار بلند سے دستگاہ عروج معانی، الفاظ پاکیزہ ان کے

ہر جگہ یہی جذبہ کارفرما دیکھا۔

چوں ندید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند

مرزا حیرت دہلوی، صاحب حیوٰۃ طیبّہ نے تو محوِ حیرت ہی بنا دیا۔ نہ صرف علامہ بلکہ علامہ کے والد ماجد مولانا فضل امام کو بھی پڑھا لکھا ماننے میں تامّل کیا ہے۔ جن کے تلامذہ میں علاوہ علامہ کے مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور دہلی وغیرہ جیسے گرامی قدر فضلائے عہد بھی موجود ہوں کہ جن کے ادنیٰ حلقہ بگوش و شاگرد، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی اور سرسید احمد خاں بانیٔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ جیسے اکابرِ مشاہیرِ وقت نظر آتے ہوں۔ حیرت ہوتی ہے کہ انسان معاندانہ روش اختیار کرتے وقت نابینا کیوں ہو جاتا ہے۔

سرسید احمد خاں مرحوم نے مولانا فضل امام کے متعلق جن تاثرات کا اظہار آثارالصنادید میں کیا ہے وہ مولانا کے حالات میں پیچھے گذر چکا ہے علامہ کے متعلق بھی چند سطریں ملاحظہ کرتے چلئے۔

"مستجمع کمالاتِ صوری و معنوی، جامع فضائلِ ظاہری و باطنی، بنّا ربنائے فضل و افضال، بہار آرائے چمنستانِ کمال، متکئی ارائک اصابت رائے مسند نشین دیوان افکار رسائے، صاحب خلقِ محمدی، موردِ سعادتِ ازلی و ابدی، حاکم محاکمِ مناظرات، فرماں روائے کشورِ محاکمات، عکس آئینہ

دریں عقیدت برگردم والسّلام
نامہ را درمی نوردم والسّلام

عالب نے ان اسعار میں سے اسدائی پانچ شعروں میں اپنی قابلیت سے ایک حل نکالنے کی کوشش کی جس میں دونوں اکابر کی بات رہجاتی تھی اور وہ یہ کہ خاتم النبیین، اللہ حل شانہ نے اس عالم کے لئے بنایا ہے اس عالم میں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر پیدا ہونا محال اور ممتنع بالذات ہے لیکن مدا دوسرا عالم بناکر آدم سے عیسیٰ تک اس عالم کے لئے پیغمبر پیدا کرکے آخر میں محمد رسول اللہ علی نبینا علیہم الصلوٰۃ والسّلام کو خاتم النبیین بناسکتا ہے۔ اس طرح امکان نظر کی صورت نکل سکتی ہے۔ آخری چھ اشعار میں اس خیال کو رد کرتے ہوئے علامہ کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا ہے۔ اور اسی رائے سے اپنی موافقت ظاہر کرتے ہوئے جس مدلل طریقہ پر اسے ثابت کیا ہے یہ غالب ہی کا حصہ ہے۔

سوانح نگاروں نے اپنی نادانی اور جانبداری کی شاعرانہ سی بات کو افسانہ بنادیا ان علمی نکتوں کو جانبین کے رشک وحسد کا نتیجہ قرار دیا دونوں کے معتقدین نے دونوں باکمال بزرگوں کی تنقیص کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی۔ میں نے دونوں گروہوں کے مضامین پڑھے

لیس للّٰہ بمستنکر   ان یجمع العالم فی واحد

یہ تو پہلے گذر ہی چکا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب سے علامہ کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ علامہ کا رجحانِ طبع دیکھ کر اسی موضوع پر ایک مثنوی لکھ ڈالی جو کلیاتِ غالب میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے۔ غالب کے اندازِ بیان کا یہ کچھ کم کمال نہیں کہ ایسے مشکل مسئلہ کو ایسی روانی اور خوبی سے سمجھا دیا۔ علامہ اور دوسرے اہلِ فضل و کمال کی صحبت نے غالب کو فی الواقع غالب بنا دیا تھا۔ لکھتے ہیں۔

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است   قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے   ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود   رحمۃ للعالمینے ہم بود
کثرتِ ابداعِ عالم خوب تر   یا بیک عالم دو خاتم خوب تر
در یکے عالم دو تا خاتم مجوئے   صد ہزاراں عالم و خاتم بگوئے
غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمی   خردہ ہم بر خویش می گیرم ہمی
اے کہ ختم المرسلینش خواندہ   واہم از روئے یقینش خواندہ
ایں الف لامے کہ استغراق راست   حکم ناطق معنے اطلاق راست
منشاء ایجاد ہر عالم یکے است   گر دو صد عالم بود خاتم یکے است
منفرد اندر کمال ذاتی است   لاجرم مثلش "محالِ ذاتی" است

حدیۂ اخلاص و حریت میں لے مدیل و ہیتال میدانِ قرطاس پر اشہبِ قلم نے دوڑنا شروع کیا۔ سمند ہائے خامہ نے وہ وہ جولانیاں کھائیں کہ مخالف و موافق سبھی دادِ روانی دیئے بغیر نہ رہ سکے علمی موشگافیاں فنی باریکیاں، منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے لگیں سریع یدیں، آمین بالجہر وغیرہا پر خامہ فرسائی ہونے لگی۔ موافق و مخالف علما رسمی میدان میں اتر آئے، بڑا مسئلہ امکان نظیر اور امتناع نظیر کا چھڑ گیا۔

اس مسئلہ میں شاہ صاحب کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے علامہ ممتنع بالذات ملتے تھے۔ اس مسئلہ پر علامہ کی مستقل کتاب مناظرانہ انداز پر امتناع النظیر کے نام سے ۱۹۰۸ء میں موصوف کے تلمیذ رشید مولانا سید سلیمان اشرف بہاری مرحوم سابق صدر دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہے۔ علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا اصلی مسودہ کتاب خانہ صبیب گنج میں موجود ہے اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر کے ممتنع بالذات ہونے پر جو دلائل و براہین قائم کیے ہیں انہیں دیکھ کر بے ساختہ مرحبا و احسنت زباں پر آتا ہے۔ علمی و فنی حیثیت سے وہ وہ گلکاریاں کی ہیں کہ صفحات کتاب تختۂ بستاں بن گئے ہیں۔ اسی ایک کتاب پر کیا موقوف ہے تمام مصنفات کو دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے سے

نہ رہ سکے۔ انھیں میں سے علامہ فضل حق خیرآبادی بھی تھے۔ علامہ کی
دوربین نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ یہ تو آسمان سے گر کر کھجور پر اٹکنا ہوا
تفریط گئی تو افراط پیدا ہو کر رہے گا۔ ایسے مواقع پر پہلو تہی اور خاموشی
گناہِ عظیم ہے۔

علامہ ریذیڈنسی میں سررشتہ دار تھے۔ اپنے استاد بھائی مفتی صدرالدین
خاں آزردہ صدرالصدور کی طرح حکام و رعایا میں مقبول خاص و عام
اور ڈپٹی کمشنر کے برابر با اقتدار تھے۔ قلعہ معلیٰ میں بھی بادشاہ و شاہزادگاں
کی نظر میں باوقعت تھے (جن کا مختصر حال اوپر گذر چکا ہے) علامہ
نے پہلے تو یہی کوشش کی کہ دونوں طرف کے اس ہنگامہ اور مسلمانوں
کی باہم جنگ و جدال کو قانونی طور پر روک دیا جائے تاکہ ایک طرف
عوام بھی مطمئن ہو جائیں اور دوسری جانب شاہ صاحب کے لئے بھی
بارِ خاطر نہ ہو۔ اس میں مستقل طور پر کامیابی نہ ہو سکی تو ایسے اختلافی مسائل
کو علمی طریقہ پر باہمی طے کرنا مناسب سمجھا تاکہ عوام میں علمی مسائل ن
کھلونا بلکہ مزید گمراہی کا سبب نہ بنیں۔ اور جس طرح مولانا شہید نیک
سے زلۃ العالم کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ علامہ زلۃ العالم کو بہ
اخلاص گوارا نہ کر سکتے تھے۔ مشترک اساتذہ کے فیض صحبت نے دو
ہی کو حق گو اور صداقت شعار بنا دیا تھا۔ علم و فضل میں دونوں با

ارادہ کیا تو اپنے پیر و مرشد سید احمد بریلویؒ، مولانا عبدالحئی، مولانا شاہ محمد اسحٰق، مولانا محمد یعقوب، حکیم مومن خاں مومن، مولوی فرید الدین مراد آبادی، مولانا عبداللہ خاں علوی (استاد امام بخش صہبائی) شہید کو جمع کر کے ایک مسودہ تقریر کی آپ نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ اس (تقویۃ الایمان) میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آگئے ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہوگیا ہے، مثلاً ان امور کو جو شرک خفی ہیں شرک جلی لکھدیا گیا ہے ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ شورش ضرور پھیلے گی"[1]

اس تمہید کے بعد اس مقتدر کمیٹی سے ترمیم و اصلاح کی درخواست کی حکیم مومن خاں، عبداللہ خاں علوی اور بعض دوسرے احباب نے مولانا کی دلداری کے لحاظ سے ترمیم کی مخالفت کی اور کتاب اصلی حالت پر چھوڑ دی گئی۔ (اس کتاب کا پرانا ایڈیشن کہیں دستیاب ہو تو تمام جذبات عقیدت و محبت سے بالاتر ہوکر پڑھنے سے ہر انصاف پسند مسلمان اندازہ لگا سکے کہ الفاظ و عبارات نے نامناسب لب و لہجہ اختیار کیا ہے یا نہیں؟)

اس افراط و غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کے جذبۂ اصلاح اور وعظ و ارشاد کی قدر کرنے والے اور پرانے ساتھی بھی مولانا کی مخالفت کئے بغیر

---

[1] سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۵۴

شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے بعد ۱۸۱۷ء میں ان کی جگہ سنبھالی۔ جامع مسجد کو
مرکزِ رشد وہدایت بنایا۔ پہلا وعظ وحدانیتِ باری تعالیٰ اور دوسرا تقرر
تصوف پر کہا۔ ان دونوں وعظوں کو منشی ہیرالال نے بجنسہ نقل کیا ہے
جو "الحق مر و لوکان در" کے مطابق جو
جات طیبہ میں مفصل درج ہیں۔ جذبات و خواہشات کے خلاف اٹھائی ہوئی
تمام مصلحین کے ساتھ بھی ہوا۔ جذبات و خواہشات کے خلاف اٹھائی ہوئی
آواز کی مخالفت ہوئی اور پوری طاقت سے ہوئی۔ لوگوں نے غلط فہمیاں
پھیلانا شروع کیں، الزامات تراشنا اور بہتان باندھنا اپنا شعار بنالیا۔ خدا
کے پیغام پر عمل کرنے کو کہا جاتا تھا تو آبائی رسم و رواج کا حوالہ دیدیا کرتے
تھے۔ "وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ
آبَاءَ نَا" کے سرتاسر مصداق بن گئے تھے۔
مسلمانوں کی شدتِ مخالفت کی بنا پر قدرتی طور پر شاہ صاحب کا جذبہ
اصلاح بھی غلو کی شکل اختیار کر گیا۔ ایک طرف تفریط تھی تو دوسری جانب
افراط شاہ صاحب نے مسلمانوں کی ہر غلط روی کو شرک سے تعبیر کرنا شروع
کیا۔ مقصد نیک اور نیت بخیر تھی۔ "مر گش بگیر تا بہ تپ راضی آید" کے اصول پر
اہتمام کار تھا۔ وعظ و تبلیغ کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع
ہوا۔ پہلے عربی میں پھر اردو میں تقویۃ الایمان لکھی۔ اس میں حدِّ اعتدال
سے تجاوز کیا گیا اس کا خود مصنف کو بھی احساس تھا جب تک دیا ...

زوال پذیر اور مردہ اقوام میں عزم و جہاد کی جگہ گوشہ نشینی و بزدلی لے لیتی ہے خدا پرستی کے بجائے شیطان پرستی گھر کر لیتی ہے۔ اوہام باطلہ اپنا تسلط جما لیتے ہیں، خود اعتمادی کا خاتمہ ہو جاتا ہے دنیا کی ہر شئے کو حاجت روا اور تنکے کو ڈوبتوں کا سہارا سمجھا جانے لگتا ہے۔

برائے نام بادشاہوں کی عیش پرستیوں نے دم پر اور جمود طاری کر دیا تھا مولانا شاہ اسمٰعیل بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور علامہ فضل حق بن مولانا فضل امام خیر آبادیؒ نے اسی پُر آشوب دور میں آنکھیں کھولی تھیں۔ دونوں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے تربیت یافتہ اور ایک ہی ماحول میں پرورش پانے والے تھے۔ دونوں کا علمی خاندان سے تعلق تھا۔ پندرھویں پشت میں جد اعلیٰ شیر الملک بن عطاء الملک شاہ ایرانی میں دونوں کا نسب جا کر ملتا ہے دونوں نے اجتہاد میں وطیں تھے۔ ایک نے تیرہ سال اور دوسرے (شاہ اسمٰعیل) نے سولہ سال کی عمر میں علوم نقلیہ و عقلیہ میں مہارت تامہ حاصل کر لی تھی (شاہ صاحب علامہ سے ۱۸ سال بڑے تھے اس لحاظ سے علامہ کی پیدائش اور شاہ صاحب کی مسند نشینیٔ درس و تدریس کا سال تقریباً ایک ہی ہو جاتا ہے)

مسلمانوں کی گمراہی اور بے راہ روی مولانا اسمٰعیل سے نہ دیکھی گئی۔ درس و تدریس کے ساتھ وعظ و تبلیغ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ عم محترم

کہ مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ ان میں بھی ہمسایہ اقوام اور غلامی کی "برکات" کی وجہ سے شرکیہ و بدعیہ مراسم رواج پا گئے۔

محرم کے ماتمی جلوسوں کو یزیدی فوج کی شان و شوکت اور براقوں کے مجسموں کو زیور پہنا کر مورتیوں کی شکل و صورت دیدی گئی۔ بتوں کی طرح قبروں پر جبیں سائی ہونے لگی۔ جامع مسجد کے اندر حوض پر خوانچہ بیچنے والوں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ بیع و شرا کے مسجد میں دروازے کھل گئے بی بی کی صحنک، شیخ سدو کا بکرا، اور اسی قسم کے دوسرے خرافات نے مذہبی شکل اختیار کر لی۔ بی بی کی صحنک کے لئے عجیب قیود تھے بیوہ، کنواری، اور دوبارہ شادی شدہ عورت اس طعامِ فاتحہ کو نہیں کھا سکتی تھی۔ اسی طرح مرد بھی ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ اس کی مثال ۲۲ رجب کے موجودہ مروجہ کونڈوں سے سمجھ لیجئے۔ کونڈوں کی میٹھی پوریاں معین احاطے سے باہر نہیں جا سکتیں، ہاتھ بھی وہیں ایک برتن میں دھونے ضروری ہیں غسل کر کے کھانا فرائض میں شامل ہے۔ حقیقت اس کی صرف اتنی ہے کہ امام جعفر صادقؒ کی روح کو اس کا ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے۔ ایصالِ ثواب کے لئے کھانا تقسیم کرنا زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے۔ رسمی قیود بڑھا کر جائز کو ناجائز بنا دینے کی کوشش کی گئی ہے یہی حال بی بی کی صحنک اور دوسری خرافات کا ہے۔

تھے دہلی، بنگال، اور آسام پر حملہ بھی کرتے رہتے تھے۔

(۲) فرانسیسی طاقت مدراس میں

(۳) نظام حیدرآباد دکن میں

(۴) ٹیپو سلطان میسور میں

۱۷۶۱ء میں جنگ پانی پت نے مرہٹوں کے حوصلے پست کر دیئے تھے اور ۱۷۹۹ء میں میر صادق نے جنگ میسور کا پانسہ پلٹ کر شیر ہندوستان سلطان ٹیپو کو شہید کرا ڈالا تھا۔ اٹھارویں صدی کے خاتمہ تک صرف ایک طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوس لمن الملک بجنے لگا تھا۔ ۱۸۰۳ء و ۱۸۰۶ء میں یہ کمپنی بالکل ہی قسمت ہندستان کی مالک بن گئی۔

یہ تھی آخری تاجداران مغلیہ کی عیش پرستی لامتناہی اور کفران نعمت الٰہی کی شرمناک داستان جس کا خمیازہ نہ صرف مسلمان قوم بلکہ پورے ہندوستان کو ڈیڑھ صدی سے بھگتنا پڑ رہا ہے علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

آ تجھکو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے

شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

میں کہہ رہا تھا کہ غلامی بُری بلا ہے۔ اس سے قوموں کی خصوصیات، ان کے خصائل و عادات یا تو فنا ہو جاتے ہیں یا مسخ ہو جاتے ہیں، ہندستان

۱۸۰۳ء میں رہی سہی عزت وشان بھی ختم ہوگئی جبکہ لارڈ لیک نے دہلی پر حملہ کرکے شاہ عالم کو گرفتار کرنے کے بعد ایک شرمناک معاہدہ کیا جس کی رو سے شاہِ دہلی کی حکومت شہر و قلعہ اور اطرافِ دہلی تا قطب صاحب، میں محدود کرکے مسلمانوں کے حقوق (فارسی زبان، تقرر قاضیان وغیرہما) کی حفاظت اپنے ذمہ لی۔ شاہ عالم کے قتل و جلاوطنی میں اشتعال کا اندیشہ تھا اس لئے معاہدہ ہی کو مناسب سمجھا گیا۔

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کے انتقال اور اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی کے موقعہ پر شہر و قلعہ پر ہی نمائشی حکومت باقی رکھی گئی یہی حالات تھے جن سے متاثر ہوکر خاندان ولی اللہی کے چشم و چراغ، سرگروہ علماء و صلحاء شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ہندستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیدیا تھا۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی کے پوتے زماں شاہ نے ہندستان پر حملہ کیا مگر ایران کی بغاوت کی وجہ سے لدھیانہ ہی سے کابل کو پلٹنا پڑا۔ جاتے جاتے رنجیت سنگھ کو پنجاب کا گورنر بنا تا گیا۔ بعد میں اس نے مستقل حکومت کا اعلان کرکے ملتان، کشمیر اور سرحد کے تمام اضلاع پر قبضہ جمایا۔

اس طرح اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں چار طاقتیں نمایاں رہیں۔

(۱) مرہٹے، صوبہ بمبئی، گجرات، صوبجات متوسط، اور راجپوتانہ پر قابض

ساکرستر دار کے دلوں کو عملی کر ڈالا پر پوتے محمد شاہ رنگیلے کی رنگ رلیوں
سے سارا زمانہ واقف ہے ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۸ء میں
"شامت اعمال ما ایں صورت نادر گرفت"
نادر شاہ درانی کا قتل عام بھی اس کا شاہد ہے۔
اس سے مجاہدانہ جذبہ اور جفاکشی کا حوصلہ جاتا رہا تھا عیش و عشرت
کی گرم بازاری نے امور سلطنت سے غافل بنا دیا تھا طوائف الملوکی
کا دور دورہ ہو جانا قدرتی امر تھا۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما
بانفسھم کا فرمان صریح اپنا رنگ لایا۔ ایک غلامی برضا و رغبت
اختیار کر لی تھی دوسری انسانی دعیر ملکی غلامی اس کے پاداش میں بہ جبر و
اکراہ سر پر مسلط کر دی گئی۔ اس طرح صدیوں کی حمی حمائی سلطنت اور
حاکمانہ عزت و سطوت کا ۱۸۵۷ء میں خاتمہ ہو گیا۔ حکہ انگریزوں نے
پلاسی کا میدان عیاری یا بہادری سے جیت کر بنگالہ میں قدم جمالئے
اس کے کچھ عرصہ بعد شاہزادہ عالی گوہر عرف شاہ عالم سے صوبہ بہار و
بنگال کی دیوانی بمعاوضہ اکیس لاکھ روپیہ سالانہ حاصل کر لی جس کی
رو سے الہ آباد سے بنگال و آسام کے آخری کنارے تک انگریزی
تسلط باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا۔ میر جعفر نے بھی اس سلسلے میں اپنا پارٹ
خوب ادا کیا۔

دو جلیل القدر پیغمبروں کی اُمت کی تاریخ ہمارے سامنے ہے قوم موسیٰ
اور قوم ابراہیم علیہما و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام کے اعمال و کردار
عہدِ نکبت و مذلت میں کتنے بدل چکے تھے۔ ان دونوں برگزیدہ ہستیوں
نے اپنی امتوں کے دماغوں میں خدا پرستی کی تعلیم راسخ کر دی تھی۔ بڑی بڑی
مصیبتیں اُٹھا کر، آلام کا شکار ہو کر فرعون و نمرود جیسے دعویداران اُلوہیت
اور جابر و ظالم بادشاہوں کا مقابلہ کر کے قوموں کے سامنے زندہ مثال
اور نمونہ بنے تھے۔ جو چیز تکلیف و دشواری سے حاصل ہوتی ہے قابل وقعت
اور مستحق عزت ہوا کرتی ہے۔ جب عہدِ اقبال ختم ہو کر بنی اسرائیل اور
قوم ابراہیم پر دورِ ادبار مسلط ہوا تو خدا پرستی کی جگہ گوسالہ پرستی اور بت پرستی
نے لے لی۔ محاسن اخلاق کے بجائے بدکرداری اور سوءِ اعمالی نے قبضہ جمایا
خدائی خطاب اِنی فضلتکم علی العالمین سلب کر کے ضربت علیہم الذلۃ
والمسکنۃ کا لقب دیدیا گیا انسان کے لئے سب سے بڑی تباہی غلامی ہے
یہ غلامی کسی اُسی جیسے انسان کی ہو یا شہوت رانی و ہوس پرستی کی!
عالمگیر اورنگ زیب نور اللہ مرقدہٗ کے بعد شاہان مغلیہ بھی عیش و ہوس
پرستی کے غلام بن چکے تھے۔
اس مجاہد متقی بادشاہ کے پوتے جہاندار شاہ کا تخت سلطنت پر بیٹھ کر
سب سے پہلا کارنامہ یہ تھا کہ اپنی آشنا رنڈی کے بھائی کو دہلی کا کوتوال

آزاد اس کی روشن و تاساک مثالیں ہیں۔

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

آخرالذکر اگرچہ ہندستان کے بجائے مکہ مکرمہ میں ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے لیکن ہیں تو ہندی نژاد اور پھر ہوش و آگہی کے زمانے میں ہندستان آ بھی گئے تھے۔ جوانی بھی یہیں گذری اور اب بڑھاپا بھی یہیں گذر رہا ہے، اسی لئے ہندستانی ہی کہا اور سمجھا جاسکتا ہے۔

علامہ کا دور اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کا دور تھا ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج قایم ہوچکا تھا۔ ہندستان بیرونی طاقت کا غلام بن چکا تھا بادشاہ دہلی کی حالت کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتی تھی۔

قوموں کے عروج و زوال کی یہ داستاں بھی کتنی المناک ہے کہ زمانۂ اوج و بلندی میں بے شمار خوبیاں پیدا ہوجایا کرتی ہیں اور دورِ زوال میں خوبیوں کا پیدا ہونا تو درکنار، جو خاص، مذہبی و قومی و ملکی خصوصیات کا درجہ رکھتی ہیں وہ یا تو فنا ہوجاتے ہیں یا اُن کی شکل و صورت مسخ ہوجاتی ہے۔ برائیاں جونک بن کر چمٹ جاتی ہیں اس سے اولوالعزم پیغمبروں کی امتیں بھی محفوظ نہ رہ سکی ہیں۔

بحث ومناظرہ

ایرانی مجتہد سے علامہ کے صغر سنی میں مباحثہ کا حال مختصراً گذر چکا ہے۔ قدرت کی طرف سے ذہن رسا اور طبع وقاد لے کر دنیا میں آئے تھے۔ جس نے تیرہ برس کی عمر میں تمام علومِ درسیہ اور حفظِ قرآن مجید سے فارغ ہوکر مسندِ درس کو رونق بخشنا شروع کردی ہو اسکی ذہانت اور ما فوق الفطرت طباعی کا کیا ٹھکانا ہوسکتا ہے۔ یہ عمر تو بچوں کے کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے۔ غلامستانِ ہند میں اس عمر کے بچے گلی کوچوں میں شور مچاتے، گالیاں بکتے اور کیچڑ اچھالتے نظر آتے ہیں۔ خصوصاً نونہالانِ قوم مسلم کی حالت ہر مقام پر دیدنی ہے۔ اس قسم کی تمام بیہودگیوں میں اختراع وایجاد کے وہ جوہر دیکھنے میں روزانہ آتے رہتے ہیں۔ کہ توبہ ہی بھلی!

ان نونہالانِ عزیز کو کیا معلوم کہ اسی غلام ملک میں دورِ اقبال و عروج میں نہیں عہدِ زوال وپستی میں ایسے بچے بھی پیدا ہوچکے ہیں جو تمام سامانِ عیش وعشرت اور جاہ وحشم کی موجودگی میں بھی اسلامی شان اور آبائی آن بان کو چار چاند لگاتے رہے اور فلکِ علم وعمل پر شمس و قمر بن کر چمکا کئے۔ پچھلی صدی میں علامہ اور موجودہ صدی میں مولانا ابوالکلام

بے سروسامانی کے باوجود شاہانہ دماغ اور امیرانہ شان باقی تھی۔ خدام
اور حلقہ بگوشوں کا اجتماع رہتا تھا۔ خادم حسن طالب علم سے ناراض ہو جاتے
مولانا سے شکایت کر دیتے۔ مولانا مغلوب الغضب بھی تھے فوراً
حلقۂ درس سے نکالدیتے تھے۔ اور ترکِ درس کی اجازت معافی تک
نہ ہوتی تھی عرب و عجم کے قدرداں اور شوقین طلبہ جو ایک سبق کی
آرزو میں ہفتے اور مہینے گذار دیتے تھے یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ
اس نعمت عظمیٰ سے ایک دن بھی محروم رہیں حسب استطاعت
خادم متعلق کو خوش کرتے وہ سفارش کر کے عفوِ تقصیر کراتا۔ مولانا
برکات احمد چونکہ مدارس میں دوسرے طلبہ سے ممتاز تھے اس لئے
ان کے لئے یہ مصیبت آئے دن آتی رہتی تھی۔

یہ دو ایک مثالیں یہ سمجھانے کے لئے پیش کی ہیں کہ اس خاندان
کا طریقۂ تعلیم ہی ایسا تھا کہ شاگرد گرویدہ اور اسیر بے دام ہو جاتا
تھا۔ قدردانانِ علم ہزار ذلتوں کے باوجود بھی اس آستانۂ عالیہ سے
روگردانی کفرِ تعلیمی سمجھتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ دوسری جگہ یہ
تسکین خاطر اور اطمینانِ قلب حاصل ہو بھی نہ سکتا تھا۔

مولانا امجد علی اعظمی) کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ استاذزادہ مولانا عبدالحق کا ملازم و خادم لالو جب کبھی جونپور پہنچ جاتا تھا اور مولانا اس کی آواز سن پاتے تھے تو پیرانہ سالی اور ضعفِ بصارت کے باوجود تعظیم کو کھڑے ہو جاتے۔ کھانا ساتھ کھلاتے اور سفر خرچ وغیرہ دیکر عزت و مسرت کے ساتھ رخصت فرماتے۔

مولانا حکیم برکات احمد بہاری ٹونکی طبیب خاص ریاست ٹونک۔ (استاذِ حضرت الاستاذ مولانا اجمیری مرحوم) کو زمانۂ تعلیم و قیام خیرآباد میں اپنے استاذ گرامی مولانا محمد عبدالحق کے خدّام کو بسا اوقات پورے مہینے کے مصارف کی رقم نذر کر دینا پڑتی تھی۔ اور ٹونک سے دوسری بار روپیہ منگانا پڑتا تھا۔ مولانا حکیم دائم علی صاحب بہاری ریاست کے طبیب خاص تھے اور سو روپیہ ماہانہ مصارف کے لئے بیٹے کو روانہ کرتے تھے اس کے علاوہ اکثر رقمیں آتی رہتی تھیں۔

علامہ خیرآباد کے رؤسا میں سے تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی شورش میں بغاوت کے الزام میں سزائے عبور دریائے شور کے ساتھ ضبطی جائداد بھی ہو چکی تھی۔ مولانا عبدالحق چونکہ رئیس بن رئیس بن رئیس تھے اور ناز و نعم کی گود میں پرورش پائی تھی۔ ہاتھی اور پالکی پر بیٹھ کر حصول علم کیا تھا۔ شاہزادگانِ دہلی کے ساتھ قلعۂ معلی میں کھیلے کودے تھے۔

مولانا بحر العلوم ادرنانی کے والد ماجد تھے۔
علامہ کی تصانیف سے ماندانی طریق تعلیم اور طرز تدریس صاف نظر آتا ہے عام طور سے اساتذہ کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ طالب علم سے عبارت پڑھوا کر تحت اللفظ ترجمہ کرادیا پھر کچھ مطلب توضیح کے لئے بتا دیا گیا۔ حضرۃ العلامہ مفتی محمد لطف اللہ علیگڈھی کے متعلق مشہور ہے کہ ترجمہ ایسا کراتے تھے کہ مطلب سبق ادا ہونے کے ساتھ ساتھ سارے اعتراضات وشبہات بھی دور ہو جایا کرتے تھے
مولانا عبدالحق ایک بار حیدرآباد میں مفتی صاحب کی ملاقات کو پہنچے تو سلسلۂ درس جاری تھا مفتی صاحب کے اس کمال کو دیکھ کر بیحد تعریف کی سلسلۂ خیرآباد میں عبارت پڑھوا کر خلاصۂ مطلب بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ترجمہ کرا کے لفظی مباحث کے بجائے تحقیق مسائل پر زور دیا جاتا ہے یہ طریقہ زیادہ نافع اور باعث تسکین خاطر طلبہ ہے اسی طریہ تعلیم اور شفقت کا یہ نتیجہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد کا عاشق و دلدادہ نظر آتا ہے ایک حال نثار مرید کو اپنے پیر سے اتنی ہی عقیدت ہو سکتی ہے جتنی سلسلۂ خیرآباد کے تلامذہ کو اپنے اساتذہ سے ہوا کرتی ہے۔
علامہ کے شاگرد رشید مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری (استاد مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و

تھے ؟ معلوم ہوا کہ آئے تھے وہ صفحہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس صفحہ کو بجنسہ رہنے دیا۔ (یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس مقام کی عبارت ہے) اس حاشیۂ قاضی سے حضرت الاستاذ مولانا اجمیری مرحوم کو عشق تھا۔ سفر و حضر ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

مولانا حکیم احمد علی خیرآبادی فرماتے ہیں کہ ایام طالب علمی میں قاضی مبارک کا جتنا سبق ہم پڑھتے تھے اس کے متعلق پورا حاشیہ دیکھ ڈالتے تھے۔ خواہ کتنا ہی وقت صرف کرنا پڑتا۔ بعض دن آٹھ آٹھ ورق دیکھنا پڑتے تھے۔

اس حاشیہ کی خوبی یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب سے فلسفۂ یونان کو اپنایا ہے اس وقت سے لے کر علامہ کے عہد تک، متقدمین و متاخرین و معاصرین کے درمیان جو مسائل، مناظرہ و مکالمہ و مباحثہ کا اکھاڑا بنے رہے ہیں۔ ان پر مجتہدانہ انداز میں تبصرہ فرمایا گیا ہے۔ جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم و تحقیق کا دریا موجیں مار رہا ہے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ یہ حاشیہ، علوم معقولات کا فتاویٰ ہے۔

مولانا عبدالحق فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد ماجد (علامہ) اور مولانا عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی بن ملا نظام الدین سہالوی صاحب درس نظامیہ کے درمیان "عام خاص من وجہٍ" کی نسبت ہے۔ معقولات میں تو مادۂ اجتماع ہے۔ فقہ اور ادب میں مادۂ افتراق پایا جاتا ہے۔ اول کے ماہر

اس حلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساری تصانیف میں حاشیۂ قاضی پر علامہ کو کتنا فخر تھا اور ساری اولاد میں مولانا عبدالحق پر کتنا ناز تھا، کامل باپ کے کامل بیٹے کا انداز بھی دیکھ لیجئے۔ علامہ کے حاشیۂ قاضی کے بعض مسائل کی تشریح کے لئے مولانا عبدالحق سے اصرار کیا گیا مولانا نے ایک ضخیم حاشیہ از سر نو لکھ ڈالا (جو بعد ہوئی مولانا حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی نے چھپوایا تھا) لیکن علامہ کے حاشیہ پر قلم اٹھانا سوء ادبی میں داخل سمجھا اسی طرح نواب صاحب رامپور کے شدید اصرار پر علامہ کے نامکمل حاشیۂ افق المبین کی تکمیل سے گریز کرتے ہوئے فرمایا۔

یہ ہو سکتا ہے کہ حاشیۂ قاضی کی طرح دوسرا حاشیۂ افق المبین بھی

لکھ دوں لیکن اس میں اصادہ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگانا ہے۔

ویسے تو مولانا عبدالحق کی قابلیت کا اندازہ اس سے لگایئے، مولوی حاجی ظہیر احمد فاروقی حیدرآبادی کا بیان ہے کہ میں نے مولوی عبدالعزیز اور لالو ملارم مولانا عبدالحق سے سنا ہے کہ جب علامہ قاضی کا حاشیہ تصنیف فرما رہے تھے تو ایک روز کسی ضرورت سے اٹھ کر عبارت یوں ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ مولانا عبدالحق جن کی عمر اس وقت ۱۴ سال تھی باپ کے کمرے میں داخل ہوئے اور عبارت کے آگے ایک صفحہ اپنے قلم سے تصنیف کر گئے جب علامہ نے آکر دیکھا تو دریافت کیا کہ کیا اس مکان کمرے میں آئے

(۱۱) بارہ مذاہبِ معلوم کا بیان۔
(۱۲) بداہۃ ونظریۃ کے صفتِ علم و معلوم ہونے کی تحقیق۔
(۱۳) تحقیقِ موضوع علم
(۱۴) معقول ثانی کی لاجواب بحث
(۱۵) تحقیق ظرفِ اتصاف۔
(۱۶) تحقیق حیثیتِ موضوع۔
(۱۷) بیان امہات مطالب
(۱۸) تحقیق ہل
(۱۹) تحقیق قضیۂ زید معدوم

(۲۰) النسبۃ تامہ کے علاوہ قضیہ میں دوسری نسبت کا بیان
(۲۱) تعداد اجزاء قضیہ۔
(۲۲) بیان موردِ قسمۃ
(۲۳) بحث مفصل بابت متعلق تصدیق
(۲۴) بحث وجود ذہنی اور شبہات کے جوابات۔
(۲۵) جاعل کی طرف احتیاج کی علت امکان ہے یا حدوث
(۲۶) بحث کلی طبعی۔

جزیرۂ انڈمان میں بعض اسیر فرنگ علماء نے دریافت کیا کہ ہندستان میں کیا یادگار چھوڑی ہے؟ فرمایا دو یادگاریں چھوڑ آیا ہوں ایک حاشیہ شرح سلّم[۱] قاضی مبارک اور دوسری یادگار برخوردار عبدالحق۔

---

[۱] یہ حاشیہ اب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ جب چھپا تھا تو دو روپیہ قیمت تھی جنگ سے قبل پندرہ بیس روپیہ میں ملتا تھا بھی غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ خود میں نے اطلاع ملنے پر ۱۹۵۵ء میں دہلی سے بذریعہ تاجر پچیس روپیہ میں منگایا تھا۔ اور اب تو ملنا ہی دشوار ہے۔ ۱۲۔

کو باتی یاس کر دیا ہے۔ اس بحث کو علامہ نے حسب ذیل الفاظ میں شروع کیا ہے۔

"الثالث دھو مما دھب الیہ قوم قدماء الیونانیین و احتارہ بی زماننا من اھل الفرنج دھم یزعمون ان الارض تتحرك بالاستدارۃ حول المرکز من المغرب الی المشرق وھی الحرکۃ الیومیۃ التی بسببھا تری الکواکب طالعۃ وغاربۃ فیظھر من جانب المشرق من الکواکب ما کان محجوبا عنا محلا تھا الی ان قال وھذا الرائی ایضا باطل بوجوہ" الخ

(ہدیہ سعیدیہ)

حاشیۂ شرح سلم قاضی مبارک کی اہمیت اس کے معرکۃ الآراء مباحث کی فہرست سے کیجئے۔

(۱) تحقیق لفظ سبحان
(۲) علم باری میں تمام مذاہب پر تنقید اور احقاق مذہب صوفیہ
(۳) جعل بسیط کا احقاق۔
(۴) تحقیق معنی بحث واتفاق۔
(۵) بحث مقدمۃ العلم ومقدمۃ الکتاب
(۶) تحقیق مقسم تصور وتصدیق۔
(۷) بیان حصول الاشیاء بانفسہا وباشباحہا۔
(۸) علم کے تیرہ مذاہب کا بیان
(۹) تحقیق متعلق تصدیق
(۱۰) بحث اجتماع مثلین

گئی ہے۔ لیکن عنصریات میں شہبازِ قلم کی بلند پروازی کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔ سعادتمند فرزند کی مناسبت ہی سے ہدیہ سعیدیہ نام بھی رکھا گیا ہے نواب محمد سعید خاں والیٔ رامپور کے نام کا لحاظ بھی ضمناً پیش نظر تھا۔ اس کتاب میں زمین کی حرکت پر کافی دلائل قایم کرکے موجودہ سائنس کی تحقیقات کو غلط ثابت کیا ہے۔

اس دور میں زمین کی گردش کا مسئلہ موجودہ تحقیق کی رو سے اتنا عام ہوگیا ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانا اپنی نادانی کا اقرار کرنا ہے۔ اسکول کے ابتدائی طالب علم سے لے کر یونیورسٹی کے گریجویٹ اور یورپ کے بڑے سے بڑے سائنسداں تک سب اسی رنگ میں رنگے نظر آئیں گے۔

اہلِ مغرب جو کچھ کہتے ہیں یہ ان کی تحقیق ہے۔ لیکن ہندستان کورانہ تقلید ہی میں مبتلا ہے۔ علامہ فضل حق کے کانوں میں یہ صدا پہنچی۔ انگریزی اقتدار ملک میں اپنے قدم جما چکا تھا۔ انگلش علوم و فلسفہ کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ موصوف کے لئے یہ کوئی نئی آواز نہ تھی۔ قدمار فلسفہ میں ایک گروہ اس کا قائل ہو چکا تھا۔ جو اُس دور میں ناقابلِ التفات سمجھا گیا تھا صدیوں کے بعد پھر یورپ کی سرزمین سے یہ آواز بلند ہوئی۔ چونکہ علامہ کے نزدیک یہ مسلک غلط تھا، مرعوبیت کے تمام قید و بند توڑ کر ہدیہ سعیدیہ میں شرح و بسط کے ساتھ حرکتِ زمین کو باطل کیا ہے اور مخالفین کے دلائل

حاشیہ سلم قاضی مبارک[1] کی جو شان ہے اس سے طلبہ و علماء بخوبی واقف ہیں
ہدیہ سعیدیہ آج تک مدارس ہند و بیرون ہند میں داخل نصاب ہے۔ ہندوستان
میں متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں مصر میں بھی چھپ چکی ہے خلف الرشید
مولانا عبدالحق کو ہدیہ درسی آتے جاتے وقت ہاتھی پالکی میں جو سبق دیئے
جاتے تھے ہدیہ سعیدیہ انہیں کا مجموعہ ہے۔ علامہ روزانہ ایک سبق تحریر
فرما لیتے تھے وہی راستہ میں صاحبزادے کو پڑھا دیتے تھے فلکیات تک
یہی سلسلہ رہا جب معتدبہ حصہ ہو گیا تو تلامذہ نے کتاب کی تکمیل پر اصرار
کیا۔ علامہ نے طلبہ کی آرزوؤں کو پامال نہ کرتے ہوئے تصنیفی حیثیت سے
قلم اٹھایا۔ اہل علم بالعلم الاجسام اور عنصریات کے اس فرق کو بخوبی محسوس
کر سکتے ہیں فلکیات تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ مبتدیوں کے لئے کتاب لکھی

[1] قاضی مبارک بن قاضی دائم ادہمی گوپاموی سلطان ابراہیم بن ادہم کی اولاد سے ہیں۔ ابتدائی
تعلیم اپنے والد مولانا دائم ادہمی اور قاضی شہاب الدین گوپاموی سے پائی مولوی حکیم عبدالحی مرحوم
نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں "دلق بالعلم فی عصر الشیخ القاضی شہاب الدین الگوپاموی" پھر آباد جاکر حاجی محمد
صفت اللہ محدث سے سند حدیث حاصل کی پھر دہلی پہنچکر میر زاہد بن سید اسلم ہروی سے معقولات کی تکمیل
کی۔ مولانا فضل امام خیرآبادی امد نامہ میں لکھتے ہیں قاضی مبارک دہمیر سالہ محدث عالی داشت و در
امور عامہ دانی مشہور بود اول کسے کہ حاشیہ بر میر زاہد نوشت و سلم را شرح کرد او بود مبتحر طبیعہ
ماتر را دراست اذعادت شرح سلم پیروی میر استاد کردہ ۱۱۶۲ھ میں بعہد احمد شاہ بادشاہ دہلی
میں انتقال ہوا "حیف بہا حاشیہ" مادہ تاریخ ہے۔ گوپامؤ کر حامد کے مدرسہ میں دفن کئے گئے۔
قاضی محمد امیر اور قاضی حکیم علی بہار دو صاحبزادے تھے آخر الذکر اہل علم سے تھے

تصانیف

علامہ نے درس و تدریس تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا خاص اور اہم مجبوریوں کے سوا کبھی اس سے تساہل نہ برتا۔ علامہ کی تصانیف درجنوں ہیں۔ جن میں مشہور حسب ذیل ہیں۔

(۱) الجنس الغالی شرح جواہر العالی
(۲) حاشیہ افق المبین [۱]
(۳) حاشیہ تلخیص الشفا
(۴) حاشیہ شرح سلم قاضی مبارک
(۵) الہدیہ السعیدیۃ
(۶) رسالہ تشکیک ماہیات
(۷) رسالہ کلی طبعی
(۸) رسالہ علم و معلوم
(۹) روض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود۔
(۱۰) رسالہ قاطیغوریاس
(۱۱) رسالہ تحقیق حقیقۃ الاجسام
(۱۲) رسالہ ثورۃ الہندیہ
(۱۳) قصائد فتنۃ الہند
(۱۴) مجموعۃ القصائد
(۱۵) امتناع النظیر
(۱۶) تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی۔

چار پانچ مصنفات کے سوا سب غیر مطبوعہ ہیں۔ ہدیہ سعیدیہ اور

---

[۱] یہ حاشیہ علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ۱۶/۸۵ نمبر پر سبحان اللہ اور ذخیل لائبریری محفوظ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں محفوظ ہے۔ ۱۲۔

ادریس علیہ السلام صاحب معجزات منطقیہ تک پہنچتا ہے ان میں سے ہر ایک
اپنے وقت کا امام اور یگانۂ روزگار تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح
ارسطو خاتم حکمائے متقدمین یونان تھا اسی طرح علامہ فضل حق خاتم حکمائے متقدمین
ہندستان تھے۔ اور جس طرح ارسطو کے بعد سارے حکمائے یونان اسی کے
خوشہ چیں ہیں اسی طرح فضل حق کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو کر مقلدین
کا سلسلہ جاری ہوا۔ اور اب تو اس دورِ کساد بازاری علومِ قدیمہ اور
ناقدریٔ شاہاں و امراء میں مجتہد درکنار کسی کامل مقلد کا پیدا ہونا بھی دشوار
ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۴) ملا ساری صد سلہ تھے علمی مباحثہ بھی دونوں میں رہا حضرت شیخ محب اللہ
الہ آبادی سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت ہوئے ۱۱۳۴ھ میں انتقال ہوا بنارس میں مدفون ہیں
ملا نظام الدین کے دادا استاد مولانا دانیال چوراسی تھے۔ ان کے استاد ملا عبد السلام دیوی تھے
موصوف نے تحصیل علم کی منزلیں مکان میں طے کرنے کے بعد لاہور پہنچکر پیر ہمنام ملا عبد السلام
لاہوری کی صحبت میں زندگی گذاری۔ مدتوں پڑھا تھا استاد نے ان کی تصدیق کی شاہجہان بادشاہ
نے منصب امارت و عسکر عطا کیا آخر میں لاہور پہنچکر سلسلۂ درس جاری کیا تفسیر بیضاوی پر حاشیہ
لکھا

ملا عبد السلام لاہوری معدن منقولات و معقولات تھے فنون ادب فقہ اور اصول میں دستگاہ
کامل رکھتے تھے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ بھی لکھا ۹۰ سال کی عمر میں ۱۰۳۷ھ میں انتقال ہوا
موصوف امیر فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ شاگرد خواجہ جمال الدین محمود و مولانا کمال الدین
شروانی و ملا کرد و میر غیاث الدین منصور شیرازی کے نامور شاگرد تھے۔ امیر موصوف کا ذکر پہلے
گذر چکا ہے۔ ۱۲

ان سے معلم ثانی ابو نصر فارابی المتوفی ۳۴۳ھ مطابق ۹۵۴ء تک معلم ثانی سے ارسطاطالیس یونانی استاد سکندر ذوالقرنین تک اور ارسطو سے حکیم ثانی فیثاغورس یونانی شاگرد اصحاب حضرت سلیمان علیہ السلام تک اور ان سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۳)

عالم کامل امام عصر استاذ جہاں | طائر روحش بہ سیر جنۃ الماویٰ شتافت
سال تاریخ وفات او بطور تعمیہ | گفتہ شد ملا نظام الدین بفردوس رفت

نصاب درسِ نظامیہ یہ انہی کی طرف منسوب ہے۔ فرنگی محل لکھنؤ کے خاندانِ علماء کے آپ ہی مورث اعلیٰ ہیں۔ ملا نظام الدین کے والد و استاد ملا قطب الدین شہید سہالوی تھے۔ سہالی مضافات لکھنؤ میں شیخ زادگان کی قدیم بستی ہے یہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ مشہور میزبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے ہیں۔ اس بستی میں عثمانی شیخ زادگان بھی آباد تھے۔ ملا دانیال جو اسی شاگرد ملا عبدالسلام دیوی اور قاضی گیا سی سے تلمذ حاصل ہے۔ آخر الذکر ہی سے بیعت بھی ہوئے تھے۔ یہ شیخ محب اللہ الہ آبادی کے تلمیذ و خلیفہ تھے۔ ملا شہید کا دریائے فیض پورے زور شور کے ساتھ جاری رہا۔

اکثر علماءِ ہندستان کا سلسلہ موصوف تک پہنچتا ہے۔ شیخ زادگانِ عثمانی نے شرکت زمینداری کی نزاع کی وجہ سے اسد اللہ خاں زادہ سیفی پور سے ساز باز کر کے ملا قطب الدین پر شبخون مار کر شربت شہادت نوش کرایا۔ ۱۱۰۳ھ میں یہ حادثہ ہوا قتل کے بعد مکان میں آگ بھی لگا دی۔ اثاث البیت کے ساتھ ملا شہید کی لاجواب تصنیف حاشیہ شرح عقائد دوانی بھی نذر آتش ہو گئی "قطب عالم شد شہید اکبر" ۱۱۰۳ھ مصرع تاریخ ہے۔

ملا نظام الدین کے دوسرے استاد حافظ ملا امان اللہ بن نور اللہ بن حسین بنارسی ہیں معقول و منقول کے امام اور علم اصول فقہ میں شہرتِ تام رکھتے تھے۔ بیضاوی، عضدی، تلویح، شرح مواقف، شرح حکمۃ العین، شرح عقائد دوانی، رشیدیہ پر حواشی لکھے۔ محکم الاصول کے نام سے اپنی ہی تصنیف علم اصول کی شرح بھی لکھی۔ مسئلہ حدوث دہری پر ملا محمود جونپوری نے میر باقر داماد استرآبادی پر معارضہ کیا۔ اس پر محاکمہ لکھا۔ ملا محب اللہ بہاری صاحب سلم و مسلم جب لکھنؤ میں قاضی تھے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۹۵ پر)

شرح تجرید تک اور ان سے سید شریف ابوالحسن علی علامہ جرجانی المولود
۷۴۰ھ مطابق ۱۳۳۹ء المتوفی ۸۱۶ھ مطابق ۱۴۱۳ء تک پہنچتا ہے علامہ
جرجانی سے شیخ الرئیس بوعلی ابن سینا المتوفی ۴۲۷ھ مطابق ۱۰۳۷ء تک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۲) وفات کے وقت تلامذہ و اصحاب کو بلا کر اپنے مذہب حنفی طریق چشتی اور عقائد سنی پر گواہ بنایا۔ شعر پڑھا

دامن دو حرف آمد ایں راہ   اسعد محمد محمد اسعد

اس کے بعد کلمہ طیبہ پڑھ کر ۴۰ سال کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئے۔ شاگرد پر بڑی شفقت کرتے تھے اسی شفقت نے شاگرد کو مرتبہ کمال تک پہنچایا تھا احاطہ درگاہ مخدوم شیخ سعد الدین خیرآبادی میں مدفون ہیں۔ ملا اعلم سندیلوی کے استاد مولانا شیخ کمال الدین و ملا نظام الدین سہالوی کے ہی اعمام سے ہیں فتحپور میں (جو سہالی سے تھوڑے سے فاصلہ پر واقع ہے) مخدوم زادگان کے یہاں شادی کی اسی جگہ قاضی بھی ہوئے ان کے وجود سے وہیں امامت گری ہو گئے۔ ملا نظام الدین کے اوائل تا آخر شاگرد تھے صاحب مآثر الکرام کے زمانے میں حیات تھے یہاں آپ وفات کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا علم کلام میں العروۃ الوثقی اور حاشیہ شرح عقائد جلالیہ تصانیف ہیں ملا اعلم نے ملا نظام الدین سے بھی پڑھا ہے

ان دونوں بزرگوں کے استاد ملا نظام الدین سہالوی صاحب درس نظامیہ تھے پہلے کے قصبات میں تحصیل علم کر کے حافظ شیخ غلام نقشبند لکھنوی سے بقیہ تحصیل کتب فرمائیں لکھنؤ ہی میں مقیم ہو گئے۔ تدریس و تصنیف میں مشغول ہو کر بڑی شہرت و عزت کے مالک ہوئے فارغ التحصیل علماء حاضر ہو کر شریک حلقہ درس ہوتے حضرت مخدوم شیخ عبد الرزاق بانسوی سے بیعت ہوئے۔

حاشیہ صدرا اور شرح مسلم الثبوت تصنیف کیں صاحب مآثر الکرام سے ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۳ھ کو لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی ۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ کو سفر آخرت اختیار فرمایا
میر غلام علی آزاد بلگرامی نے تاریخ کہی   (باقی حاشیہ صفحہ ۹۴ پر)

۳- مولانا عبدالواجد کرمانی خیرآبادی — المتوفی ۱۲۱۶ھ

۴- ملا محمد اعلم سندیلوی

۵- مولانا کمال الدین سہالوی

واستاذ الکل فی الکل ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی — " ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء

۶- ملا قطب الدین شہید سہالوی — " ۱۱۰۳ھ

وملا امان اللہ بنارسی — " ۱۱۳۲ھ

۷- مولانا دانیال جوراسی

۸- مولانا عبدالسلام دیوہی

۹- مولانا عبدالسلام لاہوری — " ۱۰۳۷ھ

۱۰- امیر فتح اللہ شیرازی — " ۹۹۷ھ

مولانا دانیال جوراسی وغیرہم کا سلسلہ علامہ جلال الدین محمد اسعد محقق دوانی المتوفی ۱۵۰۲ء ۹۰۸ھ از زمانہ سلطان ابوسعید صاحب شرح ہیاکل و حاشیہ

سلہ علامہ خیرآبادی کے سلسلۂ اساتذہ کے اکبری عہد تک کے حالات مختصراً درج کیے جاتے ہیں۔ والد ماجد مولانا فضل امام اور ان کے استاد مولانا عبدالواجد کرمانی خیرآبادی کا ذکر اپنے مقام پر گذر چکا ہے مولانا کرمانی کے استاد ملا اعلم سندیلوی اپنے عہد کے امام فن تھے تحصیل علم کے بعد دہلی پہنچے محمد شاہ بادشاہ کے مقرب شاہ باسط کے ذریعہ دربار تک رسائی چاہی شاہ باسط نے امتحاناً اپنے بھتیجے سے مناظرہ کرایا کافی بحث و مباحثہ کے بعد مخالف کو زیر کر لیا اور چلتے وقت قیام پر نہ رہے اگر عہد کیا کہ کبھی دنیاوی حاجت کسی کے سامنے پیش نہ کریں گے۔ چار روز رہ کر وطن مالوف سندیلہ آ گئے اور وہیں متوکلانہ زندگی بسر کی۔ شرح صدرا، رسالہ تشکیک، تعلیقات بر میرزاہد ملا جلال، حاشیہ دائرہ، اور لقطۃ اللبیب تصانیف یادگار ہیں

سلسلۂ تلمذ منقولات

۱ علامہ فضل حق خیرآبادی
۲۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث
حضرت شاہ عبدالعزیز محدث
۳۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث
۴۔ ابوالطاہر مدنی
۵ شیخ ابراہیم کردی
۶۔ احمد قشاشی
۷ الشمس محمد بن احمد الرملی
۸ الزین زکریا الانصاری
۹ حافظ ابن حجر العسقلانی
۱۰۔ ابراہیم بن احمد التنوخی
المعروف بالبرہان الشامی
۱۱۔ الشیخ احمد بن ابی طالب الحجاج
۱۲۔ ابوعبداللہ الحسین بن مبارک
الزبیدی البغدادی
۱۳۔ ابوالوقت عبدالاول بن عیسیٰ بن
شعیب بن اسحق السجزی الصوفی
الہروی
۱۴۔ جمال الاسلام ابوالحسن
عبدالرحمٰن بن محمد الداودی۔
۱۵۔ ابومحمد عبداللہ بن احمد
بن حمویہ السرخسی
۱۶ ابوعبداللہ محمد بن یوسف
مطر الفربری
۱۷۔ ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل
بن ابراہیم البخاری۔

سلسلۂ تلمذ معقولات

۱۔ علامہ فضل حق خیرآبادی المتوفی ۱۲۷۸ھ
۲۔ مولانا فضل امام خیرآبادی ″ ۱۲۴۰ھ

سلسلۂ تلمذ

علامہ نے سند حدیث حضرت شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی سے حاصل کی، علامہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی مصنف لمعات واشعۃ اللمعات کے بعد شاہ عبدالرحیم ہی کے خاندان سے یہ بابرکت علم حدیث ہندستان میں پھیلا۔ ملک میں صدیوں سے معقولات کا دور دورہ تھا۔ شاہانِ وقت نے علم معقول کی سرپرستی تو کی تھی لیکن علوم نقلیہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ یہ شاہ صاحبان کا ہی طفیل ہے کہ آج ملک کا گوشہ گوشہ نورِ علم سے معمور ہے اور ہر وادی سے قال اللہ قال الرسول کی صدائیں اٹھ رہی ہیں اس دور میں کتب دینیہ کی کمیابی کا یہ عالم تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث کو تفسیر کبیر یا کسی دوسری کتاب تفسیر وحدیث کے دیکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی تو قلعۂ معلیٰ میں جانا پڑتا تھا۔ بخاری شریف جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ رکھتی ہے اس کے نسخے بھی خال خال ہی پائے جاتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ عربی اشعار شاہ صاحب ہی کو دکھاتے تھے سلسلۂ تلمذ یوں ہے۔

یسا‌بسمیال، واما نامیع عمرہ فی مرات ومسائل او توفیر
وحال، لایتوسم فیہ من العلم طلا متدقضا ہی امراس
تکلمہ مہ محطقصہا، واساطیر مخترعہ مخترعہ مختلفۃ
فی باب الامۃ وھی اکادیب موضوعۃ لاحادیث
مروعۃ، قد سامعہا سا بون طاغون وتناقلہا را وون عادون
یردون کد نات، ویرویہا قرنات، وائمۃ الھدی یشہدون
علیہم بانہم ریادقۃ وسہادات الائمۃ لاشک صادقۃ
ومن نقص اکادیب الاسماء وا باطیل الاخبار لا یستأھل
ان یعد من معاسر العلماء، او من قبیل الاخبار بل ھو
ادون حالا، واخس مآلا، من سمیر یونق فی سرح الملہیات
لتویم امیر، ومن ہازل مطیق، یعتری حرمۃ
تلعیق، تعلیلا لقلب علیل او تطییبا لخاطر رقیق، وحاشا
ان یکون ذلک من العلوم والمعارف، وغایتہ ان یعد
من الملاہی والمعازف۔

من کلام، فی ما لہا من النیام فی نحر کل نحر من اللئام، و رأسہ ان المولی لم یال جہدا فی تحریر روایاتہم، واجتہد جدا فی الارشاد، والتنبیہ علی غوایاتہم، وامعان النظر لتبصیر عمایاتہم، وتصفح کتب علمائہم لاجلاء جہالاتہم ولم یصفح عن صفائح صحائفہم، الی ان دل علی ضلالاتہم، ونکی فی نحور نحاریرہم، بما طعنوا فی تحاریرہم، وابکم السنۃ وقاریرہم بقلب دقاریرہم، برد تقاریرہم، بل یا قاریرہم فاشجی اخلب ائمہم المترفین باشجان من الاشجان والافکار، ولم یذر لدہاتہم الانکار سبیلا الی الانکار، ولم یدع لقال مجال اقال، بل غال کل غال، اوغل فی العلم من ادغال، فتری کل مفتر مفترا، وکل نکر منہم مستنکرا، لا زال مشتاقا الی لقائہ، داعیا بطول بقائہ، لاصلاح مفاسد المبتدعین، وفضوح مکائد المختدعین، وقطعا لدابر المداہنین المتبدعین، وارغاما بالانوف المکابرین المتکبرین، واما ما استکشف عند المولی الجلیل النبیل من حال المزیل الذلیل، فانما ہو خال خال خال وخال، بل شن بال مغطی لبسر بال، متبلی بوبال، غیر ذی خطر وبال، لا یستاہل ان یخطر بخاطر وبال، ولا بان

نوازل الاحداثات، وما علیہا من ذی نفس ونفس الاوهتوه مبارل الاحداثات؛

۵ ذیقعدہ ۱۲۶۷ھ کو مولانا حیدر علی فیض آبادی کو موصوف کی کتاب منتہی الکلام کے موصول ہونے اور اس کے مطالعہ کرنے کے بعد ایک طویل خط میں لکھتے ہیں۔ یہ کتاب مولانا نے ایک شیعی متبحر عالم سبحان علی خاں کے رسالہ مصدرہ ۱۲۴۷ھ کے جواب میں ۱۲۵۰ھ میں لکھی ہے۔ شیعوں کے دلائل قاہرہ اور براہین باہرہ اس میں درج ہیں۔ مولوی سبحان علی خاں سے مولانا اسمٰعیل شہید کے مناظرے بھی لکھنؤ میں رہے ہیں

"کدلک استمرت ادمن لہ المولی علی ناہسال کتابہ، فلمت لنامہ، وسرحت من التی بہ، فیالہا من نعمۃ وافیۃ، سرت منہ مواداتہا و منۃ کافیۃ، اصطنعت منعت مکاناتہا فکان طلوعہ علی قبل تطلع الیہ، وطلاعی ما بید واطلاعی علیہ، اعم من تاثیر طلوع الصباح علی عاشق مہجور، والطف من تاثیر طلوع الصباح فی عاشق دیجور، فاما ماجری المولی الی مرقدہ من توقاند الی العہد الذی کاتبہ باحسانہ وجمانہ، فکانما ھو صلہ احیی الی لقیانہ، فانی مذ طالعت کتابہ الموسوم بمنتہی الکلام، واطلعت علی ماسد

من خلفہ المظلوم بتہمۃ، و یبقی ما کان ادری لی ولا اخفی لتربیۃ
اتیامۃ اسباغا لمنہ واتماما لانعامہ"

سر سید احمد خاں مرحوم نے آثار الصنادید میں علامہ کا ایک خطبہ نقل کیا
ہے۔ یہ خطبہ حضرت الاستاذ مولانا الاجمیریؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ رسالہ
ثورۃ الہند کے آخر میں میرے پاس بھی موجود ہے۔ اس کا کچھ اقتباس
پیش ہے۔

"اما بعد فان الدنیا غرور، مالہا فرور، بل فرورہا مرور،
وظلہا حرور، لا یوازی ہمومہا سرورہا، ولا یوازن خیورہا
شرورہا، ولا تکافی مصافاتہا و آفاتہا، ولا تنادی افراحہا و
اتراحہا، ولا تمحنہا ورّاحہا، ولا یتلافی سمومہا نعیمہا،
ولا سموصہا نسیمہا، ولا تضنکہا رخائہا، ولا زعزعہا رخائہا
ثریا فہا ثمال، ونقصانہا کمال عاقبۃ عافیتہا اوصاب،
وحلوئہا وسلوئہا علاقم او صاب، اولہا حبور و آخرہا
ثبور، وصفائہا غبار، ولقائہا غبور، واہلہا بور، وقصورہم
قبور، کل من عمر فیہا مہوس، وکل ما عمر فیہا مطموس وکل
من الوری وان ثوی، فان مصیرہ الی الثری، مبادیہا آمال
ومنا، وعواقبہا آجال ومنا، ما فیہا صفو عیش الا و یکدرہ

مولانا شیخ احمد الانصاری الیمنی الشروانی صاحب نفحۃ الیمن متوفی ۵ ربیع الاول ... کو وار جمادی الاخری ۱۲۲۶ھ کو ارقام فرماتے ہیں علامہ کے شریک کار سلطنت اودھ اور رفیق خاص و محب مخلص مولانا محمد فیض اللہ الشہید کو ان کے حاسد بھائیوں نے موقعہ پاکر شہید کر ڈالا تھا اس حادثہ واقعہ سے علامہ سخت متاثر ہوئے حکومت میں دادرسی کے لئے کوشاں ہوئے مولانا شروانی کو اعانت مظلوم کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔

"فقد کان المولوی مولوکالہ بلا رہق، واخاله بلا احتماع معمی عرق، وقریبالہ بالمصافات، لا بالمکافات وبسالہ بالحب والوداد، لا بالآباء والاجداد، وحبیبالہ بالصداقۃ والخلال، لا بالاعمام والاخوال دہرا طویلا ین تقاربا بالوداد، وقریبین ساعدا بالاتحاد، والارواح جنود مجندۃ فماتعارف منہا ائتلف، وماتناکر منہا اختلف،۔۔۔۔۔

فرجعت الی السیع المولی، فشلدماں یشکی مطلقی اولی، فعل قیل ان المناسبۃ فی الادب، فوق المقاربۃ فی النسب، فان رق مولانا لسالک متمیع، وسالک متوجع، وجان مرجم ولھعان مسترجع، من علینا باسو المکلوم، ونصل لمظلوم، فالمامول من المولی ان لا یالوجھد الی ان یجاری ادام اللہ ایامہ من ظلم سقمۃ دیوانی

ایک دوسرے خط میں ۵ ربیع الاول ۱۲۷۲ھ کو مولانا خلیل الدین بن نجم الدین الکاکوروی کو تحریر فرماتے ہیں۔

"وبعد فربما اذن عشقت قبل العین، وربما اثرت قبل الیمین، وکم فی الوریٰ من ہائم لطیف سری فی الکریٰ، قبل ان یریٰ، ولولا عجم الشوق فدا تمتلج بسورۃ قبل ابیان وزورۃ، وکم من حبیب یتصبّاہ قبل ان یُریٰ، وکم من لہیب یتلظّی قبل ان یوریٰ، وابعد المتوقفین عن الریب، من الیقن بالغیب، کذلک مولانا ان لم الاقہ فقد نمت باخلاقہ، وان کنت لم ارہ، فقد سمعت خبرہ، وان لم اکن لقیتہ، فقد لقینی صیتہ، وشاقتنی احادیث کمالہ، وان لم اکتحل بلألأ جمالہ، وتیمتنی نوافح عرفہ، ومنائح عرفہ قبل ان تشرفنا منہ بعرفہ، ولعوارف نشرہ، قبل معارف بشرہ، وشغفت بریّاہ، قبل ان یری محیّاہ، ولم یزل ہذا خبر عبدا متہ ظامیا الی الاستمتاع بمنا محمد، وما فتی منذ انبیٔ بانبائہ، یتلمس سبیلا الی لقائہ لیستفیٔ بلألأہ، ویستفی من الائہ، ولکن لم یساعدہ علی ذلک الدھر ولم یساعفہ الزمن ؎

مَا کل ما یتمنی المرء یدرکہ ... تجری الریاح بما لا تشتھی السفن"

مكتوم وثناء مشاع، وعرض مصون وعرض مصلع، السميدع
المتقي الحميد النقا، الراقي من ذرى المجد واعلى مراقي الساقي في
جوار رحمة الله محل نقا، اكرم الله مثواه، وبرلني دار البقا،
وبرد مضجعه سحائب رحمة وسقى، فيالله اي قمر انخسف بعد
البدارة واي بطل انكسف عن ادراكه واي نجم هوى وهو
طالع في وسط سمائه واي نجم جرى وهو طالع في سنوه وبائه،
اهكذا يموت الناس، قبل الاحتضار، اهكذا يردى الناس
وهو ريّان، اهكذا انطرق الموت قبل اوانه، اهكذا يموت
الشب في عنفوانه، اهكذا تتردّى السلالات اهكذا تمتلئ لحسرات
اهكذا يحدث الاحداث في الحدثان ويتجدد، اهكذا
يتفرق الشمل ويتبدد، يا ليت الزفرات المرددة والحيوة
المتمادية، وللدموع المهملة، والانفاس المتصعدة اغنت
من موت فاجع، او شفعت للامل جارع ويا ليت المندوب
رجع وثوب، كلّا ان سكرة الموت سكر ليس له صحو، وظلمة القبر
دجية ليس بعدها صحو، وكذا الدنيا اولها الغفلة وآخرها
لهفة، واولها امل، وآخرها اجل، واولها امنية، وآخرها
منية، واولها سرور عروس، وآخرها مضي ورمس؟

پردۂ خفا میں رہ گئی تھی۔

علامہ اپنے والد ماجد مولانا فضل امام کو اپنے ابن العمۃ مولوی محمد بقا کے انتقال کی خبر سنکر ۲۰ ذیقعدہ ۱۲۳۴ھ کو ایک طویل عریضہ دہلی سے وجانہ لکھتے ہیں۔ اس خط کا ابتدائی کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

"اقبّل ارضا یھوء شمیم ترابھا العتیق، بالمسک الفتیق، والعنبر السحیق، واستلم عتبتہ ھی قبلۃ طلاب التحقیق وارباب التدقیق، فیاتیھا الرحال رجالا، علی کل ضامر بل فج عمیق، من کل بلد سحیق بین یدی الامام الحبر بل القمقام البحر، مولانا الشیخ الخضم الھازیۃ شذراتہ کلامہ لحقل السحر، وقلائد نظامہ بعقود النحر لازال بابہ مقصودا، وفضلہ محسودا، وکرمہ محمودا، وظلہ ممدودا بحرمۃ النبی محمد الامین صلعم۔ وبعد فما ذا یصنع الملوک من حزن دھاہ، وشجن ادھاہ، ونصب شغلہ عن عیشہ والھاہ، وشجوانا وکرب دناہ، وکمد عناہ، ووجد اضناہ، وقلق الیمہ بسکرۃ الموت وادناہ، وجزع بلغ بہ غایتہ فما اغناہ، لما بلغہ نعی اجود من نحاہ ناع، ودعی لہ بالرحمۃ داع، وندبہ حزین لاع، وافضل من وصف بطول باع، وبسط ذراع، واسخی من امّہ معتف وسعی الیہ ساع، واسبق ساع، الی معال ومساع، ذی عطاء

علم وادب پر شمس وقمر بنکر چمک اٹھے تھے۔
مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ انسان کو جب کسی فن پر قدرت کاملہ اور مہارت تامہ حاصل ہوجاتی ہے تو اس کمال کے ظہور کے لئے وقت وموقعہ، فرصت ومہلت اور یکسوئی وفراغت کی ضرورت نہیں ہوتی اہل کمال اکثر بیشتر پریشان حال اور ستمزدہ روزگار رہے ہیں۔ پھر بھی ان کی مؤلفات ومصنفات میں کمالات کے وافر نشانات نظر آتے ہیں۔ اسی کے سمجھانے کے لئے مولانا آزاد کے ادبی کمالات کا ذکر آگیا۔ ان کے ساتھ ہندستان کے جدوجہد آزادی کی تاریخ کچھ اس طرح وابستہ ہوگئی ہے کہ انہیں اس سے ہٹاکر نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس لئے ۱۹۲۲ء اور جنگ عظیم ۱۹۳۹ء کا مختصر تذکرہ بھی کرنا پڑا اب پھر!

قدرے گریم دہم بر سر افسانہ روم

۱۸۵۷ء کے ہولناک واقعات کو پیش نظر رکھئے اور پھر رسالہ نورۃ الہدیٰ اور قصائد فتنۃ الہند ملاحظہ فرمائیے یہ دونوں چیزیں آخر میں درج ہیں اس لئے ان کے متعلق کچھ لکھا گیا ہے۔

صحیح اندازہ مختلف اسباب سخن سے ہی ہوسکتا ہے اس لئے عربی نثر کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ اہل علم علامہ کو ایک فلسفی اور مجاہد کی حیثیت سے جانتے رہے ہیں ادبی عظمت فلسفہ وجہاد سے مغلوب ہوگئی

کی لگن ضرور ہونی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ زندگی کے تمام لذائذ و تمتعات ہیچ ہیں۔ حکایت تشنہ و سراب سے زیادہ نہیں۔ ہاں اگر عیش حیات کی یہاں کوئی حقیقت ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ دو دلوں میں اخلاص و محبت کے جو لمحے بھی اس کے میسر آجائیں۔ زندگی کا حاصل اور عیش دنیا کا سرمایہ ہے۔

ہر آں کو خاطر مجموعہ و یار ہمنشیں دارد
سعادت ہمدم او گشت و دولت ہم قریں دارد"[1]

مولانا آزاد کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حجاز و مصر کی مروجہ تعلیم اور والد ماجد مولانا خیر الدین[2] دہلوی جیسے عالم باعمل اور بزرگ روشن ضمیر کی پُرشفقت تربیت کے فیوض سے تیرہ چودہ برس کی عمر ہی میں بہرۂ وافر حاصل ہو چکا تھا۔ اور ۱۸۹۰ء میں ہندوستان پہنچنے پر اٹھارہ انیس برس کی عمر میں غالب

---

[1] کاروانِ خیال، دوسرا خط ۱۲

[2] موصوف ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد دہلی سے رامپور و بمبئی ہوتے ہوئے مکہ معظمہ کو روانہ ہو گئے۔ علم و فضل اور زہد و بزرگی کا شہرہ ہندوستان کی چار دیواری سے نکل کر ممالک اسلامیہ میں پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ سلطان عبد المجید نے آپ کو قسطنطنیہ بلا بھیجا۔ قیام ترکی کے دوران میں سلطان نے مولانا کی کتابیں اپنے خرچ سے قاہرہ میں چھپوا کر شائع کیں۔ قسطنطنیہ سے واپسی پر آپ نے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کر لی اور مفتی مدینہ منورہ شیخ محمد بن ظاہر وتری کی بھانجی سے شادی کی۔ قیام مکہ کے دوران میں آپ نے اپنے مریدوں سے گیارہ لاکھ روپیہ اکٹھا کر کے نہر زبیدہ کی مرمت کرائی۔ مکہ معظمہ ہی میں مولانا ابو الکلام آزاد ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۔

میں نواب صدر یار جنگ کو لکھتے ہیں۔

"آپ نے ایک بات کیا خوب لکھی ہے کہ خلوص سدا بہار ہے اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک ساعت ابدی ہے کیا کہوں اس جملے نے دل پر کیا اثر کیا اس کلمۂ حق کی تشریح میرے دلِ درد مند سے پوچھئے۔ اکاون برس کی عمر ہو چکی چھ ماہ بعد باون برس پورے ہو جائیں گے گویا انگریزی محاورے میں کہہ سکتا ہوں کہ پچاس کے رننگ سائڈ میں پوری طرح آچکا عام طور پر لوگوں کی ہوش و آگہی کا زمانہ بیس برس کے بعد شروع ہوتا ہے۔

صدر یار جنگ کی کشش خاص نے تیرہ چودہ برس کی عمر ہی میں اس مرحلے سے گزار دیا تھا۔ اس طرح گویا ایک کم چالیس برس کے اندر کارفرمائے غیب کی دستگیریوں نے صدیوں کی مسافتیں طے کرائیں صورت معنی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہوگا جس سے طلب نے تغافل اور آگہی نے پہلو تہی کی ہو۔ اور فکر و عمل کی شاید ہی کوئی بلندی و پستی ہوگی جس کی پیمائش میں قدم نے کوتاہی اور ہمت نے کم جوشی روا رکھی ہو لیکن اگر آپ پوچھیں کہ مدۃ العمر کی اس جہاں نوردی کے بعد زندگی کی حقیقتوں میں سے کیا ہاتھ آیا؟ تو بلا تامل کہوں گا کہ دو باتوں کے سوا تیسری بات کہیں دکھائی نہ دی۔ ایک تو یہ کہ زندگی بغیر مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی اس لئے کسی نہ کسی مقصد

علامہ اور مولانا آزاد میں کئی مناسبتیں ہیں، پہلی[۱] مناسبت تو یہی اعجاز نگاری اور شتھلائے بلاغت ہے۔

دوسری[۲] مناسبت جہادِ حریت و آزادی میں جان و مال کی بازی لگادینا ہے۔ علامہ نے ۱۸۵۷ء میں قلعۂ آزادی کی بنیاد میں خشتِ اوّل فتویٰ جہاد پر دستخط کرکے رکھی تھی۔ مولانا آزاد جو علامہ کے شجرِ علم کے خوشہ چیں[۱] بھی ہیں۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۴۶ء تک مسلسل ۳۴ برس جہادِ سیفِ زبان و قلم جاری رکھکر ۱۹۳۹ء سے فرائض صدارتِ انڈین نیشنل کانگریس انجام دیتے ہوئے ۱۹۴۶ء میں ہندستان کو آزادی کے دروازے تک پہنچاچکے ہیں۔ اس طرح قلعۂ آزادی کی آخری اینٹ لگاکر "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کے مطابق استاذ کی آغازِ تعمیر کو انجام تک پہنچا دیا ہے۔

تیسری[۳] مناسبت یہ ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے علامہ نے تیرہ سال کی عمر میں سندِ تکمیل علوم حاصل کرکے امامِ معقول و منقول بن کر سلسلۂ درس و تدریس جاری کردیا تھا۔ مولانا آزاد بھی اس عمر میں نگار فرمائے غیب کی دستگیریوں سے صدیوں کی مسافتیں طے کرچکے تھے۔ اپنے ایک خط مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۰ء

---

[۱] مولانا نظیر الحسن انبیٹھوی تلمیذ شمس العلما مولانا عبدالحق خیرآبادی خلف علامہ فضل حق کے فلسفہ و منطق میں شاگرد ہیں اور علامہ شبلی نعمانی تلمیذ مولانا فیض الحسن سہارنپوری شاگرد رشید علامہ سے استفادہ کیا ہے۔ ۱۲۔

نوحۂ ماتم ہو یا دردِ فراق کا قصۂ الم چڑیا چڑے کی کہانی ہو یا قلعہ کی شکستہ وکہنہ قبر کی داستان حسرت و ویرانی، گلہائے چمن کا ذکر ریت آرائی ہو یا بلبلانِ گلشن کی کیفیت نغمہ سرائی خدا کی وحدانیت پر دلائل قاطعہ پیش کئے جا رہے ہوں یا پھولوں کی خلقت پر براہین ساطعہ، سب میں اعجاز نگاری کارفرما نظر آئے گی۔

پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

وہ اہل علم حضرات جنہیں آزاد کے سیاسی مسلک سے اختلاف رہا ہے جن میں معتقد رعلما اور محترم پروفیسران کا گروہ بھی شامل ہے انہیں بھی عار خاطر پر سر دھنتے دیکھا ہے وہ بھی آزاد کی علمی قابلیت اور ادبی صلاحیت پر معتقدین و مخلصین کی طرح ایمان رکھتے ہیں۔

والفضل ما شہدت بہ الاعداء

وہ وقت بھی آ رہا ہے جب دنیا غلط فہمی کا شکار زیادہ عرصہ تک نہیں رہے گی۔ اور تاریخ بتا سکے گی کہ یونان کا سقراط، شہر حران کا ابن تیمیہ افغانستان کا جمال الدین، مصر کا محمد عبدہ اور جوہری طنطاوی ہندستان میں بھی ابوالکلام آزاد کی شکل میں مصلح امت بن کر نمودار ہوا تھا

ما شئت قل فیہ فانت مصدق والفضل یقضی والمحاسن تشہد

الہندیہ

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی[۱] کو مخاطب کرکے "کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم" کا سلسلہ شروع کردیتے ہیں۔ اب "غبار خاطر" کے ان خطوط پر نظر ڈالیے۔ "قلعۂ احمد نگر کی تاریخی حیثیت کا بیان ہو یا گرفتاری کی روداد، چینی چاء نوشی کا پُرسرور تذکرہ ہو یا اس کے ختم ہو جانے کا افسانۂ غم، شریکِ حیات کا

---

[۱] موصوف ۲۸ شعبان ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء [illegible] اپنے آبائی قلعہ بھیکن پور میں بوقت صبح پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی محمد تقی خاں ہے۔ آپ کے عم محترم محمد عبدالشکور خاں عرف منجھلے خانصاحب شروانی خاندان کے نامور فرد تھے۔ جود و سخا اور مسافر نوازی میں دور و نزدیک مشہور تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ باز خاں شروانی، سارے خاندان میں آفتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مضافات علیگڈھ و ایٹہ کے دیہات پر قابض تھے۔ جاٹ گردی کے زمانہ میں ساری جائداد چھوڑ کر پوری خاندان کو گنگا پار جانا پڑا۔ ۱۸۰۳ء کے لگ بھگ شروع علمداری انگریزی میں اپنے علاقہ پائیں اور چوراسی پر مستقل قابض ہوئے۔ شروانی خاندان عرصۂ دراز سے افغانستان سے آکر ہندستان میں آباد ہے۔ بہلول لودھی کے زمانے ۸۵۵ھ تا ۸۹۳ھ میں عمر خاں شروانی با اقتدار تھے۔ سکندر لودھی کے وزیر ہوئے۔ تاریخ فرشتہ وغیرہ میں دوسرے شروانی عہدیداروں کا بھی تذکرہ ہے۔ اکبر کے عہد میں پیر محمد خاں شروانی جونپور کے صوبہ دار تھے۔ علیگڈھ کا مشہور و معروف قلعہ جو اب منگر محلہ بالائے قلعہ کی شکل میں تبدیل ہوگیا ہے، محمد خاں شروانی نے ۱۵۲۵ء میں ابراہیم لودھی کے زمانے میں بنایا۔ اسی خاندان کے معزز فرد نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی ہیں۔ ابتدائی استاد حاجی عبدالرشید خاں علیگ ہیں، مولانا مفتی لطف اللہ علیگڈھی، مولانا عبدالغنی خاں فرخ آبادی، اور مولانا شیخ حسین عرب محدث بھوپالی سے تکمیل درسیات کی۔ انگریزی میٹرک تک سینٹ جانس کالجیٹ اسکول آگرہ میں پڑھی۔ اپنے علمی ذوق کی بنا پر ۱۸۸۳ء سے ہندستان کے مشہور علمی و ادبی رسالوں میں ٹھوس مضامین لکھنا شروع کئے۔ ۱۹۰۵ء سے ریاست کا کام سنبھالا۔ ایک نادر الوجود کتبخانہ قائم کیا ہے۔ جو بیرون ہند بھی مشہور ہے۔ ۱۹۱۸ء مطابق ۱۳۳۶ھ میں حیدرآباد میں صدر الصدور ہوئے۔ ۱۴ جمادی الآخری ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء کو نواب صدر یار جنگ بہادر کا خطاب ملا۔ مولانا آزاد سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ نظام الاوقات کے پابند ہیں۔ مطالعۂ کتب میں وقت صرف فرماتے ہیں۔ نہ صرف فخر خاندان بلکہ فخر قوم و ملک بھی ہیں۔ ۱۲

مدت کے بعد پتہ چلا تھا کہ قلعۂ احمد نگر اور آغا خاں پیلس پونہ میں رہنمایان ہند مقید و نظر بند ہیں۔ اس تمام درازنفسی سے مطلب اتنا تھا کہ یہ سمجھ میں آسکے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۲ء کی نوعیت کچھ کم نہ تھی، ہندستان نے دونوں بار ایسی گلو خلاصی کی کوشش کی دونوں بار ناکامی رہی۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہوا کہ پہلے لال قلعہ دلی میں جو مقدمہ ہوا تو بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار سلطنت مغلیہ کو رنگون میں نظر بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور تادم آخر وہیں مقید رہنا پڑا۔ لیکن ۱۹۴۶ء میں اس وقت کے "باغیوں" جنرل شاہنواز، ڈھلن اور سہگل کو اسی لال قلعہ سے چھوڑنا پڑا اس سے پہلے ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو "باغی" لیڈران کانگریس کو رہا کرنا ہی پڑا تھا اس ۸۹ سال میں غلام ہندوستان نے اتنی ترقی تو کر ہی لی۔ ہمیں بس است

ان "باغی" لیڈروں کے متعلق یہ خیال ہو چلا تھا کہ بغاوت کا مقدمہ قایم کر کے پھانسی یا کم از کم عمر قید کی سزا ضرور ہوگی خود لیڈر بھی ان حالات میں کسی طرح مطمئن نہ تھے انھیں اسیران فرنگ میں کانگریس کے صدر اور آسمان علم و ادب کے مہر امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے جو دیبائے شریک حیات گرفتار مرض و آزار، اس پر مسلسل شب بیداری اور ہجوم افکار، قلعہ احمد نگر میں تو جی پہروں میں مقید کر دیئے جاتے ہیں ۲۴ گھنٹوں کے بعد تھوڑا سا سکون ملنے پر نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا

مسٹر جے پرکاش نرائن نے نیپال پہنچکر ہندوستانی فوج بنانے کی کوشش کی۔ اسی کوشش میں گرفتار بھی ہوئے۔ مسٹر سوبھاش چندر بوس[۱] سابق صدر کانگریس نے ۲۶ جنوری ۱۹۴۱ء کو خفیہ طور پر کلکتہ سے افغانستان ہوتے ہوئے جرمنی اور وہاں سے سنگاپور وغیرہ پہنچکر لاکھوں کی تعداد میں "آزاد ہند فوج" کے قومی سپاہی بھرتی کئے اور صوبہ آسام کے مقام امپھال پر ۱۹۴۳ء میں حملہ کیا جو رسد نہ پہنچنے اور بارش شروع ہو جانے کی وجہ سے ناکام رہا۔ سنگاپور فتح کر کے قلعہ پر قومی ترنگا جھنڈا لہرایا۔

ملک کے ان حالات میں حکومت کے خلاف آواز اٹھانا تو درکنار آواز نکالنا بھی بڑا سنگین جرم تھا۔ کیا پُرآشوب زمانہ تھا۔

ہاتھ کاٹے گئے آغازِ دُعا سے پہلے ہم سزایاب ہوئے جرم و خطا سے پہلے
کچھ ادائیں ہیں جنھیں قتل عبث ہی منظور کچھ سزائیں ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے

[۱] ۱۸۹۷ء میں کٹک میں پیدا ہوئے۔ کلکتہ میں گریجویٹ ہو کر کیمرج میں داخل ہوئے۔ آئی، سی، ایس ہو کر واپس ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں کلکتہ کارپوریشن کے مئیر کئی مرتبہ بنگال کانگریس کمیٹی کے صدر رہے کئی مرتبہ قید و نظر بند ہوئے۔ ۱۹۳۸ء و ۱۹۳۹ء میں دو سال کانگریس کے صدر رہے۔ ۱۹۳۹ء میں گرفتار ہو گئے۔ ایک سال کے بعد رہائی ہوئی۔ ۱۹۴۱ء میں اچانک ہندوستان سے غائب ہو گئے۔ جرمنی، جاپان، سنگاپور وغیرہ میں دوران جنگ میں برطانیہ کے خلاف کام کرتے رہے۔ آزاد ہند فوج بنا کر "نیتاجی" کا لقب حاصل کیا۔ اطلاع ملی تھی کہ ۱۸ اگست ۱۹۴۵ء کو ٹوکیو جاتے ہوئے تھائی ہوکے میدان میں ہوائی جہاز کے گرنے سے انتقال کر گئے۔ اب خبر ملی ہے کہ یہ خبر غلط تھی کسی مصلحت سے مشہور کر دی گئی تھی، مسٹر بوس زندہ ہیں اور عنقریب ظاہر ہو کر ہندوستان کی سیاست میں نئے باب کا اضافہ کریں گے عارضی گورنمنٹ نے اُن کے وارنٹ وغیرہ منسوخ کر دیئے ہیں ۱۲۔

ہوتے سارے صوبوں کے قابل ذکر ہزاروں کانگریسی ہر ہر گاؤں اور قصبے سے پکڑ لئے گئے کانگریسی لیڈران کی اسپیشل ٹرین سخت نگرانی میں کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ کر دی گئی۔ ایک عرصہ تک یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ ان حضرات کو کہاں رکھا گیا ہے۔ زندہ بھی ہیں یا کسی سمندر میں غرق کر دیئے گئے۔ جب پبلک میں صبح کو اطلاع پہنچی۔ تو قیامت خیز ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ مشتعل ہجوم نے آگ لگانا، ریل کی پٹریاں اکھاڑنا، سرکاری گوداموں کو لوٹنا اور تباہ کرنا، تار کاٹنا اور ملازمان حکومت پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ نہ صرف بمبئی بلکہ ہندوستان کے شہروں میں بھی یہ تحریک شروع ہو گئی۔ حکومت نے بھی پورے تشدد سے کام لیا۔ بلا امتیاز گولیاں چلائیں۔ ہوائی جہازوں سے بم برسائے دیہات کی لوٹ مار کی صرف بمبئی میں ہزاروں انسانوں کو بے عزت کیا عورتوں کی عصمت دری کی اعلاقوں پر بڑے بڑے جرمانے کئے گئے جائدادیں ضبط کی گئیں۔

مسٹر جے پرکاش نرائن، اچیت نرائن پٹوردھن، مسٹر رام منوہر لوہیہ، اور مسز ارونا آصف علی وغیرہم لیڈران کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے توڑ پھوڑ کی اسکیم کو جرأت کے ساتھ چلایا۔ اور آخر الذکر تو گرفتار ہی نہ ہو سکیں۔

رشوت ستانی اور ظلم و جبر کی وہ گرم بازاری ہوئی کہ ہندوستان کی تاریخ اس کی نظیر سے عاجز ہے معمولی سب انسپکٹروں، ادنیٰ درجہ کے سرکاری ملازموں، اور بلیک مارکیٹ کرنے والوں نے پانچ سالہ دورِ جنگ میں لاکھوں روپیہ کما لیا، لکھ پتی بن گئے۔ عالیشان محلات بنائے، کوٹھیاں اور زرعی جائدادیں خریدیں، تجارتیں بڑے پیمانوں پر شروع کر دیں۔ بنکوں میں حسابات کھول لئے۔

کانگریس کے لیڈران ۱۹۴۱ء میں نظر بندی سے رہا کئے گئے۔ حکومت نے سمجھوتہ کی گفتگو شروع کی، سر کرپس لندن سے تبادلہ خیالات کے لئے آئے۔ گفتگو ناکام رہی۔ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی کونسل نے بمبئی میں عدم تعاون کی تجویز پاس کی "کوئٹ انڈیا" یعنی "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کیا۔ گاندھی جی کو وائسرائے کو خط لکھنے کا اختیار دیا گیا کہ پندرہ یوم میں ہندوستان کو مطمئن کیا جائے ورنہ اپنا راستہ خود بنانا پڑے گا۔ ۱۱ بجے شب کو لیڈران کانگریس اجلاس ختم کر کے اپنی اپنی جائے قیام پر پہنچے۔ ۵ بجے صبح تک بیک وقت سب گرفتار کر لئے گئے۔ بمبئی کو ساری دنیا سے بے تعلق کر دیا گیا۔ ٹیلیفون کے تار کاٹ دیئے گئے تاکہ باہر خبر نہ جا سکے۔ تمام ہندوستان کے تھانوں میں اطلاع پہنچا دی گئی کہ ہر مقام کے سر برآوردہ کانگریسیوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ شام ہوتے

ان کے عہدیدار بڑے بڑے خطاب یافتہ اور ہمیشہ سے برطانیہ کے معتمد علیہ و وفادار رہے تھے۔ قومی اور مجاہد جماعتوں کے مقابلہ پر غیر ملکی حکومت نے ایسا آلۂ کار ساکر میدان میں لا اتارا تھا ان جماعتوں کا کام آزادی کی راہ میں روڑے اٹکانا اور فرقوں کی نمایندگی کا دعویدار بن کر در پردہ حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنا تھا۔

یہ اندرونی خلفشار اور ملکی و قومی غداری آزادی خواہ جماعتوں کے حق میں اور مصیبت بن گئی تھی۔

فرعون دماغ اور صاحبِ جبر و استبداد حکومت مجاہد جماعتوں کے اس نعرۂ آزادی کو کب برداشت کر سکتی تھی۔ فارورڈ بلاک اور احرار اسلام کے ارکان و ممبران کی گرفتاریاں شروع کر دی گئیں لمبی لمبی سزائیں دیجانے لگیں، بعد میں کانگریسی اور جمعیتی لیڈروں (امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہرلال نہرو، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہم) کو گرفتار کر لیا گیا۔

کانگریس نے پُرامن انفرادی سول نافرمانی شروع کی دیہات تک کے عہدیدار بھی گرفتار ہوئے نئے نئے ایکٹ بنائے گئے اور عجیب عجیب آرڈر نکلے گئے پورا ملک جہنم کدہ بن گیا تھا خوف اور ہراس ہر طرف چھا گیا تھا مطلق العنان حکومت پورے تشدد پر اُتر آئی تھی جنگی چندے

سے اگست ۱۹۴۲ء کا پُرآشوب زمانہ بھی کم خطرناک نہ تھا جرمنی نے ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو پولینڈ پر حملہ کرکے اعلانِ جنگ کردیا تھا۔ یہ جنگ فیصلہ کن جنگ تھی صرف دو ملکوں کی جنگ نہ تھی بلکہ دو اصولوں کی لڑائی تھی۔ ڈکٹیٹری اور نام نہاد جمہوریت کا تصادم تھا۔ برطانیہ کو سامنے تباہی بربادی کا منظر نظر آرہا تھا۔ ہندوستان صدیوں سے برطانوی شہنشاہیت کا غلام تھا۔ ۸۳ سال سے مسلسل جدوجہد آزادی جاری تھی جس کی خشت اوّل علامہ اور دوسرے معاصر علماء عصر کے مبارک ہاتھوں سے ۱۸۵۷ء میں رکھی گئی تھی۔ ہندوستان کی تمام آزادی خواہ جماعتوں، انڈین نیشنل کانگریس آل انڈیا فارورڈ بلاک مجلس احرار اسلام ہند، اور جمعیۃ العلمائے ہند وغیرہم نے ۱۹۳۹ء کی اس جنگ کو سرمایہ داری کی جنگ بتایا۔ باشندگان ہند کو اس سے علیحدہ رہنے کی اپیل کی، ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کو اس کی مرضی کے خلاف آزادی کا وعدہ کیئے بغیر جنگ کے شعلوں میں نہیں گھسیٹا جاسکتا۔ دوسری طرف ہندوستان کی فرقہ پرست و خود غرض عہدوں اور اقتدار کی بھوکی جماعتیں تھیں جنھیں ایک طرف فرقوں کی واحد نمائندگی کا دعویٰ تھا اور دوسری جانب فوجی بل پاس کرا رہی تھیں ان کے اعلیٰ عہدیداران، بھرتی اور چندوں میں پورا تعاون کر رہے تھے جیل سے باہر رہ کر بھی رشوت ستانی اور ظلم و تعدی کے خلاف آواز اٹھانا گناہ سمجھتے تھے بلکہ خود شریک کار تھے۔

یوں تو آزاد کی ہر تصنیف و مضمون میں ادبی شان پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے لیکن مجموعۂ خطوط "غبارِ خاطر" کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مردِ مجاہد کو زبان و بیان پر کس قدر قدرت حاصل ہے۔ الفاظ ڈھلتے جارہے ہیں خاتم عبارت میں نگینے جڑتے جارہے ہیں۔

جب انسان میں کوئی کمال پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا صدور و ظہور بلا قصد و ارادہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ آپ نے ہارمونیم اور ستار بجانے والے کو دیکھا ہوگا۔ اس کی نظر کسی طرف ہو، خیالات غزل سرائی کی طرف متوجہ ہوں یا سامعین کی جانب آنکھوں پر پٹی بندھی ہو یا کھلی ہوں، انگلیاں اپنا کام برابر اسی شان سے کرتی نظر آئیں گی۔ کیا مجال ہے جو کسی دوسرے سُر یا تار پر انگلی جا پڑے۔

یہی حال ان دونوں بزرگوں کی انشاپردازی کا ہے دونوں کی سحر نگاری کمال کے اسی مرتبۂ اعلیٰ پر پہنچی ہوئی ہے۔ کہ گرد و پیش کے حالات اور خطرناک و سنگین حادثات بھی متاثر نہیں کر سکتے خود علامہ کا رسالہ التورۃ الہدیہ اور قصائد قمۃ الہدا اور آزاد کا مجموعۂ خطوط "غبارِ خاطر" اس کا آئینہ دار ہے

علامہ نے رسالہ و قصائد انڈمان میں لکھے اور آزاد نے یہ خطوط نواب صدر یار جنگ بہادر کو قلعۂ احمد نگر کی محبوسی میں تحریر کئے۔ مئی ۱۸۵۷ء

یا ویلہ یا ویلہ یشکو الزمان میلہ	ویقول یشکو لیلہ یا لیل ھل لک من غد
یصف النجوم وشومہا یرعی السماء نجومہا	درّیہا وغمومہا من نثرۃ او فرقد
ناوی الانام باسوھم طرا وجابر کسرھم	لطفا وواضح اصرھم عنھم غدا فی الموعد
خیر الوری ابرّھم جمعا وکاشف ضرھم	ولجاءھم فی امرھم وشفیعھم فی المشہد
حامی الحقیقۃ انجد اعلی الخلیقۃ امجد	زاکی الحلیفۃ احمد خیر الانام محمد
ھو اول النور التی یتلوہ کل تعین	تاثیر لیس بممکن عند الحصیف المہتدی

یہ تو نظم کے چند نمونے تھے، عربی نثر نگاری کا حال مولانا ابو الکلام آزاد کی اردو انشا پردازی کی طرح سمجھئے۔

علامہ کے بیسیوں قصائد وخطوط ومضامین نظر سے گذرے، اسی طرح آزاد کے مقالات ورشحات بھی دیکھنے میں آئے۔ میری علمی تہی مائگی اور ادبی بے بضاعتی آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کونسا مضمون یا خط فصاحت وبلاغت اور روانی وسلاست میں دوسروں پر فوقیت رکھتا ہے۔

شادی ومسرت کا موقعہ ہو یا حزن والم کا، عیش وعشرت کے سامان مہیا ہوں یا رنج وغم کے، تبریک وتہنیت کا محل ہو یا عیادت وتعزیت کا ہر جگہ اشہب قلم یکساں دوڑتا نظر آئے گا۔ گویا نگاہوں کے سامنے وسیع میدانِ ادب ہے۔ رخش خامہ کو جدھر مہمیز لگائی، ہوا ہو گیا۔

سے قبل خواب دیکھا تھا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ سرکار رسالت نے عرب کے ساتھ گلے لگا کر سینہ پہ ہاتھ پھیرا یا تھا۔ دو اشعار اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں۔

ایا مالک ہدی بعد اسعادہ عدا	واعتدلی ادہی المصائب واعتدی
فتابعد لیس واعتدی بعد مرتی	وواعد لطعا ثم عاد وا وعدا
فکنا رما بالاحجاف مراقسا	مدی الدہر حتی قیل لن یتبددا
فلما افترقنا بعد طول اجتماعنا	بلینا سعد ما لمن تمددی
فو اللہ ثم اللہ لو ان متلہ	یعادی عنی کان نفسی لہ فدا
فقلت تمہید اعدل ربک شاہدا	وقد کنت مسہود الکمال محمدا
تعیشت فی الدنیا حمیدا محمدا	ودارمہا مسہدا متشہدا
وقد یعت نفسی بان ستعورنا —	لسہادۃ ادربت النبی محمدا
محیاک اکراما ووصلک راقۃ	وآواک فی النادی وارواک التندی
علیک سلام اللہ مارق جارع	وحن عریب لا قید مصعدا
سلام علی قسر حواک وانہ	حوی ملک احسانا و برا و محتدا

---

٣٣ اشعار کے قصیدۂ نعتیہ میں محرم ۱۲۴۱ھ میں لکھتے ہیں۔

واہا لواہ محمد	فی حجر لیل سرہا	قد بات للدار ملا یلقی القذی من بعد

مولانا فیض اللہ رفیق خاص محب با اخلاص کے حادثہ شہادت پر ۲ر جمادی الاخری ۱۲۳۶ھ کو خبر وحشت اثر ملتے ہی شب کو ۵۲ اشعار کا مرثیہ لکھا بعض اشعار درج ذیل ہیں۔

ایا ما للیلی لا تسیر نجومہ ، وما لصباحی لا یہب نسیمہ

کذبت ومن این الصباح لجازع ، تجنح دجی لا یستنیر بھیمہ

وما بال طرفی لا یلذ بنومۃ ، وقد طال جدا سھدہ ونجومہ

لقد ساقد ظلما علیہا اخ لہ ، یعادیہ مشئوم الشمال لئیمہ

علی غیر ذنب غیر ان الہد ، حبۃ اعتزار احد عند سھیمہ

فطوبی لمن بودی شہیدا فیدخل ، الجنان ویلقی فی الجحیم خصیمہ

لہ فی جنان العدن نعیم للذی ، یقتلہ سوء العذاب الیمہ

فیا صاحب الفضل الذی یوم سقی تری ، ضریحک من غیث یبث دیومہ

علیک سلام اللہ ما قال ساھر ، ایا ما للیلی لا تسیر نجومہ

اسی حادثہ شہادت کے متعلق والد ماجد مولانا فضل امام کو ایک نیاز نامہ ۲۷ر جمادی الاولی ۱۲۳۶ھ کو جبکہ مولانا پالی میں قیام فرماتے تھے لکھا۔ اور اسی کے ساتھ ۳۰ر جمادی الاولی کا لکھا ہوا ۱۰۵ اشعار کا مرثیہ بھی بھیجا جس کے بعض اشعار درج ہیں۔ مولانا محمد فیض اللہ نے جام شہادت نوش کرنے

ما دام سائل بارقا قاصی المواطن بارحا   عنها الیہا بارعا یشکو سناتوقانہ
فہواہ فی وجدانہ وجواہ فی وجنانہ   والطرف فی ہملانہ والقلب فی خفقانہ
ان سام برقا وامضا اطراق معا فانتضا   فاراع منہ ما مضی فلیحذ فی کتمانہ
واحا نالق بارق او متح وبل وادق   فلمآہ دمع دافق ودکا لظی نیرانہ
یزداد فی ہیمانہ ویحق فی امتحانہ   ان اورق فی بابہ عمق فی اشجانہ

رمضان المبارک ١٣٢٣ھ میں ١١١ اشعار کا قصیدہ لعیبعبار رسالت میں
پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے اس کے چند متفرق اشعار یہ ہیں

حاجی ہواہ دمعہ الجاری   لما جنا بارق بادی الساری
ویلاہ من ما ثم کلفت تکلف ان   یبدی التقلد سراہا الا سرار
وکیف یخفی الہوی من کان لوعتہ   تبدو وادار ذکرا لدار اوہا الجار
کملا ثم لا مدمعا وعیرہ   حتی اعلم مکترت باللوم والعار
ومن اطاع الہوی طوعا ودان لہ   فلا محالہ یعصی اللائم الزاری
یا لائمی فی ہوی الحب ابدت لک ان   حلومها فی الہوی العذری اعذاری
ما للکری تتحامی مقلتی وقد   دب المنام الی اجفان سمّاری
کم بات فی عصدی من لو تامّلہ   لرأی العاد ہلالا نعد اسد ار
للہ در زمان بالحبیب مضی   لو کان سقی وہل بات سوی الساری

علامہ عربی اشعار حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کو دکھاتے تھے۔ اوائل عمری کا واقعہ ہے۔ عرب کے مشہور اشعر الشعراء امرؤ القیس کے ایک قصیدے کے طرز پر قصیدہ لکھا۔ شاہ صاحب کو جا کر سنایا۔ مولانا شاہ غوث علی قلندر کا بیان ہے کہ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا اس کے جواب میں انھوں نے متقدمین کے بیس اشعار پڑھ دیئے۔ مولانا فضل امام بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ وہ فرمانے لگے کہ بس چپ! ادب! عرض کیا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں، فن شاعری ہے۔ اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔

"برخوردار تم سچ کہتے ہو مجھکو سہو ہوا"[1]

عربی قصائد کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۲ھ میں بمقام ہانسی ۸۰ اشعار کا نعتیہ قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

یا سائلاً عن شأنہ، یغنیک عن تبیانہ ۔۔۔ دمع جری فی شأنہ، ہملاً وفرط انانہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳) جن میں اکثر مکمل اور بعض نامکمل ہیں محب محترم مولوی حکیم نصیر الدین اجمیری برادر زادہ علامۃ الہند مولانا معین الدین الاجمیری مرحوم کے پاس ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ بعض قصائد و خطوط خود علامہ ہی کے دست مبارک کے لکھے ہوئے ہیں کئی جگہ دستخط بھی ثبت ہیں۔ اس بیاض کی نقل اور رسالہ ثورۃ الہندیہ مع قصائد فتنۃ الہند حضرت الاستاذ علامہ اجمیری مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے میرے پاس بھی ہیں۔ رسالہ ثورۃ الہندیہ مع قصائد فتنۃ الہند کتبخانہ حبیب گنج، کتابخانہ ٹونک اور کتابخانہ مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی میں بھی موجود ہے ۱۲۔

[1] تذکرہ غوثیہ۔

علامہ نے ادب عربی میں وہ کمال پیدا کیا کہ عرب کے معاصرین شعراء سے کہیں سبقت لے گئے۔ نظم کی طرح نثر میں بھی شاعری کی ہے رسالہ ثورۃ الہندیہ اور بعض حلمات اس کے شاہد عادل ہیں۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے المناک واقعات کے بیان میں، بحالت اسیری جزیرۂ انڈمان مصائب وآلام کے بے پناہ ہجوم میں جو فصاحت و بلاغت اور درد انگیز پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے اس سے علامہ کی زبان عربی پر مہارت اور قدرت کاملہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید کے اصول پر جب اہل علم و ادب اس رسالہ کو جو اب تک پردہ خفا میں تھا اور اب اس سوانح حیات کے ساتھ شائع ہو رہا ہے دیکھیں گے تو مسلم جان کو معطر پائے بغیر نہ رہ سکیں گے اور سر دھننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے گا۔

علامہ نے پچاسوں قصیدے کہے ہیں جن میں نعت کا حصّہ زیادہ ہے ہزار ہا اشعار مختلف بیاضوں میں (جو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہی ہیں) موجود ہیں[۱]۔

---

[۱] ۲۶ اور ۴۲ اوراق کے دو قصیدے اور قصائد فتنۃ الہند حبان اللہ اور نیل گلکس لشن لائبریری مسلم یونیورسٹی میں ہیں۔ دو بیاضیں مولوی شاہ وفات احمد کا مرہونی صاحبزادہ سین آستانہ علیہ ریسکے کی ملکیت میں اور کلام کا کچھ حصہ جس میں اصل مسودہ بھی شامل ہے کتا سکا۔ معیاں گویا موس سے ایک ناکمل سا میں جس میں عربی میں مختلف بزرگوں اور دوستوں کے نام چھ خطوط اور پندرہ طویل حصے ہیں (باقی صفحہ ۲۱۲)

کسی نہ کسی امیر کا دیوان خانہ شب کے اجتماع و سمر کا مرکز بنجاتا
تھا۔ اور اس حلقے کے لئے ٹھیک ٹھیک ایک علمی ادبی اور
تفریحی کلب کا کام دیتا تھا۔ والد مرحوم ان دیوان خانوں کی
مجلس کے جو افسانے سنایا کرتے تھے کاش وہ قلمبند کئے جاسکتے
بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اُجالا تھا۔ دہلی مرحوم کے ہفت صد سالہ
زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی گوشان و شکوہ کے
سارے پچھلے نقوش مٹ چکے تھے لیکن مٹے ہوئے رنگ و
روغن میں بھی عہد ماضی کے مرقعوں کی بہار دیکھی جاسکتی تھی[۱]"

علامہ نے آنکھ کھولی تو آبائی وطن خیرآباد اور اقامتی وطن دہلی میں
علمی و ادبی مجالس، شعر و شاعری کی صحبتیں قدم قدم پر نظر آئیں۔ ذہانت
وجودتِ طبع مبدءِ فیاض کی جانب سے پہلے ہی ودیعت ہو چکی تھی۔
جہاں تیرہ سال کی عمر میں سندِ تکمیل منقولات و معقولات حاصل کی تھی۔
وہاں فنون ادبیہ میں بھی مہارت تامہ پیدا کرلی تھی۔ بچپن ہی سے شعر
کہنا شروع کیا۔ عربی، فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرمائی۔
فارسی شاعری کے لئے فرقتی تخلّص رکھا۔

فرقتی در کعبہ رفتی بارہا نامسلمان ناسلمانی ہنوز[۲]

---

[۱] غالب ازمہر صفحہ ۲۹۰ [۲] گلزار بہار صفحہ ۱۱۴۔

کی یہ محفل کوئی قضا نہیں کرتا تھا ہر فن کے اکابر کو وہاں اُن کے
بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا اگر کوئی نو وارد دہلی آتا اور
چاہتا کہ دہلی کے سارے اہلِ فضل و کمال کو یک وقت اور یک
مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا شیفتہ صاحب کے دیوان خانہ کا رخ کرتا[۵]
اٹھارویں صدی میں پیرس اور لندن کے علم دوست امراء
کے سیلون اور ڈرائنگ روم کے جو حالات ہم پڑھتے ہیں بعینہٖ
یہی حال دہلی کے دیوان خانوں کی مجلسوں کا بھی تھا ہر حلقے میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٦) مولانا آزاد کو ان اشعار سے کافی تعلق ہے بعض احباب کو اپنے خطوط میں بھی تحریر فرما دیتے ہیں۔

اقول لصاحبی والعیس تھوی — بنا بین المنیفۃ فالضمار
میں نے اپنے ساتھی سے کہا درانحالیکہ ہم تیزی سے منیفہ (جو ایک بستی تھی) اور ضمار (گاؤں) کے درمیان جا رہے تھے کہا
تمتع من شمیم عرار نجد — فما بعد العشیۃ من عرار
عرار نجد (زرد رنگ خوشبودار پھول) کی خوشبو سونگھ لے کیونکہ اس شام کے بعد عرار کا ملنا ناممکن ہے
الا یا حبذا نفحات نجد — وریا روضۃ بعد القطار
کس قدر خوشگوار ہیں نجد کے پھولوں کی مہکیں اور بارش کے بعد سبزہ زاروں کی بو باس کتنی مزیدار ہے
واھلک اذ یحل الحی نجدا — وانت علی زمانک غیر زار
جب کہ تیرے اہل وطن نجد میں تھے اور تو بھی وہاں تھا پھر کوئی ملنے کی طرف توجہ نہیں ہو سکتا
شھور ینقضین وما شعرنا — بانصاف لھن ولا سرار
مہینے گذر رہے ہیں اور عیش و آرام کی وجہ سے ہمیں نصف ماہ اور آخر ماہ کا پتہ بھی نہیں چلا
فاما لیلھن فخیر لیل — واقصر ما یکون من النھار
ان مہینوں کی راتیں بہترین راتیں ہیں اور ان کے دن بے حد مختصر ہیں

[۵] غالب نامہ صفحہ ۲۹

ان کے علاوہ دوسرے ماہرین فنون میں، امام الدین خاں خوشنویس، غلام علی خاں مصور، ہمت خاں گویا، راگ رس خاں گویا، صوفی شاہ محمد حنیف صوفی شاہ فدا حسین، سید عسکری، حکیم غلام نجف خاں، حکیم صادق علیخاں، حکیم نصر اللہ خاں، قابلِ ذکر ہیں، یہ حضرات روزمرہ کے آنے جانیوالے تھے، اندازہ لگائیے کہ اکبر بادشاہ کے شاہی دربار سے یہ دربار کس طرح کم تھے۔ بادشاہ نے لاکھوں روپئے صرف کر کے نورتن جمع کئے تھے اور ان شاہانِ علم نے اپنے حسن اخلاق سے سینکڑوں باکمال حضرات کو درباری بنا لیا تھا۔

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ان مجالس کا ذکر مولانا مہر سے کیا تھا انھوں نے "غالب" میں اسے نقل کیا ہے۔

"والد مرحوم (مولانا خیر الدین دہلوی) شب کی نشستوں میں جب کبھی اس عہد کا ذکر کرتے تو بار بار یہ شعر پڑھتے اور آبدیدہ ہو جاتے۔

تمتع من شمیم عرار نجد فما بعد العشیۃ من عرار[1]

فرماتے تھے کہ مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے تمام منتخب افراد کا مرکز تھا۔ جاڑا، گرمی، برسات کوئی موسم ہو لیکن شب

(غالب ص ۱۲۱)

[1] یہ شعر صمہ قشیری کا ہے۔ پانچ اشعار اسی سلسلے کے اور ہیں، ناظرین کی دلچسپی کیلئے ترجمہ کے ساتھ نقل کئے جاتے ہیں۔

شاعری ونثرنگاری

سخن فہمی، نکتہ آفرینی، اور شاعرگری کا حال آپ معلوم کرچکے اب شاعری کی کیفیت بھی ملاحظہ کرتے چلئے۔

یہ تو گذر ہی چکا ہے کہ وطن مالوف خیرآباد علم وادب کا مرکز سا ہوا تھا دہلی پہنچے تو وہاں بھی ہرطرف باکمال حضرات کا جگمگاتا نظر آیا ماحول دگرگونیں کا اثر پڑنا لازمی ہے والد ماجد کے انتقال کے بعد جب تک دلی میں رہے علامہ کے یہاں اہل علم وادب کی نشست روزانہ رہتی۔

دہلی میں علمار کی دو جگہ نشست تھی ایک علامہ کے یہاں دوسری مفتی صدرالدین خاں آزردہ کے دولتکدہ پر علامہ کے علمی دربار میں آٹھویں روز شعرائے دہلی کا بھی اجتماع ہوتا تھا۔

غالب، صہبائی، مومن، آزردہ، احسان، میر، نثار، شیفتہ، ضمیر، ممنون، نصیر، وغیرہم۔

علمار میں مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی عبدالخالق، مولوی محبوب علی، مولوی نصیرالدین شافعی، مولوی کریم اللہ، مولوی نورالحسن، مولوی کرامت علی، مولوی مملوک علی، مفتی سید رحمت علی خاں، مولوی امان علی، مولوی محمد خاں، مولوی محمد رستم علی خاں وغیرہم۔

مصطلحاتِ غریب جو کہ نہ معروف ہوں | نظم کرے کس طرح شاعرِ ہندی سخن
جو متعارف ہوا شاعروں میں پہلے سے | اسکو بھی سن سنکے آج ہوتے ہیں سب طعنہ زن

کہنے لگے یہ کلام مہمل و بے مغز ہے | ہیں شعرا بے سواد جہل ہے ان کا وطن
گرم ہوئے بڑھ گیا سلسلۂ قہر و خشم | بسکہ کفو نازک مزاج تھے یہ آئی شکن
کہتے تھے وہ بار بار ہندیوں سے ہے محال | رمز و کنایات میں دقت و لطفِ سخن

ہو کے ادب سے خموش پھر یہ قصیدہ کہا | کوچۂ نو میں چلا قاصدِ مشقِ کہن
قید میں قحطِ کتاب حافظہ از بس ضعیف | پر مددِ غیب سے خامہ ہوا حرف زن
بعض تراکیب خاص طبع کی ایجاد ہیں | نظم ہوئیں جو تھیں یاد مصطلحاتِ کہن
نصف قصیدہ کیا سامنے ان کے رقم | ختم ہوا جب وہ تھے ہمدمِ گور و کفن
میری خطائیں کریں صاحبِ انصاف عفو | قید میں خود میں ہوں ہیچ پوچ ہے میرا سخن

غیب سے تاریخ تو ہاتھ لگی اے منیر
جزوِ دلِ نیم جاں ہوئی شرحِ حدیثِ حسن [۱]

۱۲۷۹ھ

---

[۱] کلیاتِ منیر۔

یہ عالم ہے کہ ڈیڑھ سو اشعار تقریباً ڈیڑھ سال میں پورے کر لیے ہیں
علامہ کی وفات ۱۲۷۰ھ میں واقع ہوئی ۱۲۶۹ھ میں قصیدے کی تکمیل
ہو پائی۔ قصیدہ کا پہلا مطلع یہ ہے۔

اشک زلیخا ہوئے سحر صنعت جوش کن | عرق ہوا ئیل میں یوسفِ گل پیرہن

قصیدے کے آخری اشعار کے ذریعہ ساری رودادِ میر ہی کی زبان سو
سُنئیے۔

حضرتِ فضل و کمال عالمِ عالی مقام | ناقدِ تاری زبان مثلِ تناس سخن
مولوئی بے نظیر فضلِ حق اسم شریف | دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و موتمن
قید میں ہیں اور وہ رہتے تھے ایکی جگہ | عین سمندر میں تھے غرق بحرِ محن
کہنے لگے ایک دن کچھ سب اسکا تا | شاعر اُردو زبان ایسے ہوا ہے یا کہیں
مصطلحاتِ عجم اور کنایاتِ فرس | کس لئے کرتے ہیں زیبِ نظمِ سخن
یا متحمل نہیں لہجۂ اردو زبان | یا کوئی لائق نہیں تم میں سو ذی ریت وظن
گو غزل میں ہو یہ پر قصیدے میں فرض | دقتِ مضموں سے ہے حُسن لوجہ حسن
حضرت سودا کہ کیس نے قصیدے کہے | وہ بھی پر اس راہ میں بچ سکے قطرہ زن
شاعروں میں جز غزل پھر کسی نے کہا | زعم میں گویا ہے ہوں طوطیِ شکر شکن

میں نے کہا راست ہے آپ جو فرماتے ہیں | آپ سنیں تو کہے کچھ یہ اسیرِ محن

رونما ہوگیا، نواب فرخ آباد کے ساتھ شریک انقلاب ہوگئے۔ عبور دریائے شور کی سزا ملی، باندہ، الہ آباد، کلکتہ جیلوں میں رہے ایک جگہ سے دوسری جگہ ہتکڑی اور بیڑی پہنا کر پاپیادہ بیجا گیا تھا۔ ان پُر صعوبت سفروں کو دیوان میں مختلف جگہ نظم کیا ہے۔ جب علامہ انڈمان پہنچ گئے تو یہ بھی شریک مجلس ہونے لگے۔ دہلی کی پر لطف صحبتوں کا کچھ کچھ غم غلط ہونے لگا۔

منیر اپنے ایک خط میں جو انڈمان سے محمد وزیر خاں مقیم شہر باندہ کو ۲۳ مارچ ۱۸۶۲ء کو بھیجا تھا لکھتے ہیں۔

"بیشتر غزلیات وبعض قصائد در لباس نظم پوشیدہ ازانجملہ یک قصیدہ در تتبع بدر چاچی وخاقانی کہ بہ مبالغہ واصرار عالم معقول وادب علامہ لبیب المشتہر فی الہند جناب مولوی فضل حق خیرآبادی موطن، دہلوی مسکن، ایں جزیرہ مدفن، سختہ ام وخاتمہ قصیدہ کیفیت اصرار جناب مرحوم بہ نظم آوردہ، بالجملہ قصیدہ ایست کہ از قدرت ایزدی خبر میدہد" اھ

علامہ کے اصرار پر (۱۵۱) اشعار کا حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی منقبت میں بڑی قابلیت سے ایک قصیدہ لکھا۔ علامہ کی ہیبت کا

---

۱۵ کلیات منیر۔

روئے سخے ہست' آیناں بر خویشتن می نالم کہ غم جانگداز
داموتی داموش' دلب ار رمزمہ کہ دل در سد سرودن آست
(یعنی شکایت) خاموش میگردد۔
از خویشتن بذوق جفاہا تو ساختیم ما را دگر مبارک ما ما تو ساختیم
دریں روز ہوائے آں در سرافتاد کہ بیتے چند در توحید
میثاً العرفی گفتہ آید چوں کوشش اندیشہ بجائے رسید کہ
زعرفی را محل ماند و نہ مرا جائے ناگزیر آں ابیات را بر کسے
عرضہ میدارم کہ چوں من صد و چوں عرفی صد ہزار را بہ سخن
پرورش تواند کرد' دیا یہ ہر یک بہ ہر یک تواند بود والسلام[1]
اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا علامہ کو سخن فہمی و نکتہ پروری میں
کیا سمجھتے تھے بیر یہ کہ مرزا کی شاعری علامہ کی توجہ والتفات کی کس قدر
رہین منت تھی۔ غالب ہی پر کیا موقوف ہے علامہ کی نظر توجہ جس کی
طرف ہوگئی اُسے پارس بنا دیا۔
سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی جو ناسخ ورشک کے نامور شاگرد
اور انیسویں صدی کے مشہور شاعر ہیں مصطفٰے بیگ نامی ایک شخص نے
قتل نواب جان کے سلسلے میں پھنسا دیا تھا اسی دور میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء

[1] یادگار غالب صفحہ ۳۶۵۔

نے کہا کہ اعیانِ ثابتہ کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے۔
اس کی جگہ ثبوت بنا دو۔ چنانچہ طبع ثانی میں بجائے نمود کے
ثبوت بنا دیا ہے[۱]"

اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس اصلاح نے فلسفیانہ اصطلاح کے مطابق شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ مرزا کو ایسے باریک بینوں اور بال کی کھال نکالنے والوں سے سابقہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ موصوف کو اپنے لئے نئی راہ نکالنا پڑی اور دشواریوں میں مبتلا ہو کر "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کہنا پڑا۔

مرزا نے ایک خط میں علامہ کو خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ جو حمد میں عرفی کے قصیدے پر لکھا ہے خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کی داد چاہی ہے۔ مرزا لکھتے ہیں۔

"سبحان اللہ! باآنکہ از فرامش گشتگانم، ودانم کہ دوست مرا بہ دو جو بلکہ بہ نیم خس برنگیرد، ہرگاہ بسازِ دادنِ آہنگ گلہ روئے آرم، سنجم کہ ایں پردہ (یعنی نغمہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) می توانم سرود، از قہرمان اندیشہ دور باشئے (یعنی امتناعی) درمیان نیست۔ ہر آئینہ۔ بدیں شادمانی کہ ہنوزم بادوست

---
[۱] یادگارِ غالب صفحہ ۷۹۔

مرزا صاحب نے دیوان حوالے کردیا دونوں صاحبوں نے
دیکھ کر انتخاب کیا وہ یہی دیوان ہے جو آج مسک کی طرح
لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں[۵۱]"
مولانا حالی لکھتے ہیں:

"مولوی فضل حق کی تحریک سے انھوں نے اپنے اردو
کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال
ڈالا اور اس کے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا[۵۲]"

مرزا نے اسی سے متاثر ہو کر یہ رباعی کہی تھی۔
مشکل ہر بس کلام میرا اے دل سن سن کے اسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل و گر نگویم مشکل
علامہ کی سخن فہمی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے مولانا
حالی لکھتے ہیں۔

"مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا شعر ہے۔
ہمچناں در شتق عیب ثبوتی دارند بوجودے کہ مدار مدد خارج اعیاں
مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے "تو لے" کی جگہ
"موودے" لکھا تھا مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انھوں

۵۱ آب حیات صفحہ ۵۱۲ ۵۲ یادگار غالب صفحہ ۲۱۔

بھی تھے۔

مفتی صاحب اسی بنا پر سخت ناخوش رہتے تھے۔ اور ایسے اشعار سے طبیعت میں تکدر پیدا ہو جاتا تھا جس کا اظہار شہود و غیبت میں کرتے بھی رہتے تھے۔ مرزا کو آزردہ کی اس روش کی کوئی پروا نہ ہوتی تھی لیکن علامہ کے شریکِ مجلس ہونے اور غزلوں کو سننے اور دیکھنے کے بعد جب مرزا کو سمجھانے کی نوبت آئی کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئینگے، تو مرزا بہت پریشان ہوئے۔

مولوی محمد حسین آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں۔

"کہ مولوی فضل حق صاحب، فاضلِ بے عدیل تھے۔ ایک زمانے میں دہلی میں سررشتہ دار تھے۔ اس عہد میں مرزا خاں کوتوال تھے وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ غرضکہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسہ اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے مرزا نے کہا جو کچھ کر چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔

کے لئے "العاد ثلثہ" (طول، عرض، عمق) کا حکم رکھتے تھے، جس طرح جسم اپنے العاد کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا اسی طرح ان تینوں کو جسم علوم و حکمت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا، مفتی صاحب دونوں سے آٹھ سال بڑے تھے "چراغ" تاریخ ولادت ہے۔ اگر سن ولادت میں دونوں میں سے کسی کا ساتھ نہ دے سکے تھے تو سن وفات میں ایک کا ساتھ تو چھوڑا "چراغ دوجہاں بود" تاریخ وفات ہے مرزا غالب کا بھی سال رحلت یہی ہے اور یہ بھی کیسا پُرلطف اتفاق ہے کہ مفتی صاحب علامہ سے آٹھ سال بڑے تھے اور آٹھ سال بعد ہی دنیا سے رخصت ہوئے علامہ کی وفات جزیرۂ انڈمان میں ۱۲۷۸ھ میں ہوئی ہے مرزا غالب سے ولادت میں ایک برس کا ساتھ دیا اور وفات میں دوسرے کا۔

مرزا کی شعرگوئی کا طرز سب سے جداگانہ تھا طبیعت مشکل پسند واقع ہوئی تھی علماء و فضلاء کی صحبت نے قابلیت میں اور چار چاند لگا دیئے تھے روزانہ کی صحبتوں میں مشکل و دقیق الفاظ استعمال ہوتے رہتے تھے خیالوں کی نئی نئی ترکیبیں اور جدتیں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ مرزا صاحب شعر کہنے بیٹھتے تو انہیں مجالس کا حال دامنگیر رہتا وہ یہ سمجھتے تھے کہ میرے اشعار کے مخاطب یہی باکمال حضرات ہیں تحسین کی توقع بھی انہیں سے ہوتی تھی۔ اس لئے مرزا ان ترکیبوں اور مشکل و دقیق الفاظ کے لئے مجبور

آگیا ہے۔ ومن سناء فلیطالع! خیرآباد سے دلی پہنچے تو وہاں بھی یہی رنگ دیکھا۔ دارالسلطنت دہلی ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی کاملین فن کا مرکز تھی ولیعہد سلطنت صاحب عالم ابوظفر (بہادر شاہ) کی شعر و سخن کی دلچسپی نے زمین دہلی کو اور بھی رشک آسمان بنا دیا تھا۔

علامہ ریزیڈنٹ کے محکمہ کے سررشتہ دار ہو چکے تھے۔ ولیعہد کو دوستانہ مراسم تھے۔ قلعہ میں آمد و رفت رہتی تھی۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر، مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خاں علوی، حکیم مومن خاں مومن، مفتی صدرالدین خاں آزردہ مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیر، شاہ نصیرالدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا خاں عیش، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان، میر حسن تسکین، اور خدا جانے کتنے سخنورانِ باکمال کا جمگھٹا تھا۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔[1]

مرزا غالب سے علامہ کے پُرخلوص اور گہرے تعلقات تھے۔ اسکی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ دونوں بالکل ہمسن تھے۔ دونوں ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے مفتی صدرالدین خاں آزردہ "ثالث ثلثہ" تھے۔ گویا صلیبیوں کی اصطلاح میں "اقانیم ثلثہ" بنے ہوئے تھے۔ یہ تینوں ایک جسم

[1] گل رعنا صفحہ ۳۱۲ -

نادری — دود آہ دل ہم پیچیدہ کاکل ساختند — چون گلستان حسن تو بند سنبل ساختند

چون حدیث صورت احمد عیاں شد درجہاں — عارفاں ناسخ تیسیر تحمل ساختند

گرامی — بیتواں حسرت ارمانِ شمع — قصۂ سوز و ساز معشوقاں

در یاد میشم کہ بہ سنگے زدہ ہست سر — از نالہ کوہ را بہ طپیدن در آورم

ناسخ — اٹھا نالہ تو ایسا کسی بے نوا کا — کہ شعلہ آگ کا دھادا گیا برق رساں کا

ظلیم — ستم مودہ جان من اینکہ ست نگہش — نہ مرم عیبر دلم ستمگری میداد

یہی وہ شعر و سخن کے چرچے تھے جس نے علامہ کو سخن فہمی و نکتہ سنجی میں ماہر بنا دیا تھا علامہ کی صاحبزادی بی بی سعید النساء (والدۂ حضرت مضطر خیرآبادی) بھی بڑی شاعرہ تھیں حرماں تخلص فرماتی تھیں یہ مشہور زمانہ شعر موصوفہ ہی کا ہے۔

جانے یار کا کیا تم کو پتا بتلاؤں — جیسا مشتاق ہو نزدیک بھی اور دور بھی ہے

خیرآباد کی یہی وہ علمی و ادبی فضا تھی جس نے اس آخری دور میں بھی ریاض، مضطر، وسیم، کوثر، بسمل، بیتر اور اختر جیسے صاحب دیوان کامل شعرا پیدا کئے جنھوں نے لکھنوی اسکول کی شان کو چار چاند لگائے لسان الملک ریاض کی وفات کے بعد میں نے "ریاض اور خیرآباد" کے عنوان سے ایک مبسوط مضمون لکھا تھا جو الناظر لکھنؤ جولائی ۱۹۳۵ء میں دو قسطوں میں شائع ہو چکا ہے جس میں دوسرے نامور شعرائے خیرآباد کا ذکر بھی ضمناً

سخن فہمی

علامہ علماء کی طرح علامہ شعر و سخن کے فن سے بے خبر نہ تھے شعر گوئی کے مانند سخن فہمی میں بھی کمال حاصل تھا۔

وطن مالوف خیرآباد جہاں علماء و صلحاء کا منبع و مسکن چلا آرہا تھا، وہیں لکھنؤ کے قرب اور اپنی زمین مردم خیز کی وجہ سے معدن شعراء بھی بنا ہوا تھا۔ علامہ کے دور میں حاجی مولوی تراب علی نامی، منشی قدرت حسین قدرت، مولوی مظفر حسین شوخی، منولی منشی محمد جعفر زمہری، منشی بہاری لال خاوری، منشی موہن لال گرامی، مولوی الٰہی بخش نازش، مولوی فضل عظیم عظیم وغیرہم گلستانِ شاعری کے مختلف رنگ و بو رکھنے والے شگفتہ پھول تھے۔ نمونے کے طور پر ایک ایک دو دو شعر پیش کئے جاتے ہیں، قدرتِ بیان اور سلاستِ زبان کا اندازہ خود ہو جائے گا۔

نامی — سحر از جنبشِ شمشاد بگلگشتِ چمن — یاد م آمد روشِ قامتِ دلجوئی کسے

قدرت — بیاضِ صبحِ نورانی ز نورِ عارضش روشن — سوادِ شامِ ظلمانی ظہورِ موئے پیچانش

شوخی — دی نالہ ام کہ دم کشِ آہنگِ صور بود — شامِ فراق خندۂ صبحِ نشور بود

زمہری — اے بنامِ تو سخن تازہ چو گل — وے بحمدِ تو زباہا بلبل

دل ربائی تو ما را کہ کشد — دل موئے کاکل و پیچ سنبل

ہمانا ۱۲

ے اجازت نامہ پیش کر دیا علامہ نے جواب دہی کرتے ہوئے فرمایا میں نے
تو لکھا تھا "روکو، مت جانے دو"

علامہ نے ایسی زیرکی و دانائی سے غریبوں کا کام بھی نکال دیا اور
الزام بھی اپنے اوپر نہ آنے دیا۔

اس جملہ میں لطف یہ ہے کہ "روکو" کو مابعد سے علیحدہ کر کے پڑھا
جائے تو ممانعت کا پہلو نکلتا ہے اور اس کے ساتھ "مت" ملا کر پڑھا
جائے تو اجازت ہو جاتی ہے۔

روکو، مت جانے دو ———— روکو مت، جانے دو

لئے" حضور تحصیل" مقرر ہوئی تھی[1]

زمانۂ ملازمت میں تمام امور دیانتداری اور تدبیر کی سے انجام دیئے حکام ورعایا دونوں خوش رہے۔ قاضی الیاس حسین سبنا پوری راوی ہیں کہ زمانۂ سررشتہ داری دہلی میں ایک قطعۂ زمین کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں خواہشمند تھے۔ برادرانِ وطن نے ایک لاکھ روپیہ کی پیشکش بھی کی۔ چونکہ استحقاق مسلمانوں کا ثابت ہوا اس لئے علامہ نے وہ قطعہ زمین مسلمانوں ہی کے حوالے کردی۔

یہی انصاف پروری وہر دلعزیزی تھی جس کی وجہ سے بلند اقبال عبدالحق کی پیدائش پر رعایا نے اور بالخصوص برادرانِ وطن نے تحفے تحائف کے علاوہ لاکھوں روپئے نذر کئے[2]۔

یہی قاضی صاحب راوی ہیں کہ دہلی کے کسی پل پر کسی وجہ سے آمدو رفت ممنوع قرار دیدی گئی تھی۔ علامہ کے پاس کچھ لوگ آئے اور برات نکال لیجانے کی بصد منت والحاح اجازت چاہی۔ علامہ نے ایک دستخطی پرچہ لکھدیا کہ "روکو مت جانے دو" محافظین نے پرچہ دیکھ کر نکل جانے دیا۔ حکومت کی طرف سے جواب طلب ہوا محافظین

[1] تاریخ اودھ جلد چہارم صفحہ ۲۰۷۔ نجم الغنی خاں رامپوری۔
[2] حسرۃ العلماء بوفاۃ شمس العلماء از مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی۔

مسلک کر دیئے گئے۔ نواب کلب علیخاں نے بھی آپ سے پڑھا۔
دورانِ قیام رامپور میں اپنے مخلص دوست مرزا اسد اللہ خاں
غالب کی تعریف و توصیف اکثر نواب سے فرماتے رہے۔ تا آنکہ نواب
مرزا کے کلام کے مشتاق ہو گئے اور کچھ دن بعد تعلقات سے استواری
اختیار کرلی اس طرح مرزا کی قدیم دوستی کا حق بھی ادا کر دیا گیا۔
آٹھ برس رامپور رہنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے[۵۱] وہاں صدرالصدور
بنائے گئے ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو واجد علی شاہ
اختر اپنے والد امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد سریر آرائے سلطنت اودھ
ہوئے ابتدا عمر ہی سے عیش و عشرت کے خوگر تھے حکمراں ہونے پر
بھی عادت نے ساتھ نہ چھوڑا۔ نظام سلطنت میں ابتری پیدا ہوئی،
لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل نے دوسرے ہی سال ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ پہنچکر
فہمائش کی اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک کچہری حضور تحصیل کے نام سے مقرر
ہوئی اس کے مہتمم علامہ فضل حق خیرآبادی ہی قرار پائے، مستغیثان شاہی
درج سرکار کمپنی، سکنہ ملک اودھ کی رعیداری کا مقدمہ محکمہ جات شاہی
میں فیصل ہوا کرتا تھا۔ مگر علت ماطمع عمال سے یا سرکشی تعلقہ دار سے
وہ لوگ اپنے حق کو نہ پہنچکر ہمیشہ داد بیداد کرتے رہتے تھے مانگی دادرسی کے

---

۵۱ انتخاب یادگار منشی امیر احمد مینائی

دیدنِ عنقا در سر، وناگاہ شنا مگا سے کہ پنجشنبہ بست و پنجم ربیع الاول بود بہ نشیمنِ تنہائی من گذر افتادے. آں در گرفتنِ آتش گردا گرد والا کاشانہ، وسوختنِ خانہ، درخت ہمسا نگان از ہر کرانہ، ونرسیدنِ آسیبے بملازماں وراں مبانہ، از کجا شنودے، واگر نہ شنودے ہر آئینہ ہم حق دوستانہ، پرسش، کہ شیوۂ غم خواری واندوہ ربائی است ناگزاردہ ماندے، وہم ایزدی نیائش کہ لازمۂ حق شناسی وسپاس گذاری است تبقدیم نرسیدے، ہاں اے وفا دشمن! بیگانگاں (چوں ہیرالال) کامیاب پیام ونامہ، وآشنایان جگر تشنۂ رشحہ خامہ!!

وائے برمن کہ رقیب از تو بہ من بنماید
نامۂ وا شدہ مہر بہ عنواں زدہ[1]

ایک عرصہ تک جھجر رہے پھر مہاراجہ الور نے بلا لیا، کچھ دن بعد سہارنپور قیام رہا. دو سال تک کسی بڑے عہدے پر فائز رہے. نواب ٹونک کے پاس بھی رہے. نواب یوسف علی خاں نے رامپور بلا لیا. خود تلمذ اختیار کیا اور محکمۂ نظامت اور مرافعہ عدالتین میں

[1] یادگار غالب صفحہ ۳۴۳ وکلیات نثر غالب صفحہ ۱۱۷.

صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر، مولانا را تا پدر روکند سوئے خود طلبید و دو شالہ ملبوس خاص مدوتی دے بہاد و آب در دیدہ گرداند و فرمود؛

کہ ہر گاہ تمامی گوئید کہ من رخصت می شوم مراجراییں
کہ بپذیرم۔ گر بریست اما اردو اباداد کہ لفظ وداع
از دل سرماں بمی رسد الا بصد جر ثقیل۔

تا اینجاسخن ولیعہد بہادر است؛ غالب مستہام ارتمامی خواہد کہ واقعہ تو دلعہ مولوی فضل حق وادوہ تاکی ولیعہد بہادر، و مدروآمدن ولہائے اہل شہر بعارے روتس وبیاں دلا آویز ودآئینہ سکندر بقالب طبع درآرید و مرادریں تعقدمت ریز انگارید والسلام[۱]؛

اس خط سے مرزا غالب کا علامہ سے بے پایاں خلوص اور غم ہجر ظاہر ہوتا ہے۔ اخلاص و محبت کا پتہ ایک طویل خط کے ابتدائی حصوں سے بھی چلتا ہے۔ علامہ کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعہ لالہ ہیرالال معلوم ہوئی اس پر اس طرح لکھتے ہیں۔
' قبلہ وکعبہ اگر چہ ایں بودے کہ لالہ ہیرالال راہوائے

---

[۱] یادگار غالب صفحہ ۳۵۵

سائل بظہور آید، نگرندہ اگر دیدۂ حق بین دارد بنگرد کہ واجب
تعالیٰ شانہ اجزائے ممکنہ را کہ در کتم عدم متواری بودہ اند بمحض
عنایت پیرایۂ وجود بخشیدہ، و برآں معدومات منت نہادہ،
حقا کہ اگر تاملے بسزا کردہ شود، رقم گشتن قطعۂ تاریخ در آئینہ
سکندر ازیں عالم خبر میدہد و چوں ناخواستہ ایں چنیں نوازش
بمیاں آمد، ہر آئینہ روائی خویش را ہیچگونہ چشم نتواں داشت،
لاجرم در گذارش مدعا فصلے بہ میاں نہادہ آرزو را سرانجام
گفتگو دادہ می شود،

نہفتہ مباد کہ قدر شناسی حکام رنگ آں ریخت کہ فاضل
بے نظیر و المعی یگانہ مولوی فضل حق از سر رشتہ داری عدالتِ
دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار وا رہاند، حقا کہ اگر پایۂ علم و
فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد
یک وا ماند و باز آں پایہ را بسر رشتہ داری عدالت دیوانی
سنجند، ہنوز ایں عہدۂ دوں مرتبہ وے خواہد بود، بالجملہ بعد ازیں
استعفا، نواب فیض محمد خاں (رئیس جھجر) پانصد روپیہ ماہانہ
برائے مصارف خدام مخدومی معین کرد و نزد خود خواند،
روزیکہ مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت، ولیعہد خسرو دہلی

آنکھ سے دیکھے جاتے علامہ نے استعفا دیا نواب فیض محمد خاں والی جھجر نے پانصد روپیہ ماہوار مصارف کے پیش کئے اور قدردانی کے ساتھ اپنے پاس بلایا دہلی سے روانگی کے وقت ولیعہد سلطنت صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر نے اپنا ملبوس دوشالہ علامہ کو اڑھا دیا اور تو رخصت آبدیدہ ہو کر کہا۔

"چونکہ آپ جانے کو تیار ہیں میرے لئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کر لوں مگر خدا علیم ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے"

مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں اس المناک درد فراق کا حال لکھا ہے مولوی سراج الدین کو مرزا نے کسی واقعہ کا قطعہ تاریخ لکھکر بھیجا انھوں نے مرزا کی خواہش کے بغیر وہ قطعہ بہت سی مدح و ستائش کے ساتھ اخبار آئینہ سکندر میں چھپوا دیا جب وہ پرچہ نظر سے گذرا تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک خبر کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

"نگمانے را نامور ساختن، و ہیچ ما یہ پنداشتن عنایت سترگ، در ہمتے ست بزرگ، خاصہ کہ آں سترگ عنایت بے ابرام داعی رفتے نماید، وآں بزرگ مرحمت بے استدعائے

تو خانقاہ کے تمام مشائخ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔[۵۱]

انگریزوں کو اس بات کی بڑی خواہش و جستجو رہتی تھی کہ مسلمانوں کے خاندانی اور ذی وجاہت اشخاص افتار و صدارت کے مناصب قبول کر لیں تاکہ شمالی ہند میں انگریزی حکومت عوام میں مقبول ہو سکے ہندوستانیوں کے لئے بڑا عہدہ صدر الصدور عدالت کا تھا۔ اسلئے اکابر و افاضل کو ہی پیش کیا جا سکتا تھا۔ دہلی چونکہ قدیم دار السلطنت اور اسلامی تہذیب کا مرکز تھی اس لئے یہاں کی صدارت کے لئے خصوصیت سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ علامہ کے والد ماجد مولانا فضل امام صدر الصدور کئے گئے۔ ان کے بعد ان کے شاگرد رشید مفتی صدر الدین خاں آزردہ اس عہدے پر فائز کئے گئے۔ ان کے متعلق ریزیڈنٹ نے اکبر شاہ ثانی بادشاہ سے بھی مشورہ کر لیا تھا۔ اسی طرح سررشتہ داری پر علامہ کا تقرر ہوا۔ آخر میں لکھنؤ میں صدر الصدور کر دیئے گئے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد ریزیڈنسی کمشنری میں اپنے آپ کو تبدیل کرا لیا۔ یہاں بھی رنگ بے رنگ تھا۔ یہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے، حکام تھے تنک مزاج حفظ مراتب کہاں، ارباب علم اور بے علم سب ایک

---

[۵۱] غالب از مہر صفحہ ۲۸۸۔

ملازمت

والد ماجد کے انتقال کے وقت علامہ کی عمر اٹھائیس سال تھی خاندانی ذمہ داریوں کا بار پڑا اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا دلی میں ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا اس کے محکمہ کے سر رشتہ دار ہو گئے۔

دلی میں جب انگریزی حکومت قایم ہوئی تو علماء و لقات کا عام مسلک یہ رہا کہ انگریزی ملازمت سے اجتناب کیا جائے لیکن پھر آہستہ آہستہ نرم پڑتے گئے چنانچہ دہلی کے کئی خاندانی آدمیوں نے ملازمت اختیار کر لی تھی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز کا مولوی عبدالحئی اپنے عزیز کو ملازمت میرٹھ کی اجازت دیدینا اس دروازے کی آخری سدتک کا ٹوٹنا تھا۔ البتہ خانقاہ والوں کا مسلک غدر (انقلاب ۱۸۵۷ء) تک یہی رہا کہ وہ انگریزی حکومت کے نوکروں سے کسی طرح کا نذرانہ یا تحفہ بھی قبول نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کا وسیلہ معیشت مشتبہ ہے۔

سر سید احمد خاں مرحوم بھی خانقاہ کے مریدوں میں سے تھے اور شاہ غلام علی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے انھوں نے جب انگریزی نوکری کر لی اور اس کے بعد ملنے گئے بر حسب معمول نذرانے گئے

مولانا کے اس واقعہ سے طلبہ پر شفقت اور اولاد کی ہدایت و تربیت کا جذبہ معلوم ہوتا ہے۔ جن طلبہ کے متعلق حدیث میں یہ آتا ہو کہ فرشتے ان کے قدموں کے نیچے پر بچھاتے ہیں اس دور کا سرمایہ دار انھیں کیسی نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے یہ کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔ کاش وہ سمجھے کہ علومِ دینیہ کی بقا اور قال اللہ قال الرسول کا غلغلہ انھیں کے دم سے بلند ہے۔ اگر یہ بوریہ نشین اور غربا و مساکین کی جماعت نہ ہوتی تو ہندستان سے مذہبی علوم کا جنازہ ہی نکل چکا ہوتا۔

مولوی رحمٰن علی خاں اپنا مشاہدہ لکھتے ہیں کہ میں نے ۱۲۶۴ھ میں (یعنی ایک صدی پہلے کی بات ہے اس وقت علامہ کی عمر باون ۵۲ سال کی تھی) بمقام لکھنؤ مولانا کو دیکھا کہ حقّہ نوشی کی حالت میں شطرنج بھی کھیلتے جاتے تھے اور ایک طالب علم کو افق المبین کا درس اس خوبی سے دیتے تھے کہ مضامینِ کتاب طالب علم کے ذہن نشین ہوتے جاتے تھے[1]۔

۱۸۰۹ء سے لیکر ۱۸۵۸ء تک مسلسل پچاس برس تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ فرائضِ ملازمت، امورِ سلطنت اور تصنیف و تالیف کا شغل بھی اس میں کبھی حارج نہ ہوا۔

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند۔

لے اصحت راس آئے تو کیو نکر آئے، تھوڑا سبق پڑھایا تھا کہ بگڑ گئے۔
اس کی کتاب بھیک دی، بُرا بھلا کہہ کر نکال دیا وہ روتا ہوا مولانا
کے پاس پہنچا اور سارا حال بیان کیا فرمایا کہ ملا کو اس حیثیت کو آئے
اور دست بستہ کھڑے ہوگئے مولانا نے ایک تھپڑ ایسے زور سے دیا
کہ ان کی دستار فضیلت دور جا پڑی پھر فرمانے لگے کہ تو تمام عمر بسم اللہ
کے گنبد میں رہا ناز و نعم میں پرورش پائی جس کے سامنے کتاب رکھی
اس نے خاطر داری سے پڑھایا طلبہ کی قدر و منزلت تو کیا جانے اگر
مسافرت کرتا، بھیک مانگتا، اور طالب علم بنتا، تو حقیقت معلوم ہوتی۔
طالب علم کی قدر ہم سے پوچھ خبردار تم جانو گے اگر آئندہ ہمارے
طالب علموں سے کچھ کہا۔

دراز دستی ارمغاں من مپرس
کہ یکدم جواب ندہ تشتیم نگشت است

یہ چپ کھڑے روتے رہے کچھ دم نہ مارا، خیر قصہ رفع دفع ہوا۔
لیکن پھر کسی طالب علم سے کچھ نہ کہا۔[۱]

شاہ غوث علی صاحب جب ایک بار رامپور میں علامہ سے ملے اور
یہ واقعہ یاد دلایا تو علامہ نے اس بات و شتم اور ضرب مولم کی تائید کی۔[۲]

---

[۱] تذکرۂ غوثیہ ص۱۲۳ گل حسن شاہ پانی پتی [۲] تذکرۂ غوثیہ

درس و تدریس

ہند و بیرون ہند سے جو طلبہ مولانا فضل امام سے پڑھنے آتے۔ مولانا کے ارشاد کے مطابق علامہ بھی انھیں پڑھاتے۔

تیرہ برس کی عمر اور مسندِ تدریس پر رونق افروزی، عجیب سا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ حلقہ درس میں معمّر و صاحبِ ریش و بروت تلامذہ اور قدماء کی کتابیں زیرِ درس،

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ایک طرف یہ بزرگی اور دوسری جانب یہ اقتضاءِ طفلی کہ ایسے ہی موقعہ پر ایک چڑیا اُڑتی ہوئی درسگاہ میں آگئی جب زد پر آئی تو زقند لگا کر اسے پکڑ ہی تو لیا۔ تمام شریکِ درس طلبہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

ابتدائے تدریس کا زمانہ تھا کہ ایک طالب سے جو مولانا فضل امام سے پڑھنے آیا تھا موصوف نے فرمایا کہ میاں تم بھی فضل حق ہی سے سبق پڑھ لیا کرو۔ وہ آیا۔ غریب آدمی، بدصورت، عمر زیادہ، علم کم، ذہن کندیہ، نازک طبع، نازپروردہ، جمالِ صورت و معنی سے آراستہ چودہ برس کا سن، نئی فضیلت، ذہن میں جودت، بھلا میل ملے تو کیسے

گفتگو کرنے آئے تھے ہم خود اں سے سُن لیتے۔

حضرۃ الاستاذ علامۃ الہند مولانا معین الدین الاجمیریؒ رامپور کے ایک اعلیٰ عہدیدار (جن کا نام حافظہ میں نہیں رہا) کے متعلق یہ روایت بیان کرتے تھے کہ ان کا قول تھا کہ

"میں اس وجہ سے مسلمان ہوں کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور علامہ فضل حق خیرآبادی مسلمان ہیں"

غور کیجئے کہ اوّل الذکر کے کمالاتِ روحانیت اور ثانی الذکر کی ذہانت و فطانت کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر کیسا جما ہوا تھا۔ اس عہدیدار کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ فضل حق جیسا ذہین و فطین انسان جس مذہب کو حق سمجھے وہ یقیناً حق ہی ہوگا۔

عرض کیا شرح اشارات شفا اور افق مبین وغیرہا دیکھتا ہوں۔
مجتہد صاحب کو بڑی حیرت ہوئی، افق المبین کی کسی عبارت کا
مطلب پوچھ لیا۔ علامہ نے ایسی مدلل تقریر کی کہ متعدد اعتراضات
صاحب افق مبین پر کر گئے۔ معزز مہمان نے اعتراضات کی جوابدہی
کی کوشش کی تو ان کو جان چھڑانا اور بھی دوبھر ہو گئی۔ جب خوب
عاجز کر لیا تو اپنے شبہات کے ایسے انداز میں جوابات دیئے کہ تمام
ہمراہی علما بھی انگشت بدنداں ہو گئے۔
آخر میں آپ نے یہ بھی اظہار کر دیا کہ حضرت شاہ صاحب کا ادنیٰ
شاگرد اور کفش بردار ہوں، اور اظہارِ معذرت کرتے ہوئے رخصت
ہوئے۔
علمائے ایران نے اندازہ کر لیا کہ اس خانقاہ کے بچوں کے علم و فضل
کا جب یہ عالم ہے تو خود شیخِ خانقاہ کا کیا حال ہوگا۔
صبح کو جب خیریت طلبی مہمانان کے لیے شاہ صاحب نے آدمی
بھیجا تو پتہ چلا کہ آخر شب میں دہلی ہی سے روانہ ہو چکے ہیں۔
شاہ صاحب کو بڑی حیرت ہوئی سببِ ناخوشی مہمانان معلوم
کرنے کی کوشش فرمائی تو فضلِ حق کی کرشمہ سازیوں کا راز کھلا بلا کر
بہت ڈانٹا کہ مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جاتا۔ وہ ہم سے

فطانت وذہانت

۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں تیرہ سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم عقلیہ و نقلیہ وآلیہ کی تکمیل کی۔ چار ماہ اور کچھ روز میں قرآن مجید حفظ کیا[۱]۔
تواتر سے یہ روایت بھی ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے رد شیعہ میں تحفۂ اثنا عشری محققانہ انداز میں تحریر فرمائی تو شیعیان ہند کی طرح اہل تشیع ایران میں بھی ہیجان پیدا ہوا ایران سے میرباقر داماد صاحب افق مبین کے خاندان کا متبحر عالم ومجتہد اونٹوں پر کتب فریقین بار کر کے شاہ صاحب سے مناظرہ کے لئے دہلی بھیجا خانقاہ میں داخل ہونے پر شاہ صاحب نے فرائض میزبانی ادا فرماتے ہوئے مناسب جگہ قیام کے لئے تجویز فرما کر رحمت سفر کھلوایا۔
شام کو فضل حق حاضر ہوئے تو شاہ صاحب کو مصروف مہمان نوازی دیکھ کر کیفیت معلوم کی تھوڑی دیر حاضر خدمت رہ کر بعد مغرب مجتہد صاحب کی خدمت میں پہنچے مراحل پرسی کے بعد کچھ علمی گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مجتہد صاحب نے پوچھا
"میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو"

---

[۱] سیر العلماء

اس مباحثہ سے شاہ صاحب کا مقصد صرف تنبیہ تھا کہ اساتذہ کی جانب سوءِ ظنی حصولِ علم سے مانع ہوتی ہے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان عقیدت ہی کا رابطہ ہوتا ہے جو افہام و استفہام میں معین و مددگار بنتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس دور میں کامل کے بجائے ناقص اور لائق کے بدلے نالائق افراد کی بہتات ہے۔

کے اندر بٹھا دو اور جب فضل حق اور صدر الدین آئیں تو ان کو وہیں صحن میں بٹھا دینا۔ ان کے آنے پر تشریف لائے اور فرمایا کہ میاں آج سبق پڑھانے کو جی نہیں چاہتا البتہ یہ جی چاہتا ہے کہ کچھ معقولیوں کی خرافات میں گفتگو ہو

یہ دونوں اس میدان کے مرد تھے ہی فوراً بولے جیسی حضرت کی خوشی" شاہ صاحب نے کہا کہ کوئی مسئلہ تو تم پہلو تم اختیار کرو اور کمزور مجھے دو چنانچہ "حصول الاشیاء بانفسہا و باشباحہا" پر گفتگو شروع ہوئی۔

شاہ صاحب نے دلائل سے " باشباحہا " کے قول کو ثابت کر دکھایا۔ بالآخر دونوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ شکست تو کھا گئے لیکن یہ شکست روایت سے کھائی ہے علمیت سے نہیں۔ لاجواب تو ہو گئے لیکن بات وہی ٹھیک ہے جو ہم کہتے ہیں۔ (یہ بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ ہے علامہ نے حاشیۂ قاضی مبارک میں اس پر مفصل و مدلل خامہ فرسائی فرمائی ہے۔)

شاہ صاحب نے فرمایا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ ہم کو معقول نہیں آتی، ہم نے اس کو ناقص اور واہیات سمجھ کر چھوڑ دیا ہے مگر اس نے ہمیں اب تک نہ چھوڑا وہ اب تک ہماری قدم بوسی کئے جاتی ہے۔

لطف اللہ[۵۱] علیگڈھی اس کے راوی ہیں کہ ایک روز علامہ اور مفتی صدر الدین خاں یہ باتیں کرتے آرہے تھے کہ اس خاندان کے لوگ علوم دینیہ حدیث، فقہ، تفسیر وغیرہا خوب جانتے ہیں مگر معقولات نہیں جانتے۔ یہ دونوں ابھی شاہ صاحب تک پہنچے بھی نہ تھے کہ شاہ صاحب نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ ایک بوریا مسجد سے باہر صحن میں ڈال دو اور ایک مسجد

۵۱ ضلع علیگڈھ کے قصبہ پلکھنہ میں ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے "چراغم" مادۂ تاریخ پیدائش ہے۔ علیگڈھ کے مشہور ولیٔ باخدا حضرت شمس العارفین شاہ جمال کی اولاد سے ہیں۔ ممدوح کا نسب حضرت ابو عبیدۃ بن الجراحؓ سے ملتا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں حضرت شمس العارفین کا ذکر کیا ہے۔ ابتدائی اُستاد سید رونق علی، میاں جی موہن لال، مولوی محمد عظیم اللہ اور مولوی حفیظ اللہ رہے درسیات مولانا عنایت احمد کاکوروی مفتی و منصف کول سے پڑھے ۱۸۵۷ء کے قبل استاد کے محکمہ بریلی کے سرشتہ دار ہوئے۔ "غدر" کے بعد مفتی عنایت احمد انڈمان بھیجدیئے گئے۔ یہ علیگڈھ آگئے ابتدا میں کائیتوں کے قائم کردہ مکتب میں دس روپیہ ماہانہ پر زندگی بسر کی۔ اس کے بعد استاد نے انڈمان سے واپسی پر مدرسہ فیض عام کانپور میں مدرس دوم کردیا کچھ دن بعد مدرس اول ہوگئے۔ سات برس کانپور رہنے کے بعد مدرسہ جامع مسجد علیگڈھ میں مدرس اول ہوئے پچاس روپیہ مشاہرہ ہوا ۱۲۸۵ھ سے ۱۳۱۲ھ تک مسلسل درس دیا ۱۳۱۲ھ میں تقلید و عدم تقلید کے قصے میں زہر دیا گیا۔ اس سے اللہ نے نجات دی ۱۸۹۵ء میں ساسو روپیہ ماہانہ پر صدارت المدرسین پر حیدرآباد میں تقرر ہوا۔ بعد میں ایک ہزار تنخواہ پر مفتیٔ عدالت ہوگئے ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء عرفہ کے دن نوّے برس کی عمر میں علیگڈھ میں وفات ہوئی۔ شاہ جمال میں مدفون ہوئے استاذ العلماء مادہ تاریخ ہے (استاذ العلماء مصنفہ نواب صدر یار جنگ بہادر)

معسرین، محدثین، فقہا، فلاسفہ، اولیاء اور شعراء جس طبقہ پر نگاہ ڈالئے
رکدام ماعےلےگل کہ جیس حوش اہت لویب
زمان یہلے ساحتہ آجاتا تھا۔

والد ماجد مولانا فضل امام صدر الصدور نے مکان کے علاوہ ہاتھی
اور پالکی پر بھی دربار آتے جاتے وقت ساتھ بٹھا کر درس دینا شروع
کیا علوم آلیہ میں صغرسنی ہی میں ایسا مہیا کیا کہ روزگار سادیا معقولات
کی تحصیل کے لئے دربار حضرت شاہ عبدالقادر محدث اور حضرت شاہ
عبدالعزیز محدث دہلوی میں بھیجا یا۔

علامہ فضل حق وہاں بھی ہاتھی ہی پر جاتے تھے مفتی صدرالدین
خاں آزردہ بھی ساتھ ہوتے تھے رئیس زادہ ہونے کی وجہ سے کبھی
حد منگار کتاب ساتھ لے کر پہنچا تو شاہ صاحب کتب سے مطلع ہو کر اس
روز سبق نہ پڑھاتے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ اس
دربار میں تربیت کا بھی پورا لحاظ رہتا تھا۔ علم کی عظمت سکھائی جاتی
تھی اسناد کی وقعت کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ مولوی اکرام اللہ
بروایت مفتی انعام اللہ گوپاموی پدر بزرگوار خود، مولانا احمد علی
خیرآبادی بروایت مولانا ماجد علی شاگرد مولانا عبدالحق خیرآبادی
اور مولانا عبدالدین غلوی بروایت استاذ العلماء مولانا

بھی تھے، تصوف و معرفت میں ان کا ڈوبا ہوا کلام اب بھی اودھ کے قوالوں کو یاد ہے جو اعراس کے مواقع پر زینتِ محافل بنتا ہے۔ اس وقت بھی حضرت شاہ مقبول میاں صاحب قلندر کی بدولت خیرآباد مرجع خلق بنا ہوا ہے۔

علماء میں پچھلے دور میں سب سے بڑی شخصیت مولانا حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی شاگرد ملا قطب الدین شمس آبادی کی گذری ہے۔ آپ کے صاحبزادے مولانا احمد اللہ ان کے شاگرد ملا عبدالواجد کرمانی[ل] خیرآبادی صاحبِ فضل و کمال اور دور و نزدیک مشہور تھے۔

علامہ خیرآباد سے دہلی پہنچے تو ایک سے بڑھ کر ایک باکمال نظر آیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷) ۴۷ سال کی عمر میں ۱۹ ذیقعدہ سنہ ۱۲۶۶ھ کو وصال ہوا۔ حافظ محمد اسلم رحمۃ اللہ علیہ آپ کے بھتیجے اور شاگرد و مرید تھے۔ اپنے عہد کے باکمال بزرگ تھے۔ ۲۰ ذیقعدہ سنہ ۱۳۰۲ھ کو وصال ہوا۔ پیر و مرشد کے برابر علیحدہ مزار میں مدفون ہیں۔ ۱۲

ل موصوف خوش تقریر فاضل تھے۔ آپ کا ہر شاگرد درجۂ کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ تقریر ایسی فرماتے کہ عامی اور بازاری انسان بھی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔ مولانا محمد اعلم سندیلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ استاد، شاگرد پر بے انتہا شفقت کرتے تھے۔ بعض کتابیں ملا و تاج الدین بن مولوی قطب الدین گوپاموی سے پڑھیں صدرا کے کچھ اسباق، مولوی غلام طیب کی معیت میں مولانا احمد اللہ خیرآبادی ابن حاجی صفت اللہ محدث سے بھی پڑھے سنہ ۱۲۱۸ھ میں رحلت ہوئی۔ ایک عزیز نے تاریخ وفات کہی۔

روز جمعہ کو بود چارم عید	از جہاں سوئے جنت الماوٰی
رفت، آمد نوید از رضواں	رضی اللہ عنک، زود بیا (آمدنامہ)

آج بھی زیارت گاہ خلائق ہیں مولوی شاہ محمد صالح عرف ملا میاں، شیخ موسیٰ، اور شاہ غلام یحییٰ گیارھویں اور بارھویں صدی کے باکمال بزرگ اور وحید عالم گذرے ہیں آخری دور میں حضرت معشوق علی شاہ، حافظ محمد علی شاہ[15] اور حافظ محمد اسلم رحمہم اللہ اپنے اپنے وقت کے صاحب کشف و کرامات بزرگ ہوئے ہیں یہ بزرگان کرام شاعر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶) روزانہ یاد کرتے اور شب میں ہر سبق ایک ہزار بار دہراتے، قرآن پاک بھی اسی طریقہ پر حفظ کیا بچپن ہی سے آثار رشد پیشانی سے ہویدا تھے سن تمیز کو پہنچے تو مولانا اعظم کھوسوی سے کسب علوم کر کے سرآمد علماء عصر ہوئے حضرت شاہ ماثور اللہ سرہندی کے مرید ہوئے ہمراہ حضرت شیخ کے شاہ بینا عالم جاودانی کو روانہ ہوئے تو مرید خاص کو کھوسو اقامت کھوسو کے بعد خیرآباد جانے کی بشارت ہوئی آپ نے خیرآباد پہنچکر وہیں سکونت اختیار کر لی ایک عالم فیضیاب ہوا کثرت سے خوارق و کرامات کا ظہور ہوتا رہا جس قدر نذرانے آتے مسافرین و واردین و صادرین پر صرف فرما دیتے گیہوں کی روٹیاں مستحقین کو تقسیم ہوتیں، متعلقین کو نان جو سے ملا کرتیں آباد کیا، جب وصال ہوا ہے تو عالم یہ تھا کہ کچھ بھی گھر میں نہ نکل سکا سالہا مسند تدریس و ارشاد کو رونق بخشی اور اپنے شیخ طریقت کی طرح آخر تک حصور یعنی غیر شادی شدہ رہے تصانیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا شرح بزدوی حسامی کافیہ مصلح وغیرہا لکھیں جمع السلوک رسالہ مکیہ کی شرح لکھی اور اس میں ملفوظات و حالات شاہ بینا بھی کافی درج کر دیئے ہیں۔ (مآثر الکرام)

[15] موصوف ۱۱۹۰ھ میں قصبہ گھیری (اودھ) میں پیدا ہوئے دہلی اور اجمیر میں اقامت کی تونسہ جا کر حضرت شاہ سلیمان صاحبؒ کے مرید و خلیفہ ہوئے مولانا عبدالوالی عرف پیر بخش سرو جامی صنعت اللہ محدث خیرآبادی کے شاگرد تھے حدیث مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے پڑھی۔ علامہ کے استاد بھائی اور ہم عصر تھے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۴۸)

تعلیم و تربیت

علامہ نے آنکھ کھولی تو گرد و پیش، علم و فضل اور امارت و ریاست کو جلوہ گر دیکھا۔ خاندانی حالات سے پتہ چل گیا ہوگا کہ نسلاً بعد نسلٍ اَبًا عن جدٍ علم و امارت، دونوں ساتھ ساتھ وراثت بنے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ کے اخلاف ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مادی ریاست سے محروم ہو کر بھی مستغنی اور کوہ وقار رہے۔ خلف الصدق شمس العلماء مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی کی نازک مزاجی، سیر چشمی اور اولوالعزمی کے واقعات اب بھی چشم دید بیان کرنے والے ملتے ہیں۔

ہندستان کے مشہور مردم خیز قصبات میں خیرآباد (ضلع سیتاپور اودھ) کا نام بھی صفِ اول میں صدیوں سے رہا ہے۔ شاہی زمانے میں کمشنری کا پایۂ تخت بھی رہ چکا ہے۔ محلہ میاں سرائے میں ابتک گڑھی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ محلہ توپخانہ اور فراشخانہ بھی ابتک موجود ہے۔ اولیاء کرام، علماء عظام، بڑے بڑے نامور گذرے ہیں۔ مخدوم شیخ سعدالدینؒ[1]، مخدوم نظام الدین اللہ دیہؒ کے مزارات

[1] شیخ سعدؒ کے والد ماجد مولوی بڈھن قصبۂ اناؤ کے قاضی تھے۔ فرزند کو عالم طفلی میں ہی چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کر گئے۔ مکتب میں پہنچنے کے بعد اپنا سبق (باقی حاشیہ صفحہ ۲۷ پر)

مطابق ۱۸۲۶ء کو مولانا نے سفر آخرت اختیار کیا مرزا غالب نے
حسب ذیل تاریخ وفات لکھی

اے دریغا قدوۂ ارباب فضل — کرد سوئے جنت الماوی خرام
چوں ارادت از پئے کسب شرف — جست سال فوت آں عالی مقام
چہرۂ ہستی خراشیدم نخست — تا سزائے تخرجہ گردد تمام
گفتم اندر سایۂ لطف نبی
باد آرامگہ فضل امام[۵]
۵ ۱۲ ۴

احاطۂ درگاہ مخدوم شیخ سعد الدین خیرآبادی میں اپنے دادا استاد مولانا
محمد اعلم سندیلوی اور استاد ملا عبدالواحد کرمانی خیرآبادی کے قریب مدفون
ہوئے ان تینوں قبریں شکستہ ہیں ممکن ہے کچھ دن بعد آثار بھی باقی نہ رہیں
اس وقت بھی ان کے جاننے والے خال خال ہیں کاش کوئی قدرداں علم
بزرگ ان کے نام کے پتھر لگا کر ان فضلا کے آثار قبور کو مٹنے سے بچا لیتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴) جائداد ضبط ہوئی۔ بعد میں کچھ جائدادیں ملی وہ گوشہ نشیں ہوگئے فتوی
پر دستخطوں کے سلسلے میں شہرت تا عمر بحال رہی تا عمر کہکر جہاں سے گزرے ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۳ھ
مطابق ۱۸۶۶ء بروز پنجشنبہ وفات پائی چراغ دو جہاں بود مادہ تاریخ ہے مرزا غالب
بھی جو مفتی صاحب کے مجلس و ہم نشیں تھے اسی سال راہی ملک عدم ہوئے سر سید احمد خاں
نے آثار الصنادید میں والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے

۵ سبد چین غالب

مولانا نے دہلی میں خواب دیکھا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکان میں فروکش ہوئے ہیں اور فلاں کمرے میں اقامت گزیں ہیں۔ تعبیر دریافت کرنے کے لئے علامہ کو حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جاکر فوراً سامان کمرے سے نکال لو اور اس کو بالکل خالی کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ خالی ہوتے ہی وہ کمرہ فوراً گر گیا۔

یہ چیز سمجھ میں نہ آئی شاہ صاحب سے دریافت کیا گیا کہ یہ تعبیر کیونکر ہوئی۔ فرمایا کہ اس وقت بے اختیار یہ آیت ذہن میں آگئی تھی

ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا۔

ہزاروں تلامذہ میں سب سے زیادہ نمایاں علامہ فضل حق اور مفتی صدرالدین خاں[1] آزردہ صدر الصدور دہلی ہوئے۔ ۵ ر ذی قعدہ سنہ ۱۲۴[illegible]ھ

---

[1] مفتی صاحب دہلی میں سنہ ۱۲۰۴ھ مطابق سنہ ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت "چراغ" ہے باپ دادا کشمیری تھے۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور مولانا فضل امام خیرآبادی کے شاگرد رشید، علامہ فضل حق کے ہم درس اور عمر میں علامہ سے آٹھ سال بڑے تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شاہ نصیر اور میر ممنون دہلوی سے تلمذ تھا۔ نواب یوسف علی خاں والئی رامپور، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی، اور سر سید احمد خاں مخصوص تلامذہ سے ہیں۔ منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال، درالمنضود فی حکم امرأۃ المفقود اور اجوبۂ کثیرہ مستفتیان یادگار ہیں۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں بغاوت کے الزام میں دھر لئے گئے۔

خیرآبادی سے بیعت تھے آپ کے ایک صاحبزادے عالم جوانی میں فوت ہوگئے۔ اقتصادی وعمری احکام شرعیہ کے پابند تھے اس لئے مولوی احمد صاحب کو تشویش رہتی تھی پیر مرشد کی خدمت میں قلبی بے چینی ظاہر کی پیر نے دعا کی' شب میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی کہ سرور رسالت مآب کے باغ میں (جہاں مرحوم کی قبر تھی) تشریف لائے اور بیل کے درخت کے نیچے وضو فرمایا بعد نماز فجر پیر و مرید دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے روانہ ہوئے راستہ میں دونوں ملاقی ہوئے تو ایک دوسرے کو بشارت کا حال بتایا وہیں سے دونوں پکے باغ میں پہنچے تو دیکھا کہ مقام معہود پر وضو کا اترا ہوا پانی کی تری موجود تھی ایک عرصہ تک لوگ اس جگہ کی زیارت کرتے رہے۔ مولانا نقی علی خاں بھی مع صاحبزادہ مولانا احمد رضا خاں ۱۳۰۹ھ میں اس مقام کی زیارت کے لئے بریلی سے خیرآباد پہنچے اور مولانا حسن بخش کے مہماں ہوئے افسوس اب وہ درخت باقی ہے نہ اس جگہ کا پتہ چل سکتا ہے۔ مفتی فخرالحسن خیرآبادی جو ان معزز مہمانوں کی زیارت میں شریک رہے تھے حظیرہ کے پاس اس بیل کے درخت کی جگہ بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے شفیق باپ نے فضل امام کی تربیت میں کیا کسر اٹھا رکھی ہوگی۔

"اکمل افراد نوع انسی، مہبط انوار فیوض قدسی، سراب سرچشمۂ عین الیقین، موسس اساس ملت و دین، ماحیٔ آثار جہل ہادم بنائے اعتساف، محی مراسم علم بانیٔ مبانی انصاف، قدوۂ علمائے فحول، حاوی معقول و منقول سند اکابر روزگار مرجع اعالی و ادانی ہر دیار، مزاجدان شخص کمال، جامع صفات جلال و جمال، مورد فیض ازل و ابد، مطرح انظار سعادت سرمد مصداق مفہوم تمام اجزار واسطۃ العقد، سلسلہ حکمت اشراقی و مشائی، زبدۂ کرام، اسوۂ عظام، مقتدائے انام، مولانا مخدومنا مولوی فضل امام، ادخلہ اللہ المقام فی جنۃ النعیم بلطفہ العمیم"

مولانا روحانیت میں بھی بلند مرتبہ رکھتے۔آپ کے والد شیخ محمد ارشد فرشتہ سیرت انسان تھے۔مولانا احمد اللہ[۵] بن حاجی صفت اللہ محدث

[۵] موصوف علم ظاہری و باطنی دونوں میں باکمال تھے۔اپنے والد ماجد اور ملا کمال الدین سہالوی کے شاگرد تھے۔والد سے ہی بیعت تھے،صاحب کرامات اور عالم علم کشف قبور تھے۔ایک بار وبائی بخار پھیلا۔بہت لوگ ہلاک ہوئے۔قاضی غلام امام بھی اسی میں مبتلا ہوئے۔ان کے والد قاضی حفظ الملک اپنے اکلوتے بیٹے کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔کپڑے پھاڑ کر ننگے ہوئے جا رہے تھے کہ فرشتۂ رحمت بنکر مولانا احمد اللہ اچانک عیادت کو پہنچ گئے۔یہ حال دیکھکر رقت طاری ہوگئی۔اس بخار کو اپنی طرف منتقل کر لیا اور قاضی صاحب کو تسلی دی کہ آپ پریشان نہوں یہ بلا میں نے اپنے سر لے لی۔مولانا کو گھر پہنچتے پہنچتے بخار نے آدبایا اور شدت بڑھتی گئی تیسرے چوتھے روز شب جمعہ میں ۵ ۴ رحلت فرمائی۔والد ماجد کے پاس مدفون ہوئے رحمۃ اللہ علیہ۔(آمد نامہ)

کرستادعالم جاودانی کورحصت ہوگئےمیں نے کھی تعلیم کوحیرماد کہدیا کہ نہ ایسا شفیق وقابل استاد ملے گا نہ پڑھوں گا۔[۱]

ایک مارحب یہی شاہ صاحب علامہ فضل حق کوملے اورموصوف نے تعلیم کے ناممکل رہ جانے پراظہار افسوس کیا تو کہنے لگے۔

"اگر پورے عالم ہوجاتے توکیا ہوتا زیادہ سے زیادہ آپ جیسے ہوتے"

علمی قابلیت کا اندازہ تو اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک جانب شاہ عبدالعزیز اورشاہ عبدالقادر کا ڈنکا معقولات میں بج رہا تھا اور دوسری طرف اسی دہلی میں مولانا فضل امام کے معقولات کا سکہ چل رہا تھا طلبا دونوں دریاؤں سے سیراب ہورہے تھے۔مفتی صدرالدین خاں آزردہ، علامہ فضل حق وغیرہما بھی دوسرے طلبا کی طرح حدیث ایک جگہ پڑھتے تھے اورمنطق وفلسفہ دوسری جگہ۔خود علامہ کی ذات گرامی مولانا کی مسلم الثبوت قابلیت کی شاہد عادل ہے۔

سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں مولانا کا ذکرحسن عقیدتمندی سے کیاہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، ابتداء ان صفات والقاب سے کی ہے۔

---

[۱] تذکرہ عوثیہ صفحہ ۱۷

غیر مطبوعہ ہیں، سب سے زیادہ مشہور تصنیف منطق میں مرقات[1] ہے جو تمام مدارس عربیہ میں داخل نصاب ہے۔ میر زاہد رسالہ[2]، میر زاہد ملا جلال[3] اور افق المبین[4] پر حواشی لکھے۔ تلخیص الشفا[5]، نخبۃ السر[6] اور آمدنامہ[7] تصنیف کیا[5]۔

فرائض ملازمت کے ساتھ مشغلۂ تدریس و تصنیف ہمیشہ جاری رکھا۔ مادۂ افہام و تفہیم خدا نے ایسا بخشا تھا کہ ایک بار شریک درس ہونیکے بعد طالب علم دوسری طرف کا رُخ بھی نہ کرتا تھا۔ شاہ غوث علی صاحب جو موصوف کے شاگرد اور صوفی منش بزرگ گذرے ہیں۔ جنھوں نے تمام عمر سیاحت میں بسر کی، ان کا بیان تذکرۂ غوثیہ میں نظر سے گذرا۔ فرماتے ہیں شاہ عبد العزیز صاحب، شاہ عبد القادر صاحب، اور مولانا فضل امام کی شاگردی کا مجھے فخر حاصل ہے، آخر الذکر استاد کی جو شفقت میرے حال پر تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ مولانا کے ساتھ دہلی سے پٹیالہ تعلیم کی غرض سے میں بھی چلا گیا۔ میری عمر اٹھارہ سال کی تھی کہ

---

[5] حاشیۂ میر زاہد رسالہ امانت علی خورجوی کے ہاتھ کا ۱۲۳۳ھ کا لکھا ہوا بخط نخبۃ مالبقرا اور تلخیص الشفا خود مصنف کے دستِ مبارک کا مبیضہ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے نوادر قلمی میں محفوظ ہے۔ نخبۃ السر کتابخانۂ صاحبزادہ عبید اللہ خاں رئیس ٹونک میں، حاشیہ افق المبین کتبخانہ مولوی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی میں اور آمدنامہ کتابخانہ سید ولایت احمد سجادہ نشین آستانہ قلندریہ لاہرپور میں موجود ہیں ۱۲۔

مولانا شاہ صلاح الدین صفوی گوپاموی (تلمیذ رشید مولانا محمد اعظم[1] سندیلوی و مرید و خلیفہ مولانا شاہ قدرت اللہ صفی پوری) کے مرید تھے۔ مولانا نے بیسیوں مفید و معرکۃ الآراء کتابیں لکھیں، جن مصنفات کا نام اور پتہ معلوم ہو سکا وہ درج کی جاتی ہیں دو ایک کے سوا سب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) دوسری زوجہ مولوی نور محمد ظاہر پوری کے خاندان سے تھیں ان کے بطن سے حرمت بی بی اہلیہ حسن احمد، تماقا نا کتھدا، خدیجہ اہلیہ سید محمد بخش بن امانت اللہ ظاہر پوری، سردار النساء اہلیہ مولوی ارشاد حسن خیرآبادی وکیل ٹونک اور امتہ الفاطمہ اہلیہ حکیم نور علی سندیلوی و دو شاہ امین مولانا عبدالحق خیرآبادی پیدا ہوئیں تیسری دختر خدیجہ کے صاحبزادے حاجی لطف احمد تھے جن کی دختر کلثوم النساء منکوحہ حاجی سید فخر الحسن رئیس خیرآباد کو منسوب ہوئیں مفتی صاحب موصوف نے دوسری شادی دختر یعقوب علی سندیلوی سے کی جن سے دو صاحبزادے مولوی سید محمد حسن اور سید معیار الحسن اور دو صاحبزادیاں ہوئیں مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی صالح نوجوان پاک سیرت پاکباز ہیں راقم السطور کے ساتھ خیرآباد و اجمیر میں گیارہ سال تک شریک درس رہے ہیں علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری مرحوم سے آخر وقت تک استفادہ کیا ہے اپنے مکان سے متصل حضرت مخدوم اللہ دیا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں صبح کو درس قرآن پاک اور اس کے بعد مختلف فنون کی کتابیں پڑھا کر اجر عظیم حاصل کرتے ہیں۔ اس وقت خیرآباد کی حضرات میں مولوی حافظ حکیم احمد علی کے بعد دوسرے عالم ہیں اور سلسلۂ درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کا سلسلہ صرف انہیں سے جاری ہے مولانا فضل امام کے پرداد استاد مولانا محمد صفت اللہ صاحب محدث خیرآبادی کی اولاد امجاد سے ہیں علامہ کی اس سوانح حیات میں موصوف سے بڑی مدد ملی ہے۔ مولانا فضل امام کی تیسری زوجہ سے دو صاحبزادے مولوی اعظم حسن اور مولوی مظہر حسن تولد ہوئے۔ اول الذکر کو بی بی طیبہ دختر مولوی قادر حسن سے منسوب ہیں

[1] سیر العلماء صفحہ ۲۲ حکیم بہاء الدین صدیقی گوپاموی

"شاگرد رشید مولوی سید عبدالواجد خیرآبادی بمنصب صدر الصدوری شاہجہاں آباد از سرکار انگریزی عزت و امتیاز داشت بر میر زاہد رسالہ و میر زاہد ملا جلال حواشی نوشتہ، در علوم عقلیہ گوئے سبقت ربودہ، آمدنامہ کہ دراں قواعد فارسی بیان کردہ و نیز ترجمہ علمائے جوار لکھنؤ تحریر فرمودہ بس مفید مبتدیان است"

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اور جنرل ایکٹرلونی کے میر منشی تھے۔ مولوی محمد صالح کی صاحبزادی بی بی نعمت اور صاحبزادے مولوی الٰہی بخش نازش خیرآبادی تھے۔

مولانا فضل امام نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بی بی صدرپور کی تھیں۔ ان سے علامہ فضل حق مولانا فضل عظیم اور مولوی فضل رحمٰن پیدا ہوئے۔ مولانا فضل عظیم کی ایک صاحبزادی بی بی اتل تھیں جن کے صاحبزادے سید نیاز علی تھے (از خاندان مخدوم اللہ دیا رحمۃ اللہ علیہ) سید نیاز علی کی شادی نورالحسن خاں ابن مولوی قادر بخش کی دختر سے ہوئی۔ مولوی فضل رحمٰن نے دو شادیاں کیں پہلی بی بی سے دو صاحبزادیاں ہوئیں بی بی مریم[۱] زوجہ نورالحسن خاں بی بی ہاجرہ[۲] زوجہ شمس العلما مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی۔ بی بی ہاجرہ سے بی بی عائشہ پیدا ہوئیں جو صوفی محمد حسین بسمل برادر مضطر خیرآبادی کی زوجہ تھیں۔ مولوی فضل رحمٰن کی دوسری زوجہ سے جو دہلی کی تھیں دو صاحبزادے مولوی فضل حکیم اور مولوی فضل علیم پیدا ہوئے اول الذکر کے صاحبزادے خان بہادر فضل متین سشن جج ریاست پٹیالہ تھے۔ آخر الذکر کی دو صاحبزادیاں تھیں ایک کا عقد سید اعجاز الحسن رئیس خیرآباد سے ہوا جن کے صاحبزادے خان بہادر سید احراز الحسن خاں چیرمین میونسپل بورڈ خیرآباد ہیں (موصوف تقریباً تیس سال سے مسلسل چیرمین ہو رہے ہیں جو ایک ریکارڈ ہے) دوسری صاحبزادی دہلی میں منسوب تھیں۔ انھیں صدرپور کی بی بی صاحبہ سے تین صاحبزادیاں بھی ہوئیں۔ نورالنساء[۱] اہلیہ غلام مخدوم سندیلوی، مہرالنساء[۲] اہلیہ یکے از خاندان نوابان گوپامؤ، ظہورالنساء اہلیہ قاضی غلام یٰسین بن غلام محمد (بقیہ برصفحہ آئندہ)

والد ماجد مولانا فضل امام خیرآبادی[1] تھے۔

موصوف بڑے طباع و ذہین تھے۔ مولانا سید عبدالواحد کرمانی خیرآبادی کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ علوم نقلیہ و عقلیہ انہیں سے حاصل کئے اس کے بعد صدر الصدوری کے عہدۂ جلیلہ پر دہلی جاکر فائز ہوئے تذکرۂ علمائے ہند میں ہے۔

[1] مولانا کی دو شادیاں کیں زوجہ اولیٰ خاندان مفتیان لکھنؤ سے تھیں ان سے احمد حسین میاں عرف خیرا میاں صاحبزادے اور رحیم النساء صاحبزادی ہوئیں۔ احمد حسین میاں کے صاحبزادے مولوی فضل احمد کے حقیقی صاحبزادے تھے منشی کرم احمد آپ امجد علی شاہ فرمانروائے اودھ کے وزیر اعظم نواب شرف الدولہ بہادر کے میر منشی تھے منشی حسن احمد آپ مولوی عنایت احمد وکیل دہلی کے والد تھے منشی حسن احمد آپ نواب بشیر احمد مرحوم داماد ہز ہائی نس نواب عظیم جاہ انتظام الملک بہادر سوم پرنس آف ارکاٹ (مدراس) کے والد تھے جن کے خلف الصدق مولوی ظہیر احمد فاروقی رئیس وصولی مدد وسیہ یار یہ خیرآباد و لائف مجسٹریٹ، راقم السطور کے قدیمی کرم فرما اور مخلص کرم فرما بزرگ ہیں۔ اس خاندانی شجرہ اور دوسرے معلومات میں موصوف نے بڑا ہاتھ بٹایا ہے

دو صاحبزادیاں تھیں ایک علامہ کی شریک حیات اور مولانا محمد عبدالحق کی والدہ ماجدہ تھیں اور دوسری خان بہادر نواب مظہر علی داماد ہز ہائی نس پرنس آف ارکاٹ کی والدہ تھیں

دوسری زوجہ سید محمد شکر اللہ کی دختر تھیں جو فرزندان قطب وقت مخدوم اللہ دیہ خیرآبادی سے تھے ان سے حسب ذیل اولاد ہوئی

مولانا فضل امام، مولوی محمد صالح، بی بی عائشہ، ان بی بی صاحبہ کی صاحبزادی علیمہ حضرت شیخ وقت معشوق علی شاہ خیرآبادی کی زوجہ تھیں اور صاحبزادے منشی برکت علی خاں، مولانا قادر بخش برادر مولانا نبی بخش خیرآبادی کے خسر (بقیہ صفحہ آئندہ)

بر کافیہ شرح مبسوط و بر تحریر اقلیدس حاشیہ و تعلیقات متفرقہ بر ہدایہ نوشتہ بود چوں در عہد بہادر شاہ اول تمام اسباب آبائی قصبہ ہرگام بتاراج رفت ......

و دیگر مردم اشرار کتب آتش دادند ہمہ کتب خانہ سوخت و برباد شد، ....

در ہرگام وفات یافت ہمانجا مدفون شد"

ملا عبدالواجد کے صاحبزادے اور علامہ کے پردادا حافظ محمد صالح تھے۔ عہد محمد شاہ بادشاہ میں منصب پر فائز تھے۔ جاگیر شاہی بھی ملی ہوئی تھی۔ قاضی مبارک گوپاموی شارح سلم کے معاصر و دوست اور مؤلف تذکرۃ الاولیا تھے۔

حافظ محمد صالح کے دو صاحبزادے شیخ جعفر ہرگامی اور شیخ محمد ارشد ہرگامی خیرآبادی اور دو صاحبزادیاں متولد ہوئیں۔ ایک صاحبزادی ملا معزالدین گوپاموی اور دوسری شیخ خیرالدین فاروقی بن شیخ خیراللہ العمری گوپاموی (از اقربائے نواب والاجاہ محمد علی) کو منسوب ہوئیں۔

علامہ کے دادا شیخ محمد ارشد نے ہرگام کو خیرباد کہکر خیرآباد (ضلع سیتاپور اودھ) آباد کیا۔ موصوف کی زوجۂ ثانیہ سے علامہ کے

مؤلف ربع فتاوی عالمگیری کو بیاہی گئی تھیں۔

دوسری صاحبزادی خاندان صدیقیاں قصبہ لاہر پور (ضلع سیتاپور) میں منسوب ہوئیں اس خاندان کے ایک بزرگ روم سے واردِ ہند ہو کر اقامت گزیں اودھ ہوئے جن صدیقی صاحب کو یہ صاحبزادی منسوب ہوئیں جب ان کا پیغام آیا تو قاضی صاحب نے حسب و نسب دریافت کیا۔

آں بزرگ گفت کہ من صحیح النسب صدیقی ہستم رہبر اللہ ما نسب اثر ہی کند، اگر شما خواہید تحریر نمایید قاضی گفت کہ ایں در مارگیراں می باشد ایں را اعتبار نیست،

بہ روم رفتہ نسب نامہ خود بخط کوئی مواہیر سلطان وقاضی ومفتی و دیگر اکابراں روم آورد، آں قاضی مسطور دختر خود را بآں بزرگ کتخدا کرد حالا در فرزنداں بزرگ نسب نامہ مذکور موجود است[1]

ملا عبدالواحد بن قاضی عبدالماجد بن قاضی صدرالدین ہرگامی کے متعلق مولانا فضل امام خیرآبادی آمدنامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ملا عبدالواحد ہرگامی جداعلیٰ محرّر اوراق فاضلے بود متبحر

---

[1] آمدنامہ۔

عالمگیری کے مؤلفین میں سے ہیں۔ ہدایہ و مطول و ملا جلال پر حاشئے لکھے۔ ان کی شخصیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ملا قطب الدین شہید سہالوی (والد استاذ الکل ملا نظام الدین سہالوی لکھنوی فرنگی محلی) ان سے ملاقات کے لئے ہرگام پہنچے تھے۔ ملا محب اللہ بہاری صاحب سلم آپ کے درس میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ آپ کے پاس وقت نہ تھا اس لئے سہالی جاکر ملا قطب الدین شہید کے شاگرد ہو گئے[1]

دوسرے صاحبزادے ملا عبدالماجد کے خلف الصدق ملا عبدالواجد فاضل جلیل تھے۔ کافیہ کی مبسوط شرح اور حاشیۂ اقلیدس لکھا۔ ملا سید عبدالواجد کرمانی خیرآبادی (استاذ مولانا فضل امام خیرآبادی) نے کتاب خانۂ ملا قطب الدین بن قاضی شہاب الدین گوپاموی المتوفی ۱۱۶۲ھ میں یہ حاشیۂ اقلیدس دیکھکر فرمایا۔

"کہ من حواشئے ملا کہ بر تحریر اقلیدس نوشتہ دیدہ ام بغایت خوب نوشتہ"

دختر قاضی صدرالدین سے نسل مفتیان گوپاموہے[2] اسی خاندان کے ایک علمی فرد مفتی انعام اللہ خاں بہادر گوپاموی مفتی محکمۂ قضاۃ دہلی و معاصر علامہ تھے۔ یہ خاتون مفتی عبیداللہ شہابی برادر کلاں ملا وجیہ الدین گوپاموی

---

[1] آمدنامہ مولانا فضل امام خیرآبادی۔ [2] تذکرۃ الانساب۔

بزرگ تھے اس وقت ہندستان قدردانیٔ علماء و مشاہیر میں خاص شہرت رکھتا تھا تمام اہل کمال ادھر کھنچ رہے تھے۔ یہ دونوں بھائی ایران سے وارد ہندستان ہوئے شمس الدین نے مسند افتاء رہتک سنبھالی حضرت شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی' انہیں کی اولاد سے تھے[51] بہاء الدین قبۃ الاسلام بدایوں کے مفتی ہوئے۔ ان کی اولاد میں شیخ ارزانی بدایونی نامور بزرگ اور اعلیٰ درجہ کے مفتی ہوئے ہیں۔ شیخ عماد الدین بن شیخ ارزانی تحصیل علم کی خاطر قاضی ہرگام (ضلع سیتاپور اودھ) کی خدمت بابرکت میں پہنچے۔ قاضی صاحب نے تحقیق شرافت و نجابت کے بعد اپنا داماد بنا لیا قاضی صاحب کے انتقال کے بعد قاضی ہرگام بن گئے[52]۔ وہیں شیخ اسمٰعیل پیدا ہوئے جو اپنے نانا اور والد کے بعد قاضی ہوئے۔ شیخ سعدی[53] کاکوروی کی دختر سے شادی ہوئی جس سے قاضی صدرالدین پیدا ہوئے جن کا شمار مشاہیر وقت میں تھا[54]۔

قاضی صاحب کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہوئیں' ایک صاحبزادے ملا ابوالواعظ اورنگ زیب عالمگیر کے اتالیق رہے اور فتاویٔ

---

[51] حیات شاہ ولی اللہ [52] قاضی ہرگام دختر خود با قاضی عماد الدین معروف عماد کتھرا کرد و بعد قاضی ہرگام قاضی عماد بہ مسند قضائے ہرگام مامور شد بعد ہاں جا وفات یافت و مدفون گردید تذکرۃ الانساب مولوی مصطفےٰ علی خاں گوپاموی۔
[53] شمس التواریخ [54] سیر العلماء

خیرآبادی علمائے عصر میں ممتاز اور علوم عقلیہ کے اعلیٰ درجہ پر سرفراز تھے۔
دارالسلطنت دہلی میں صدر الصدور کے عہدۂ جلیلہ پر فائز اور دینی و
دنیوی نعمتوں سے مالامال تھے۔ مولانا کے والد مولانا محمد ارشد ہرگام
سے خیرآباد آکر سکونت پذیر ہوئے۔
شجرۂ نسب یہ ہے:۔

فضل[۱] حق بن مولانا فضل[۲] امام بن شیخ محمد[۳] ارشد بن حافظ محمد[۴] صالح
بن ملا عبد[۵] الواجد بن عبد[۶] الماجد بن قاضی صدر[۷] الدین بن قاضی اسمٰعیل[۸] ہرگامی
بن قاضی عماد[۹] بدایونی بن شیخ ارزانی[۱۰] البدایونی بن شیخ منور[۱۱] بن شیخ خطیر[۱۲] الملک
بن شیخ سالار[۱۳] شاہ بن شیخ وجیہ[۱۴] الملک بن شیخ بہاء[۱۵] الدین بن شیر[۱۶] الملک شاہ
ایرانی بن شاہ عطاء[۱۷] الملک بن ملک بادشاہ[۱۸] بن حاکم[۱۹] بن عادل[۲۰] بن تاترول[۲۱]
بن جرجیس[۲۲] بن احمد نامدار[۲۳] بن محمد شہریار[۲۴] بن محمد عثمان[۲۵] بن داماں[۲۶] بن ہمایوں[۲۷]
بن قریش[۲۸] بن سلیمان[۲۹] بن عفان[۳۰] بن عبد[۳۱] اللہ بن محمد[۳۲] بن عبد[۳۳] اللہ بن
امیرالمومنین خلیفۃ المسلمین حضرت عمر[۳۴] الفاروق رضی اللہ عنہ۔

اس طرح ۳۴ واسطوں سے خلیفۂ ثانی تک نسب گرامی پہنچتا ہے
علامہ کے مورث اعلیٰ شیر الملک بن شاہ عطاء الملک ایرانی کے مورثان
ایک قطعۂ ملک ایران پر قابض و حکمراں تھے۔ زوالِ ریاست پر دولت
علم کمائی، شیر الملک کے دو صاحبزادے بہاء الدین اور شمس الدین ذی علم

مآثرالکرام میں ہے۔

"پادشاہ ار وقت میر بسیار مناسب شد و ہر زماں گدا مدکہ میر وکیل وطبیب ومنجم مالود، ادارۂ سوگواری کرتواند شناخت، اگر دست فرنگ افتادے، وہمگی جرائد دربرابر خواستے، دریں سودا فراواں سود کردمے، واں گرامی لس ارزاں خریدمے،

بیضی گویدا۔ تہمتا وہماں رادروداتش سینہ بہم شد
سکندرا شک حسرت ریخت کا فلاطون عالم شد"

یہی وہ قدردانی اور عزت افزائی تھی جس کی وجہ سے سارے عالم سے متاہیر وقت کھنچے چلے آرہے تھے علوم کی بارش ہورہی تھی۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کے مورثان اعلیٰ شمس الدین اور بہاءالدین دونوں بھائیوں نے بھی ہندوستان کو رونق عسکر عہدے سنبھالے۔

ولادت ونسب

علامہ فضل حق خیرآبادی ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں اپنے آبائی وطن خیرالبلاد خیرآباد میں پیدا ہوئے[۵]، آپ کے والد ماجد مولانا فضل امام

---

[۵] رسالہ ہدیہ سعیدیہ۔

دہلوی کو قاضی عضد الدین صاحب مواقف کی خدمت میں شیراز بھیجکر درخواست کی کہ ہر قیمت پر ہندستان تشریف لائیے اور متن مواقف کو میرے نام پر معنون کر دیجئے۔ سلطان ابو اسحاق والی شیراز کو پتہ چلا تو دوڑا ہوا علامۂ قاضی کی خدمت میں پہنچکر عرض پرداز ہوا کہ ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں، تخت سلطنت کی خواہش ہو تو دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔ خدا کے لئے شیراز کو یتیم نہ بنایئے۔ قاضی صاحب نے سلطان کی تواضع و قدردانی سے متاثر ہوکر ارادہ بدل دیا اور سلطان ہی کے نام پر کتاب معنون کر کے ہمیشہ کے لئے زندۂ جاوید بنا دیا۔[1]

دوسرا واقعہ علامہ امیر فتح اللہ شیرازی سے متعلق ہے۔ عادل شاہ بیجاپوری نے ہزاروں خواہشوں کے ساتھ دکن بلا کر اپنا وکیل مطلق بنایا ۹۹۱ھ میں اکبر بادشاہ نے صدر کل بنا کر ۹۹۳ھ میں امین الملک اور عضد الدولہ کے خطاب سے نوازا۔ ہندستان کے مشاہیر علماء ان کے حلقۂ درس میں شریک رہے۔ محقق دوانی، صدر شیرازی، میر غیاث الدین منصور، اور میرزا جان کی تصانیف ہندستان لاکر داخل نصاب کیں۔ انھیں کے زمانے سے علوم عقلیہ کو شاندار فروغ حاصل ہوا۔ ۹۹۷ھ میں ان کے انتقال پر اکبر بادشاہ کے الفاظ نظر انداز نہیں کئے جاسکتے

---

[1] مآثر الکرام دفتر اول صفحہ ۱۸۵۔

کمال کا یہ ملک مسکن بن گیا تھا۔

حضرت امیر خسرو نے یکے بعد دیگرے سات بادشاہوں کے دربار میں اعزاز حاصل کیا۔ مختلف انقلابات دیکھے لیکن ہندوستان کو چھوڑ نہ سکے۔

شعراء میں۔ نظیری نیشاپوری، ملک قمی، عرفی شیرازی، ظہوری، غزالی مشہدی، عالی شیرازی، کلیم ہمدانی، غنی کشمیری۔

اطباء میں حکیم میا، حکیم علی، حکیم الملک گیلانی، حکیم عین الملک شیرازی حکیم ابوالفتح گیلانی، حکیم ہمام گیلانی، مسیح الملک شیرازی

کتاب میں۔ شیریں قلم، زریں قلم، مغت قلم۔

علماء میں۔ شیخ حسین موصلی، مولانا فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ۔
مولانا میرزا سمرقندی، میر اسلم ہروی المتوفی ۱۰۶۱ھ، میر زاہد ہروی المتوفی ۱۱۰۱ھ، مولانا میر کلاں معلم جہانگیر المتوفی ۹۸۳ھ مولانا صدر جہاں، مولانا عارف جان بدخشی، وغیرہم۔

اس کے علاوہ دوسرے فنون کے ماہرین نے شاہی درباروں کو رونق بخشی تھی۔ ہندوستان درحقیقت جنت نشان بن گیا تھا۔ علوم و معارف کے دریا بہہ رہے تھے، روحانیت کے چشمے ابل رہے تھے۔
مسلمان بادشاہوں کی قدردانی کے صرف دو واقعے شہادت کے لئے کافی ہیں سلطان محمد بن تغلق شاہ نے مولانا معین الدین عمرانی

اُڑائیں۔ اور اعتراضات وشبہات کا بے پناہ ذخیرہ کتابوں میں چھوڑا۔
پانچویں صدی ہجری اور اس کے بعد امام ابوحامد محمد الغزالی المتوفی ۵۰۵ھ، علامہ ابن رشد المتوفی ۵۹۵ھ ۱۱۹۸ء، امام فخر الدین رازی المتوفی ۶۰۶ھ ابن تیمیہ الحرانی المتوفی ۷۲۸ھ ۱۳۲۷ء، نجم الدین نخجوانی، ابن سہلان، اور فضل الدین خونجی وغیرہم نے ان فنون میں نئی نئی باریکیاں پیدا کیں۔ اجتہادات کیئے۔ آخر الذکر کی کتابیں دو سو سال تک داخل نصاب رہیں۔ علامہ ابن خلدون نے

"وعلی کتبہ معتمد المشارقۃ لهذا العهد"

اس کی کتابوں کو اس عہد کے علماء مشرق کا اعتماد حاصل ہے۔

لکھکر سند اہمیت عطا کردی ہے۔
شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی نے مشائیہ (متبعین ارسطالیس) کے معتقدات پر ضرب کاری لگا کر نئے باب کا اضافہ کیا۔
نصیر الدین محقق طوسی، قطب الدین رازی، صدر الدین شیرازی، ملا جلال محقق دوانی ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ و فرائد وغیرہم نے اس فن کو چار چاند لگائے۔ یوں تو شاہان اسلام کی قدر افزائیوں نے اطراف واکناف عالم کے مشاہیر و فضلاء کو ہندستان کی طرف متوجہ کردیا تھا۔ لیکن سلاطین مغلیہ کے عہد میں عرب وعجم کے اہل فضل و

فالناقص منھا ناقص الی الان | اور جو ناقص تھیں وہ اب تک ناقص ہیں۔
مامون الرشید نے حنین بن اسحاق الکندی اور ثابت بن قرہ وغیرہما کو عربی ترجمہ کا حکم دیا اس طرح شروع تیسری صدی ہجری میں مسلمانوں نے "کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن اینما وجدھا فھو احق بھا" پر عمل پیرا ہو کر اپنی وراثت سمجھتے ہوئے آب و تاب کے ساتھ ان علوم کو چمکایا چوتھی صدی ہجری میں شاہ منصور بن نوح سامانی کی درخواست پر حکیم ابو نصر فارابی نے ان کی ترمیم و تہذیب کر کے معلم ثانی کا لقب پایا اور فلسفۂ ارسطو میں مہارت پیدا کر کے تقریبًا دو درجن تصانیف کیں جو سلطان مسعود کے زمانے تک اصفہان کے کتب خانہ صوان الحکمۃ کی زینت ہی رہیں سلطان مسعود نے شیخ الرئیس ابو علی بن سینا المتوفی ۴۲۷ھ / ۱۰۳۷ء کو اپنا وزیر بنا کر تصانیف فارابی سے اقتباس کرا کے کتابیں لکھوائیں اتفاق سے کتب خانہ نذر آتش ہو گیا تو ابن سینا محافظ علوم بن گیا اب جو کچھ ہے اسی کی محنت کا ثمر ہے۔
ابو محمد بن احمد اندلسی وزیر عبدالرحمٰن مستظہر باللہ، محمد زکریا رازی صاحب صد تصانیف المتوفی ۳۲۰ھ / ۹۳۲ء (عہد منصور بن اسمٰعیل سامانی) نے بھی چوتھی صدی ہجری میں اس پودے کو پروان چڑھانے میں کسر نہ اٹھا رکھی آخر الذکر نے فلسفۂ ارسطو کی دھجیاں نصائے آسمانی میں

بمیدس علم الدوائر میں، بطلیموس اور دیوجانس کلبی علم المناظر و النجوم
ں اپنی نظیر آپ تھے[1] ہر ایک اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھا۔ آج بھی ان
ب کے نام زبان زدِ خواص اہلِ علم ہیں۔
مسلمان بادشاہوں میں سب سے پہلے عباسیہ خاندان کے خلیفۂ ثانی
 جعفر المنصور عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن العباسؓ نے علم نفقہ
 ساتھ علم فلسفہ و منطق و ہیئت کو بھی حاصل کیا۔ اس کے کاتب عبداللہ
ن المقفع الخطیب الفارسی مترجم کلیلہ و دمنہ نے ارسطو کی تین کتابوں
طیغوریاس، باری ارمیناس، اور انو لوطیقا کا عربی میں ترجمہ کر کے منطقی
 لقب سے شہرت حاصل کی[2]
ارسطو سے لے کر خلافت عباسیہ تک گیارہ صدیاں گزر چکی تھیں،
وم فلسفہ کی کوئی ترقی نہ ہو سکی گویا بازار سرد پڑ چکا تھا۔ ساتواں خلیفہ
اسی مامون الرشید جب ۱۹۸ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا تو اپنے ذوق
ں بنا پر ان فنون کی طرف متوجہ ہوا۔ قیصر روم کو لکھا وہاں سے ارسطو
ں کتابوں کا ڈھیر آگیا۔ وزیر جمال الدین قفطی اخبار الحکماء میں لکھتے ہیں۔

یما سیرت الکتاب الی المامون	ترجمہ:۔ ارسطو کی کتابیں (روم کے کتابخانہ سے)
ء بعضها تاما و بعضها ناقصا	جو مامون کے پاس پہنچیں۔ ان میں بعض مکمل اور بعض

[1] طبقات الامم اندلسی صفحہ ۱۹-۳۲ [2] ایضاً صفحہ ۴۸ و ۴۹

(۳) سقراط۔ فیثا غورس کا شاگرد ہے۔ بتوں کی پرستش سے مخلوق کو روکنے اور دلائل کے ساتھ خالق واحد کی طرف توجہ دلانے پر بادشاہ وقت نے قید کرکے زہر دلا دیا۔

(۴) افلاطون۔ یہ بھی فیثا غورس کا شاگرد اور خاندانِ اہل علم سے ہے سقراط کی موجودگی میں گمنام رہا اس کے بعد چمکا اور خوب چمکا

(۵) ارسطاطالیس نیقوماخوس کا بیٹا ہے اور صاحب المنطق کے لقب سے مشہور ہے خاتم حکمائے یونان کہا جاتا ہے بعد کے سارے فلاسفہ اسی کے رہینِ منّت اور خوشہ چیں ہیں۔

ان پانچ کے بعد دوسرے درجہ پر تالیس الملطی صاحب فیثا غورس، دیمقراطیس، اور انکساغوراس ہیں۔

ارسطو کی کتابوں کے شارح ہونے کی حیثیت سے یہ فلسفی مشہور ہیں۔ یہ سب مقلد تھے مجتہد نہ تھے۔

تاؤفرسطس، اصطفن، لیثی یحیٰی لطریق اسکندریہ، امونیوس، سنبلیقیوس، ثاؤن، فرفوریوس، تامسطیوس، افرودیسی (اسکندر) ان میں آخرالذکر تینوں شراح اونچے درجہ کے مالک ہیں۔

یونان میں مخصوص فنوں کے کامل بھی بڑے بڑے نامور گذرے ہیں۔ بقراط و جالینوس علم طبیعیات و طب میں، اقلیدس علم ہندسہ میں،

معین الدین چشتی سنجری اجمیری المتوفی ۶۳۳ھ، شیخ ابوزکریا ابومحمد بہاؤالدین بغدادی ملتانی المتوفی ۶۶۱ھ وغیرہم اپنے علوم و معارف سے اہلِ ہند کو مستفیض فرماتے رہے۔

مذہبی علومِ اسلام کی طرح صیقل شدہ فنونِ یونانی بھی مسلمانوں ہی کے ذریعہ پہنچے۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ منطق و فلسفہ کو اس بلند مقام تک مسلمان علماء ہی نے پہنچایا۔

یوں تو منطق ایک فطری علم ہے۔کسی مقصد پر دلیل و برہان پیش کرنا، قیاس کر کے نتیجہ نکالنا، افکارِ ذہنیہ کو خطا سے بچانا، اسی کا نام منطق ہے اور معمولی سمجھ کا آدمی بھی اسی کی کوشش کرتا ہے۔

اس علم کا باضابطہ اظہار سب سے پہلے حضرت ادریس علیہ السّلام سے ہوا۔ مخالفین کو عاجز و ساکت کرنے کے لئے بطور معجزہ اس کا استعمال کیا گیا۔[1] پھر ان علوم کو یونانیوں نے اپنایا۔ یونان میں بڑے رتبے کے یہ پانچ مشہور فلسفی گذرے ہیں۔

(۱) ہندقلیس۔ ۰۰۰ سنہ قبل مسیح زمانۂ داؤد علیہ السّلام میں گذرا ہے۔ حضرت لقمان سے علمِ حکمت حاصل کرنے کے بعد یونان واپس آگیا۔

(۲) فیثاغورس۔ اصحابِ سلیمان علیہ السّلام کا شاگرد ہے۔

---

[1] اخبار الحکماء قفطی صفحہ ۲۔

حامداً ومصلیاً ومسلماً

ہندوستان جنت نشان جہاں اپنی زرخیزی، صحت وحرفت اور
عام پیداوار کی وجہ سے ہمیشہ سے ایک خاص شہرت کا مالک رہا ہے۔
وہیں اہل فضل وکمال کا گہوارہ بھی شمار ہا ہے فلاسفہ وحکماء ہند کی مدت
میں استفادہ کے لئے دوسرے ملکوں سے محقق آتے رہے ہیں سکندر
ذوالقرنین کے حملۂ ہندوستان اور رائے فور بادشاہ ہند پر فتح پانے کے
بعد ہندوستانیوں نے سکندر کے مقرر کردہ حاکم کو قتل کرکے رائے
دابشلیم کو اپنا بادشاہ بنا لیا تھا اس بادشاہ نے اس احسان کا بدلہ رعایا
پر ظلم وستم سے دیا۔ کسی کی اتنی مجال نہ تھی کہ بادشاہ کو نصیحت کر سکے
یا کوئی صحیح مشورہ دے سکے۔ پنڈت حکیم بیدپا فلسفی نے اپنے شاگردوں
کو جمع کرکے اس اہم مسئلہ پر رائے طلب کی بالآخر تحریر کے ماتحت ایک
کتاب لکھی گئی جس میں جانوروں کی زبان سے عدل وانصاف کے قصے
تحریر کئے گئے اور اس حیلہ سے ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی، اس
کتاب کی نقل کے لئے نوشیرواں عادل شاہ فارس نے اپنے مشیر خاص
حکیم برزویہ کو ہندوستان بھیجا اور اس کی نقل کراکے فارسی میں ترجمہ کرایا
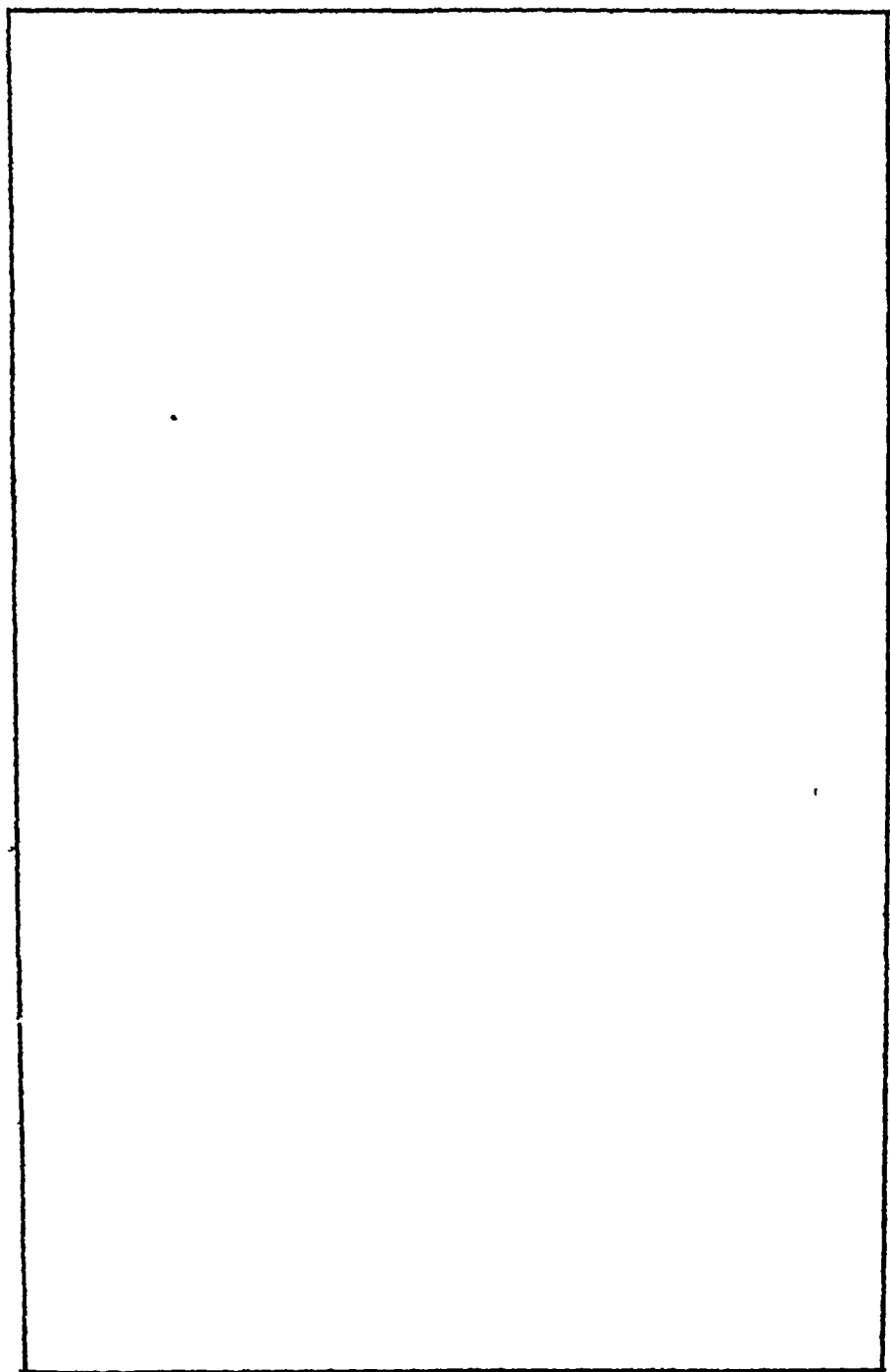
اس لئے ان کی مصنفات اور حالات سے خاص علاقہ رکھتے تھے۔
مولانا کے فرزند مولانا عبدالحق مرحوم نے یہ رسالہ خود اپنے قلم سے نقل کر کے والد مرحوم کو مکہ معظمہ بھیجا تھا چنانچہ وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔
مولوی عبدالشاہد صاحب شروانی نے جب مجھ سے اس رسالہ کی تصحیح و اشاعت کے ارادہ کا ذکر کیا تو مجھے نہایت خوشی ہوئی۔
اب ان کی کوشش سے نہ صرف اصل رسالہ پہلی مرتبہ شائع ہو رہا ہے بلکہ اس کا اُردو ترجمہ بھی مہیا ہو گیا ہے
ترجمہ میں نے مختلف مقامات سے دیکھا سلیس اور شگفتہ عبارت میں کیا گیا ہے اور اصل کی لفظی رعایت کے ساتھ اسلوب بیان کی شگفتگی اور روانی بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔
امید ہے کہ عزیز موصوف کی یہ سعی مشکور ہوگی اور رسالہ عام طور پر مقبول ہوگا۔

ابوالکلام
دہلی۔ ۲۱ اگست ۱۹۴۶ء

از امام الہند مولانا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد مدظلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رسالہ اہلِ علم میں متداول تھا لیکن آج تک اس کی طباعت کا سروسامان نہ ہوسکا۔ "غدر" ۱۸۵۷ء کی بربادیوں کے بعد لوگوں کی ہمتیں اس درجہ پست ہوگئی تھیں کہ اس قسم کی تحریرات کی اشاعت کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ خود مولانا کے خاندان نے اس کی اشاعت، مصلحت کے خلاف سمجھی۔ اور جن لوگوں کے پاس اس کی نقلیں تھیں، وہ بھی اس کی نمائش، احتیاط کے خلاف سمجھتے تھے۔

آج ہم اس رسالہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی بات ایسی نہیں پاتے جسے سیاسی حیثیت سے خطرناک تصور کیا جائے لیکن اس زمانے کا حال دوسرا تھا۔

"غدر" کے حوادث کا تذکرہ اور پھر ایسے شخص کی زبانی جسے بجرمِ بغاوت مدۃ العمر قید کی سزا دی گئی تھی، زیادہ سے زیادہ خطرناک بات یقین کی جاتی تھی۔

والد مرحوم نے معقولات کی تکمیل، مولانا مرحوم کی خدمت میں کی تھی۔

"مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید" پر عمل کیا ہے

اس رسالہ کے دیکھنے سے اس وقت کے ہولناک حالات کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اور نصاریٰ کے خوفناک عزائم کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کی رعایا کے گلے میں دائمی غلامی اور نصرانیت کا پٹہ ڈالنے کی کوششیں ہو رہی تھیں اور علماء مجاہدین کا ایسے موقعہ پر اعلان جہاد کس قدر بروقت اور ضروری تھا علامہ خیر آبادی کا رجب ۱۲۷۵ھ میں باطل قوت کے سامنے یہ اعلان حق ہمیشہ آب زر سے لکھا جاتا رہیگا۔

"وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"

ان حملوں کے بعد عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا حدہ بیتابی سے سن کر راہی جزیرہ انڈمان ہوئے اور وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو سفر آخرت اختیار فرمایا۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً کاملۃً

بعد وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

محمد عبدالشاہد خاں شروانی

جمعہ ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ
۲۳ اگست ۱۹۴۶ء

اورینٹلسٹ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

نے جائداد کی ضبطی کا تفصیلی حال لکھ کر اعانت فرمائی۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی کے تذکرہ علمائے گوپامؤ اور فضلائے ہند سے بھی کافی مدد ملی۔ موصوف کے مفید مشورے بھی شامل حال رہے۔ ہندوستان کے مشہور لیڈر عبدالمجید خواجہ بیرسٹر صدر آل انڈیا مسلم مجلس، سید بشیر الدین لائبریرین لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ، اور نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی رئیس حبیب گنج ضلع علیگڈھ سے بھی وقتاً فوقتاً حالاتِ پارینہ اور واقعاتِ گذشتہ پر گفتگو رہی جس سے کافی مواد مہیا ہوا۔ میں ان حضرات کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں اس پر بھی فخر کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ۲۰ر اگست ۱۹۴۶ء کو جب مولانا آزاد کی خدمت میں بمعیت خواجہ صاحب موصوف حاضری ہوئی تو مولانا نے نصف گھنٹہ اس سوانح حیات کے ملاحظہ کرنے میں صرف فرمایا اور کلمات تحسین سے نوازا۔ میں اپنی اس ناچیز سعی کو مجاہد اعظم بطل جلیل حضرۃ الاستاذ مولانا محمد معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی سے منسوب و معنون کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ باری تعالیٰ مولانا اجمیری اور علامہ خیر آبادی کا ثبات و استقلال ہم سب وابستگانِ دامن کو بھی عطا فرمائے۔ آمین

میں نے رسالہ و قصائد کے متعلق کچھ نہیں لکھا.........

کے قلمی تذکروں سے بھی حالات اخذ کئے محترم المقام مولوی ظہیر احمد فاروقی رئیس حیرآباد سے بھی مدد لی، مولوی صاحب نسبی تحریروں اور خاندانی حالات و واقعات کے حافظ ہیں۔ آپ کے والد ماجد نواب نصیر احمد فاروقی مرحوم نے خاندانی یادداشتیں مرتب کر دی تھیں، یہ نایاب ذخیرہ بھی موصوف ہی کے پاس ہے۔ حضرت خیرآباد بلکہ ہرگام، گوپامؤ، سندیلہ، اور کاکوری وغیرہا جہاں جہاں بھی خیرآباد کا سلسلۂ نسب ملتا ہے سب کے تفصیلی شجرے موجود ہیں۔

عزیر گرامی مسٹر میر جان خلف اوسط حضرت الاستاذ مولانا محمد بشیر خاں رامپوری صدر المدرسین مدرسہ عالیہ خیرآباد نے علامہ کے دولتخانہ کے شکستہ دروازہ کا اندرونی و بیرونی فوٹو کھینچکر روانہ کیا اس میں بھی رفیق محترم کی کوششوں ہی کو دخل ہے مولوی حکیم ظفر الحق میرٹھی مولانا عبد الحق

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱ کا) یہاں پھر بدستور سلسلۂ درس و تدریس جاری کردیا مگر درس معقولات بالکل بند کر دیا آخر عمر تک وعظ و درس تفسیر و حدیث پر اکتفا کی۔ ریاضات شاقہ سے سینہ کو گنجینۂ انوار بنایا بروز پنجشنبہ ۸ ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ کو اسی سال کی عمر میں وفات پائی مادہ تاریخ "ناظم الدین شہ ہے"

بحر عرفاں منبع الہٰ کو	عالم عامل و الا رتبت
حامد شکر است من تاریخش	رو در تم صدر نشین جنت

(کانم الکرام)

مصنفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی

مجاہد جلیل مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی سوانح حیات لکھنے والوں نے علامہ کے ساتھ
بڑا ظلم روا رکھا رنگ آمیزی اور بہتان طرازی سے بھی دریغ نہ کیا۔
خالص علمی مسائل کے مناظرہ و مباحثہ کو ذاتی بغض و عناد پر محمول کیا،
مجھے اس مسئلہ پر اپنے مقام پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنا پڑی۔ علامہ
کے حالات کے سلسلے میں مختلف مقامات کو خطوط لکھنا پڑے ہیں ان تمام
دوستوں اور بزرگوں کا شکر گذار ہوں جنھوں نے میری عرضداشت پر
تکلیف گوارا کر کے حالات بھیجے۔

سب سے زیادہ مدد رفیق محترم مولوی سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی
نے پہنچائی۔ خیرآباد و اجمیر میں ۱۱ سال تک میرے شریک درس رہے ہیں۔
علامہ کے خاندان سے قرابت بھی رکھتے ہیں۔ خیرآباد کے مشہور محدث حاجی
صفت اللہؒ کی اولاد امجاد سے ہیں۔ رفیق موصوف نے خیرآباد و لاہرپور [ل]

ل موصوف مخدوم شیخ اللہ دیا خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں۔ اجلہ مشائخ اور صنادید فضلاء
میں آپ کا شمار ہے۔ فنون عقلی و نقلی میں رتبۂ بلند اور سلوک و فقر میں منزلۂ ارجمند رکھتے تھے۔ مولوی
قطب الدین شمس آبادی تلمیذ ملا قطب الدین شہید سہالوی (والد ملا نظام الدین سہالوی صاحب
درس نظامیہ) کے شاگرد اور مشہور بزرگ حاجی عبداللہ سیاح کے مرید تھے۔ سالہا سلسلۂ تدریس
جاری رہا بہت سے فاضل آپ سے فیضیاب ہوئے ۱۱۲۴ھ میں حج و زیارت کے لیے گئے کافی
عرصہ وہاں قیام کیا مشہور محدثِ وقت شیخ محمد طاہر مدنی سے سندِ حدیث حاصل کی وہیں درس دینا
شروع کیا۔ تمام علماءِ بقاعِ مقدسہ آپ کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے تھے اور تعظیم و اکرام سے پیش
آتے تھے۔ ایک بڑا حلقہ شریک درس ہوتا تین حج کرنے کے بعد وطن مالوف واپس پہنچے۔ (بقیہ صفحہ م پر)

فاضل جلیل کے متعلق ہمیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ اس مصنف کا تعارف کرا سکتے۔ ان خیالات کے پیش نظر ۸ سال کے بعد اس عظیم بار کو اٹھانے کی جرأت کرنا پڑی۔ خوش نصیبی سے مسلسل سات سال ۱۳۴۵ھ تک حصولِ علم کی خاطر خیرآباد میں قیام رہا علامہ کے اہل خاندان سے گھر کا سا واسطہ رہا۔ بزرگوں کی شفقت اور برابر والوں کی عنایت شامل حال رہی وقتاً فوقتاً علامہ کے اور ان کے خلف الرشید مولانا عبدالحق کے حالات و واقعات سے کان آشنا ہوتے رہے۔

شعبان ۱۳۴۵ھ کو حضرۃ الاستاد علامۃ الہند مولانا اجمیری کی خدمت میں طالع کی بلندی اور نصیبہ کی یاوری نے بھیج دیا۔ مولانا اجمیری سلسلۂ خیرآباد کے نہ صرف شاگرد تھے بلکہ عاشق بھی تھے۔ جس ذوق و شوق اور بیخودی و وارفتگی سے ذکرِ فاضل خیرآبادی کرتے تھے سننے والے اور دیکھنے والے ہی اس کی لذت سے واقف ہو سکتے ہیں کافی ذخیرۂ معلومات اس دربار سے ہاتھ لگا تھا۔

بیسیوں تاریخیں اور درجنوں تذکرے بھی دیکھنے پڑے۔ ہر جگہ نہایت اختصار کے ساتھ علامہ کا ذکر ملا۔ اس میں بھی مرزا اسداللہ خاں غالب کا شکرگزار ہونا پڑے گا کہ موصوف نے بعد وفات بھی حق دوستی ادا کیا غالب کے تقریباً تمام تذکروں میں علامہ کا ذکرِ خیر مختلف پہلوؤں سے ملا۔

کے ترجمہ کے متعلق کچھ لکھدیں۔ موصوف نے جواب دیا کہ مولانا آزاد کے
کچھ تحریر کر دینے کے بعد کسی کے لکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ وہی
بہت کافی ہے" سچ ہے۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری!

ہم سب کی خوش نصیبی ہے کہ ہندوستان میں اس دور قحط الرجال
میں ایسی گرامی ہستی موجود ہے۔

گوہرے کز دیدہ کونین بیرون است — ہیچ تواں یافت در خزانۂ ما

شاید نظیری نیشاپوری نے مولانا ہی کے لئے کہا تھا۔

در آشیانِ ما پر و بال ہما رسید — ہر جا رسید سایۂ دولت زما رسید

پہلے میں نے سوچا تھا کہ دیباچہ میں علامہ خیرآبادی کی مختصر سوانح حیات
کا بھی ذکر کر دوں مگر جب لکھنے بیٹھا تو قلم آگے نہ رکھ سکا۔ دوسرے
اس وقت تک اس فاضل اجل اور مجاہد اعظم کی کوئی سوانح حیات
مرتب بھی نہ ہوئی تھی۔ اور یہ خوف بھی اپنی جگہ دامنگیر تھا کہ اگر کچھ دل
اور اسی طرح یہ ذاتِ گرامی پردۂ خفا میں رہی تو اتنے حالات بھی ن
مل سکیں گے جتنے بہم جد و جہد اور کوشش و کاوش سے اب دستیا
ہوسکتے ہیں۔ مصر میں جب علامہ کی معرکۃ الآرا کتاب ہدیہ سعیدیہ
تو مدیر مطبع نے اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھا کہ افسوس ہے ا

دکھاتے تھے۔ آخر ۱۴ ارجون ۱۹۴۶ء کو یہ امتحاں کا وقت آہی گیا دہلی پہنچکر شاہی دربار میں حاضری ہوئی۔ ڈرتے ڈرتے حرفِ مدعا رساں پر آیا۔ حسب معمول خندہ پیشانی کے ساتھ تبسم انداز میں شرف پذیرائی بخشا گیا وزارتی مشن لندن کی موجودگی کی وجہ سے کثرت کار اور ہجوم افکار کے پیش نظر اسی اقرار پر اکتفا کرتے ہوئے واپس آگیا اس درمیاں میں منتظر موقع رہا کہ دوبارہ سکوں میسر آئے تو یاددہانی کروں مگر کوئی موقعہ ہاتھ نہ آیا۔ عارضی حکومت کی ترتیب کے سلسلے میں مولانا کا نزول اجلال دہلی ہوا تو ۲۷ اگست ۱۹۴۶ء کو خدمت والا میں حاضر ہوا ایک گھنٹہ کی تفصیلی گفتگو میں یاددہانی کی بھی نوبت آئی۔ ازراہِ شفقت بزرگانہ دوبارہ آمادگی ظاہر فرمائی اور دوسرے دن صبح کو مختصر پیش لفظ عطا کرنے کا وعدہ فرمایا۔

میں حقتا بھی شکرگذار ہوں کم ہے کہ وقت موعود پر حسب وعدہ ڈیڑھ صفحے اپنے قلم سے تحریر کرکے عنایت فرمائے۔ یہ ڈیڑھ صفحے میرے نزدیک دوسو صفحات سے بھی زیادہ وزنی ہیں مولانا کے ڈو کلمۂ خیر بھی اس زمانے کی بڑی سے بڑی سندِ قبول ہے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ "غبارِ خاطر" اور "کارواں خیال" نے مولانا آزاد اور نواب صدر یار جنگ بہادر کو سالوں کے بعد یکجا کر دکھایا ہے، نواب صاحب کو لکھا کہ آپ بھی سالہ

ہو جانے کے بعد خیال ہوا کہ اس نعمت سے دوسروں کو بھی متمتع ہونے کا موقع دیا جائے۔ مکرمی مولوی مجید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ بجنور سے حسب مشورہ مولانا آزاد رجوع کیا گیا۔ موصوف نے میری آواز پر صدائے لبیک بلند فرمائی اور موصوف کے خلف الصدق عزیز محترم سعید اختر بجنوری نے پیہم تقاضے بھی شروع کر دیئے۔

روداد جہاد حریت کی اشاعت کے لئے آزاد پریس اور مجاہد مالک مطبع ہی کی ضرورت تھی وہ خدا نے پوری کی۔

اب ایک مرحلہ باقی تھا اور وہ یہ کہ علامہ جیسے صاحب نفس و کمال اور بطل جلیل کے رسالہ الثورۃ الہندیہ پر مقدمہ یا پیش لفظ لکھنے والا بھی انہیں جیسا یگانۂ روزگار محقق، اور جادو نگار ادیب شہسوار رخش حریت، اور مجاہد اعظم ہونا چاہیے۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں پیشوائے اعظم امام الہند مولانا آزاد کے سوا ان اوصاف سے متصف کوئی دوسرا نظر نہ آیا۔ ایک طرف مولانا کی ہنگامہ خیز سیاسی مصروفیت کے ساتھ خرابیٔ صحت، دوسری جانب اس معاملہ کی اہمیت و ضرورت، ادھر اپنی علمی تہی مائگی و بے بضاعتی، ادھر علم و فضل کی فراوانی و ہمہ گیری، عقل و دل میں کشمکش پیدا ہوئی، شوق دل قدم آگے بڑھاتا تھا۔ اور عقل دامن پکڑتی تھی جذبۂ خاطر قلندرانہ جرأت دلاتا تھا، اور ہوش و خرد راہ کے نشیب و فراز

دیکھئے۔ کوئی تفسیر عربی قلمی غیر مطبوعہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہو تو سورۂ نساء کے اس مقام کی تفسیر دیکھئے جس میں حضرت مسیح کی نسبت "وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم" آیا ہے۔
یہی حصہ سرسید نے نقل کیا تھا میں جاننا چاہتا ہوں اس کے مصنف کا نام معلوم ہو جو عبارت سرسید مرحوم نے نقل کی تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف وفات مسیح کا قائل ہے میں نے تہذیب الاخلاق کا مجموعہ کلکتہ میں ڈھونڈھا تھا۔ مگر کتابوں میں ملا نہیں کیونکہ ادھر کتابیں غیر مرتب ہو گئی ہیں۔ والسلام علیکم

ابو الکلام

میں نے اس رسالہ کے ترجمہ کے سلسلے میں کتابخانہ حبیب گنج اور لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی کے نسخوں سے بھی مدد لی ہے۔ ایک نسخہ مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری شاگرد رشید علامہ خیرآبادی کے دست مبارک کا لکھا ہوا بھی دستیاب ہو گیا تھا یہ نسخہ مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم سابق صدر دینیات مسلم یونیورسٹی (شاگرد مولانا جونپوری) کی دوسری مخصوص کتابوں کے ساتھ حبیب گنج بھیج گیا تھا۔ کتابت کے لحاظ سے دوسرے نسخوں سے قدیم و صحیح ثابت ہوا۔
ترجمہ کرنے اور امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد کی سند قبول حاصل

عزم مصمم کر لیا

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا کتنا دشوار امر ہے خصوصاً جبکہ ترجمہ بامحاورہ بھی ہو اور الفاظ کے معانی نظر انداز نہ ہوں، اس پر طرہ یہ کہ صاحب فضل و کمال اور مسلّم ادیب کی وہ تحریر بھی ہو۔

علامہ کی درجنوں معرکۃ الآرا تصانیف میں ہر تصنیف میں علمی و ادبی کمال پورے طور پر جلوہ گر ہے اس رسالہ کی اہمیت یوں بڑھ گئی ہے کہ جو ماک مصائب اور الم انگیز حالات میں لکھا گیا ہے تنا بانہ خلعت کے بجائے دیقر اسہ لباس میں ملبوس، مصار آبادی کی جگہ حریرہ انڈمان میں محبوس، اعزا و احباب سے دور، اور اس پر مجبور و مقہور، پھر بھی ادبیت کی چاشنی پوری طرح حلاوت ریز، اور فصاحت و بلاغت کی تو مشک بیز ہے۔

۲۷ ستمبر ۱۹۴۵ء کو دہلی جانا ہوا۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضری ہوئی میں نے رسالہ کے ترجمہ کا ذکر کیا تو صرف کلماتِ ہمت افزائی فرمائے بلکہ وقت کی اہم ترین ضرورت بھی بتائی۔ یہ بھی فرمایا کہ ۱۹۲۱ء میں مولانا معین الدین اجمیری مرحوم نے یہ رسالہ مجھے دکھایا تھا میں نے عرض کیا کہ وہی رسالہ مولانا مرحوم نے مجھے عنایت فرما دیا تھا اور میرے پاس محفوظ ہے بالآخر یہ طے رہا کہ ترجمہ کی تکمیل کے بعد مولانا کی خدمت میں بھیجا جائے چنانچہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو بذریعہ رجسٹری پارسل مولانا کے پتہ پر

بنا پر غریب خانہ (ہادی منزل بھموری ضلع علیگڈھ) پر قیام پذیر ہوئے۔
میرے مختصر سے کتاب خانہ کا ایک شبانہ روز جائزہ لیتے رہے۔ رسالہ
غادریہ بھی ہاتھ میں آگیا۔ دیکھا اور دیکھتے چلے گئے عبارت کی فصاحت
و بلاغت، مضمون کی روانی و سلاست پر وجد کرنے لگتے تھے۔ جب
زیادہ لطف آتا تھا یا متاثر کرنے والا کوئی حصہ آجاتا تھا تو جھوم جھوم کر
بلند آواز سے مجھے سنانے لگتے تھے۔ شب کی مجلس میں جہاں سیاستِ حاضرہ
اور ملکی معاملات پر گفتگو رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس رسالہ کے ترجمہ کی
بھی پُر زور طریقہ پر خواہش ظاہر کی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے بھولا ہوا سبق
یاد دلا دیا۔ آتشِ شوق کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی۔ میں نے اولین فرصت
میں ترجمہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب نے بمبئی سے پھر
یاد دہانی کی۔ اسی زمانے میں موصوف نے اپنے دوست سید محمد ٹونکی لیکچرر
مسلم یونیورسٹی اسکول علیگڈھ کو بھی اس کے متعلق لکھا۔ ٹونکی صاحب
نے بروقتِ ملاقات مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

اسی درمیان میں سید الطاف علی سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل
کانفرنس سے ملاقات ہوئی۔ اور یہ بھی حسنِ اتفاق تھا کہ سید صاحب نے
سب سے پہلی علمی خدمت اسی رسالہ کے ترجمہ کی میرے سپرد کی۔ اب تو
اسے تائیدِ غیبی ہی سمجھنا پڑا اور خدا کا نام لیکر اس بارِ گراں کو اٹھانے کا

اس کی نقلیں حرز جاں بنا کر اپنے پاس رکھیں۔
اس طرح اس کے نسخے خاص خاص حضرات کے پاس محفوظ ہو گئے حکومت کے خوف سے کسی نے اس کے عام کرنے کی کوشش کی نہ کوئی چھپوانے کی جرأت کر سکا مولانا اجمیری نے کئی بار ارادہ اشاعت کا لیکن کل امر مرہون باوقاتہا کے مطابق پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔
یہ موجودہ نسخہ مولانا نے اپنے قلم سے استاد محترم مولانا حکیم برکات احمد بہاری ٹونکی کے نسخہ سے برمانہ طالب علمی خوشخط نقل کیا تھا۔ حاشیہ پر جا بجا حل لغات بھی کر دیا گیا ہے اس رسالے میں دو عربی قصائد فتنۃ الہند بھی ہیں جو ۱۲۷۶ھ میں رسالہ کے ساتھ ہی انحص واقعات پر مشتمل لکھے گئے ہیں۔ ایک قصیدہ ہمزیہ اور دوسرا دالیہ ہے۔
تکمیل درسیات اور مولانا اجمیری کی وفات کے بعد میں ۱۹۴۰ء میں وطن مالوف چلا آیا، اور دارالعلوم حافظیہ سعیدیہ دادوں ضلع علیگڈھ میں تدریسی خدمات اور خانگی مصروفیات میں پھنس گیا۔
۷، ۸ فروری ۱۹۴۵ء کو سحولی تحصیل اترولی ضلع علیگڈھ میں کسان کانفرس بڑے اعلیٰ پیمانے پر منعقد ہوئی۔
ہندوستان کے مشہور لیڈر (سابق کانگریسی حال کمیونسٹ) ڈاکٹر کنور محمد اشرف صدر اجلاس تھے بکانفرس سے فارغ ہو کر سابقہ تعلقات کی

مجھ پر کچھ غیر معمولی شفقت تھی، سفر و حضر میں بیشتر ساتھ رہتا تھا۔ جمعیۃ العلمائے ہند، مجلس احرار اسلام ہند، اور دوسرے حرّیت پسند اداروں کے اجلاسوں میں بھی معیت کا شرف اکثر حاصل رہتا تھا۔ اس فیضِ صحبت نے مجھ جیسے خاندانی رعیت پسند کو تھوڑے ہی دن میں پورا "باغی" بنا دیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں فلسطین سے متعلق چند تقریروں پر حکومت راجپوتانہ نے مجھے گرفتار کر کے مقدمہ چلا دیا، مولانا علیل تھے۔ کرمِ بے پایاں نے پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ خدا نے ایک سال بعد اس مصیبت سے جس پر ہزار راحتیں قربان ہوں نجات دی، تو مولانا نے خوش ہو کر "رسالہ غدریہ" عنایت فرمایا۔

یہ رسالہ علامہ خیر آبادی نے جزیرۂ انڈمان میں بحالتِ محبوسی لکھا تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے المناک حادثات، حکومت مسلّط کے عزائم، اور اپنی تباہی و بربادی کا اپنے مخصوص انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ جب حضرت مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی (استاذ مولانا مفتی لطف اللہ علیگڈھی) ایک انگریز افسر کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کر کے ۱۲۷۷ھ میں رہائی پا کر عازمِ ہندوستان ہوئے تو یہ رسالہ علامہ نے اپنے خلف الرشید مولانا عبدالحق خیر آبادی کے پاس مختلف کاغذ کے پرزوں اور کپڑوں پر کوئلہ وغیرہ سے لکھ کر بھیج دیا تھا۔ اسی رسالہ میں قصائد فتنۃ الہند بھی تھے۔ مولانا عبدالحق نے بڑی محنت و کاوش سے اسے مرتب کیا اور چند مخلصین و معتقدین نے

باسمہ سبحانہ

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

آٹھ دس برس ہوئے ہیں دارالخیر اجمیر میں مقیم اور حضرۃ الاستاد علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری مرحوم و مغفور سے کسب علوم میں مشغول تھا۔ مولانا، تلامذہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی پورا خیال فرماتے تھے اکثر صحبتوں میں جذبۂ حریت کی تلقین اور جہاد و استقلال کا درس بھی ہوتا تھا۔ حضرۃ العلامہ فضل حق خیرآبادیؒ کا ذکر خیر بڑے والہانہ انداز میں ہوتا تھا۔

علامہ خیرآبادی، مولانا کے پردادا استاد بھی تھے اور جادۂ آزادی کے رہبر طریقت بھی، علامہ کا حسن طرح علمی فضل و کمال مسلم تھا۔ اسی طرح انقلاب ۱۸۵۷ء میں عزم و ثبات ضرب المثل تھا۔ مولانا جہاں درسگاہ میں بیٹھ کر علامہ کے منطقیانہ و فلسفیانہ حقائق و نکات بیان فرماتے تھے، وہیں دوسری صحبتوں میں اپنے اساتذہ و اسلاف سے سنے ہوئے چشم دید واقعات انقلاب اور علامہ کے کارہائے نمایاں کا تذکرہ بھی کرتے رہتے تھے۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴۷	۱۶	احمد میاں	مسعود میاں	۳۹۲	۵	تنبیرھم	تتبیرھم
۲۵۱	حاشیہ	سراس	لراس	۳۹۳	۱۰	لومسلمین	علی میلین من
۲۶۸	سطر آخر	یاقی میاں	باقی میاں	〃	۱۱	حل حصین	کلّ تحصین
۲۹۶	۷	رطب ویاس	رطب و یابس	۴۰۰	۹	قتا	قتاد
۳۱۲	۱۶	سلمہا	سلمہما	۴۰۴	۹	دانوا ھم	دانوا لھم
۳۳۹	۱۳	چابک سواری	چابکدستی	۴۱۱	۱	استشھا	استشہاد
۳۴۵	۱۵	گذارنا	گذارنی	۴۱۵	۸	غیرہ	وغیرہ
۳۵۶	۲	وصّدورھا	وصُدورھا	۴۲۰	۱	شد	اشد
〃	۱۷	لتحیلّھم	لتخیلّھم	۴۲۲	۳	غما	غمام
۳۵۹	۱۶	الآھانۃ	الاھانۃ	۴۲۴	۳	جوّ	جرّ
۳۷۵	۴	مقرۃ	مقبرۃ	۴۳۰	۱۵	بجبیبد	بجبیبہ
〃	۶	عاملۃ	عاملہ	۴۴۰	۱۶	ولاقتناء	ولاقتناء
۳۷۷	۶	وبقتروا	فقتّروا	۴۴۱	۱۰	تیّوں	پتوں
۳۸۰	۳	نتیجہ ہوا	نتیجہ یہ ہوا	۴۴۶	۲	تونگری	تونگریٔ قلب
۳۸۶	۶	بجس	بنجس	۴۴۸	۱	ثُمّ	ثَمّ
〃	۷	ملکن	ھلکن	۴۵۸	۱	لم افترق	لم اقترق
۳۸۹	۱۰	مصئون	مصون	۴۶۹	۱۵	جیلی	حیلی
〃	〃	ونحمد	ونعمت	۴۷۰	۱۲	حیي	حییي
۳۹۱	۵	حلّھم	جلّھم	۴۰۲	۱۳	شریعۃ	شریعتہ

مطالعہ سے پہلے تصحیح فرما لیجئے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
د	۱۴	سیرنڈنٹ	سپرنٹنڈنٹ	۸۴	۱۴	لیستغیئ	یستصیئ
ل	۴	ڈالسا	ڈالی	۸۹	۴	الامتہ	الامامۃ
۸	۴	۷۶۸ھ	۷۲۸ھ	۱۱۱	۱۵	۔رباب	درباب
۲۱	۱	ستاد	استاد	۱۱۴	۵	معلیں کے	معلیں کے ساتھ
۲۲	۱	رکھتے	رکھتے تھے				ہمیشہ ہوتا آیا کہ ان کے
۲۴	۱۱	اررده	آررده	؍؍	۷	کھیلانا	کھیلالی
۵۴	۷	نکالسا	نکالی	۱۳۱	۱۴	عمارۃ	تمارۃ
۶۳	۸	سویید	سوید	۱۴۵	۱	کریا	کردیا
؍؍	حاشیہ سطر ۱	گلیکتس	کلیکتس	۱۴۷	حاشیہ	صفحہ ۲۲۴	صفحہ ۲۶۴
۶۵	۹	سرارا	اسرارا	۱۴۹	۴	کہہ کر	رکھ کر
۶۶	۱	یقتلہ	یقتلہ	۱۵۹	حاشیہ سطر ۱۰	سری	سیری
۷۶	حاشیہ سطر ۱	سنہ ۱۲۸۳ء	سنہ ۱۲۸۲ء	۱۶	۱۲۰	حاسہوب	حاس ستال
۸	۱	بیچے مر	بیچے کے دس سال فقد ہی	۱۸۹	۱۶	سکون	سنگوں
۸۲	۹	لعقل	نعقل	۱۹۷	۹	کیا جاتا ہے	کی جاتی ہے
۸۳	۴	رحمتہ	رحمتہ	۲۰۹	۹	اودگرد	اردگرد
۸۴	۹	لقیمتہ	لقیمتہ	۲۳۳	۳	کردیتی	کردیتیں
؍؍	۱۱	شراف	اشراف	۲۴۷	۷	دیتا	دیتا

ضمیمہ (سلسلۂ تلامذہ)

الثورۃ الہندیہ

فہرست مضامین باغی ہندستان

منظر بیرونی دروازہ یا محل علامہ فضل حق خیرآبادی

منظر اندرونی دروازہ یا محل علامہ فضل حق خیرآبادی

ناسہ سجاد

الثورۃ الہندیہ

باغی ہندستان

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے درد انگیز تاریخی واقعات، مجاہدین کی جلاوطنی
حبس دوام، عبور دریائے شور، مردوں عورتوں اور بچوں کا قتل عام
(انگریزی مظالم کی دل ہلا دینے والی خونی داستان)

مؤلف

مجاہد جلیل علامہ فضل حق خیرآبادی
(وفات ۱۲۷۸ھ جزیرہ انڈمان میں)

مترجم

مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی

طابع و ناشر

مولوی محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور

بار اول | ۱۹۴۷ء | قیمت عہ

باسمہ سبحانہ

الثورۃ الہندیہ

باغی ہندستان

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دردانگیز تاریخی واقعات، مجاہدین کی جلاوطنی
حبس دوام، عبور دریائے شور، مردوں عورتوں اور بچوں کا قتل عام
(انگریزی مظالم کی دل ہلا دینے والی خونی داستان)

مؤلف
مجاہد جلیل علامہ فضل حق خیرآبادی
(وفات ۱۲۷۸ھ جزیرہ انڈمان میں)

مترجم
مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی

طابع و ناشر
مولوی محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور

بار اول ۔ ۱۹۴۷ء ۔ قیمت عمہ